اے حمید

دھوپ اور شگوفے

ناول

نیا ادارہ ○ لاہور

لالہ رُخ کے نام

جو دھوپ چھے شگوفہ نہیں،

بہار

او پہاڑوں پر چمکنے والی دھوپ!

او درختوں میں چہکنے والے پرندو!

روشنی مبارک ہو،

روشنی مبارک ہو،

یہ کہانی گرین وو ڈٹی ہاؤس سے شروع ہوتی ہے۔

میں اس ٹی ہاؤس کا مینیجر ہوں۔ میری پہلی نشست صبح نو بجے شروع ہوتی ہے اور دو بجے دوپہر تک رہتی ہے۔ کچھ وقت آرام کرنے کے بعد میں پورے چھ بجے شام کاؤنٹر پر آن کھڑا ہوتا ہوں اور پھر رات کے دس گیارہ بجے تک اسی جگہ رہتا ہوں۔ میں پانچ بچوں کا باپ ہوں۔ میری عمر پینتالیس کے قریب پہنچ چکی ہے۔ میں اپنی بیوی اور بچوں سے محبت کرتا ہوں۔ ہم لوگ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے ہیں اور ہمارا گھرانا بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ ٹی ہاؤس شہر کی بہترین سڑک یعنی مال پر ہے۔ پہلے اس کا نام کچھ اور تھا لیکن پاکستان بننے پر اس کا نام تبدیل کر کے گرین وڈ ٹی ہاؤس

رکھ دیا گیا ہے۔ ہوٹل کے دھندے نے میرے اثر و رسوخ کے حلقے کو کافی وسیع
کر دیا ہے۔ ایکسائز انسپکٹروں سے لے کر چوری چھپے شراب پینے والے اور وکیلوں
اور تھانیداروں سے لے کر بلیک میں چینی بیچنے والے — سبھی میرے واقف ہیں
اور سبھی میرے پاس چائے وغیرہ پینے آتے ہیں۔ دوپہر کے وقت ہمارے ہاں کھانا
کھانے والوں کا جمگھٹا ہوتا ہے اور چائے پینے والی ٹولیاں تو رات گئے تک
آتی رہتی ہیں۔ ہماری چائے کا ذائقہ خوشگوار اور اس کی گرم گرم مہک تھکے ہوئے
خیالات کو فرحت اور تر و تازگی بخشتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تین چار اعلیٰ قسم
کی پتیوں کو ملا کر چائے تیار کرتے ہیں۔

ہمارا ٹی ہاؤس سڑک کے اخیر پر واقع ہے۔ یہاں پہنچ کر مال زیادہ کشادہ اور
زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہے۔ پیدلوں پر لگے ہوئے درخت زیادہ گھنے اور سایہ دار
ہو جاتے ہیں اور ادھر ادھر گھومتی مڑتی چمکیلی کاروں اور سجی ہوئی جدید طرز کی دکانوں
میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کاؤنٹر پہ بیٹھے ہوئے شیشے میں سے باہر کا منظر مجھے صاف دکھائی
دیتا ہے۔ رات کو جب سامنے سڑک پار چھوٹی چھوٹی دکانوں کی بتیاں جگمگا اٹھتی
ہیں تو فٹ پاتھ کے درختوں کے درمیان سے ان کا نظارہ بڑا دلکش ہوتا ہے۔ دومنزلہ
بسیں بڑے شاہانہ وقار سے گزرتی رہتی ہیں اور ان کی کھڑکیوں میں سے نکلتی ہوئی
روشنی بڑی بھلی لگتی ہے۔ شام کے وقت ٹی ہاؤس میں کافی رونق ہوتی ہے۔ لوگ،
ہر طرح کے لوگ، مسکین صورت کلرک، فکر مند چہروں والے چھوٹے موٹے کاروباری

تن آساں اور موٹے تاجر، گردنیں اکڑا اکر بیٹھنے والے تھانیدار، ہر بات پر جی ہاں کہنے والے سپاہی، اپنے مہمانوں کے ساتھ داخل ہونے والے پریشان میزبان اور بل پر نہایت خوبصورتی سے دستخط کرنے والے بیکار شاعر یہاں آکر بیٹھتے ہیں، چائے پیتے ہیں، سگریٹ اڑاتے ہیں اور بڑی گرمجوشی سے ملک کے سیاسی حالات، اجناس کی مہنگائی، چینی کی بلیک مارکیٹ، کپڑے کی قلت، اپنے افسروں کے فرعونی مزاج اور اردو غزل میں محاورات کی بندش اور حسینا کے بھرے بھرے سینے پر باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کھاتے کم اور شور زیادہ مچاتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو یہاں جتنی دیر بیٹھتے ہیں کھاتے رہتے ہیں اور چپکے سے بل ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ وہ لوگ بھی ہیں جو بیرے کو بلا کر کھانے کی ساری فہرست زبانی سنیں گے اور آخر میں صرف ہاف سٹ چائے کا آرڈر دے کر مزے سے اخبار پڑھنے لگیں گے۔ اور ایسے اصحاب بھی ہیں جو ٹی ہاؤس میں داخل ہونے کے بعد سب میزوں پر گھوم پھر کر تازہ اور باسی اخبارات جمع کریں گے۔ بیرے کو پانی کا ایک گلاس لانے کا کہیں گے اور بڑے سکون سے گھنٹوں بیٹھے مطالعہ میں منہمک رہیں گے۔ چھوٹے قد کا مضبوط جسم والا ادھیڑ عمر ٹھیکیدار عموماً شام کو آتا ہے۔ جیپ باہر کھڑی کر کے وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ جھولتا ہوا ٹی ہاؤس میں داخل ہو کر اپنی مخصوص میز پر جا بیٹھتا ہے۔ پستول ہر وقت اس کے گلے میں لٹکا رہتا ہے۔ اس کا رنگ گورا اور جبڑے چوڑے ہیں۔ اس کے ساتھی کا سر چھوٹا اور رنگ گھوڑے ایسا ہے۔ دونو بلا ناغہ شام کو مرغ

کھاتے ہیں اور تلخ چائے پیتے ہیں۔ پہلے روز وہ یہاں آئے تو ٹھیکیدار نے میرے قریب آکر کاؤنٹر پر جھک کر کہا۔

"جناب ہمارے پاس صرف آدھ گھنٹہ ہے اور ہمیں کھانا جلدی چاہیئے"

میز پر بیٹھتے ہی اس نے پستول اتار دیا اور بیروں کو زور شور سے آوازیں دینے لگا۔ بیروں نے انتہائی پھرتی سے کھانا اور چائے لگادی۔ اس کے بعد وہ دونوں ساڑھے تین گھنٹے تک وہاں بیٹھے رہے اور انہوں نے اٹھنے کا نام تک نہ لیا۔ اس ٹھیکیدار کو اپنی خوش خوری کا بڑا ارمان ہے۔ چنانچہ وہ ہر روز مرغ میں سے کوئی نہ کوئی نقص نکالتا رہتا ہے اور میز پر سے ہی بلند آواز میں چیخ اٹھتا ہے۔

"جناب ہم لاہور کے ایک سو بیس ہوٹل چھوڑ کر یہاں آتے ہیں"

چنانچہ میں نے اس کا نام ایک سو بیس رکھ چھوڑا ہے۔

ایک اور صاحب ہیں جنہیں انگریزی ہفت روزہ "سٹار" سے والہانہ عقیدت ہے۔ وہ آتے ہی سب سے پہلے "سٹار" کا پرچہ تلاش کرتے ہیں اگر مل جائے تو بیٹھتے ہیں وگرنہ واپس چلے جاتے ہیں۔ ایک صاحب مقامی انشورنس کمپنی کے ایجنٹ ہیں وہ بھی شام کو آتے ہیں۔ آپ اس سے پیشتر پولیس کے محکمے میں تھانیدار تھے لیکن وہاں دل نہ لگا اور انشورنس کمپنی میں آگئے۔ گھر پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے اردو کا ایم اے کر لیا اور آج کل کسی کالج کی پروفیسری کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ اکثر میرے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں اور ان لوگوں کے عیب گنواتے رہتے ہیں جو کالجوں میں پروفیسر ہیں اور

ان کے خیال میں جاہل ہیں۔ انہیں اپنے بچوں کا ذکر کرنے میں بھی بڑا مزا آتا ہے۔ آپ دلچسپی لیں یا نہ لیں لیکن وہ آپ کو یہ ضرور بتائیں گے کہ صبح ان کے بڑے لڑکے نے ریڈیو پر اقبال کی نظم میں سے ایک غلطی نکالی اور چھوٹے لڑکے نے بازی ہرنے کے بعد کیرم بورڈ ہی الٹ دیا اور اس کی ماں نے اسے خوب پیٹا۔ علاوہ ازیں چونکہ وہ پولیس میں رہ چکے ہیں اس لئے انہیں بڑے بڑے افسروں سے واقفیت جتانے کا بھی مرض ہے۔ آپ اگر کوئلوں کی تجارت کا تذکرہ کر رہے ہوں گے تو وہ جھٹ بول پڑیں گے۔

"جن دنوں انڈر سیکرٹری مسٹر سنہا کانپور میں تھے میں ایک رات کے لئے ان کی کوٹھی میں اترا تھا۔ سردی زیادہ تھی۔ میرے کمرے میں جو کوئلے دہک رہے تھے ان میں گیس بالکل نہ تھی۔ مسٹر سنہا نے بتایا کہ نورمبرگ سے ان کے ایک دوست نے یہ کوئلے "تحفتاً" بھیجے تھے۔"

دراصل ان کی واقفیت بھی کافی وسیع ہے۔ ٹی ہاؤس چوبیس گھنٹے ان کے واقف کاروں سے بھرا رہتا ہے اور وہ ایک میز سے دوسری، دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی میز پر گھومتے رہتے ہیں۔ وہ موسیقی میں بھی ٹانگ اڑاتے ہیں۔ انہیں ہندو پاکستان کے تمام خیالیوں، دھرپدیوں، طبلہ نوازوں اور بالکونس کا ترانہ گانے والوں کے نام اور پتے ازبر ہیں۔ وہ خود تو نہیں گاتے لیکن جب گانا ہو رہا ہو تو اس کا تجزیہ ضرور کرتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سنتے بہت کم اور بولتے

بہت زیادہ ہیں۔

ان کے ایک نوجوان دوست کسی انگریزی سینما میں بکنگ کلرک ہیں۔ آپ کو بھی پکے گانوں سے والہانہ عقیدت ہے۔ ٹکٹیں فروخت کر کے یہ حضرت نور اسماعیل بکڑی ہاؤس آجاتے ہیں اور دونوں گھنٹوں سر جوڑے یہ سوچتے رہتے ہیں کہ بھیرویں اور بہاگ بہاڑ کی راگنیوں کو کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ ان کا رنگ گہرا سانولا اور ناک لمبا ہے۔ وہ ہسپتال کی نرسوں سے محبت بھی کرتے ہیں اور صبح اٹھ کر ورزش بھی کرتے ہیں۔ کسی روز اگر چائے زیادہ پی لیں تو فوراً بیرے کو دودھ کا گلاس لانے کے لئے کہتے ہیں اور اپنے شانوں اور بازوؤں پہ ہاتھ پھیر کر بول اٹھتے ہیں۔

"یہ مائی چائے نے تو مجھ پناہ گیر کی ممیائی نکال دی ہے۔"

ان کے نزدیک بے تکلفی کا معیار یہ ہے کہ جی بھر کر ایک دوسرے کو گالیاں دی جائیں اور وہ اپنے ہر نئے دوست سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ پہلے وہ ریڈیو انجنیئری سیکھ رہے تھے۔ بعد میں انہوں نے موٹروں کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ وہاں سے ایک پرنٹنگ پریس میں ملازم ہو گئے جہاں ایک روز کسی مشہور رنگ... سے ملاقات ہو گئی اور آپ ڈیڑھ سال تک اس کے طبلوں پر آ ملتے رہے اور جب کچھ پلے نہ پڑا تو سینما کی بکنگ کلرکی قبول کر لی۔ انہیں امریکی مار دھاڑ کی فلمیں بے حد پسند ہیں۔ ان کی یہ بڑی دیرینہ خواہش ہے کہ کاش کبھی ایسا زمانہ بھی آئے جب وہ پستول سے گولیاں چلاتے ٹی ہاؤس میں داخل ہوں اور چائے پی کر تین چار آدمیوں کو ڈھیر کر...

گولیاں چلاتے واپس چلے جائیں۔ لیکن انہیں پاکستان میں یہ امید بر آتی نظر نہیں آتی۔

چنانچہ آجکل وہ کالورڈو جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

ایک مختصر سے جسم کے مسکین صورت آدمی ہیں۔ وہ دوسرے تیسرے ہفتے میرے پاس آتے ہیں۔ کاونٹر پر جھک کر مجھ سے کسی مسٹر بشیر چوہدری کا پوچھتے ہیں اور پھر چھوٹا سا رقعہ ان کے نام لکھ کر چھڑی ٹیکتے واپس چل دیتے ہیں۔ نہ تو میں ان صاحب کو جانتا ہوں اور نہ میں نے مسٹر بشیر چوہدری کو کبھی دیکھا ہے۔ ان کے رقعوں میں عام طور پر یہی لکھا ہوتا ہے کہ فلاں تاریخ تک واجب الادا رقم چکا دی جائے۔ کبھی کبھی وہ ٹیلیفون بھی کرتے ہیں۔ فون میں سے منحنی سی آواز آتی ہے۔

"ذرا مسٹر بشیر چوہدری کو تو بلا دیجئے —"

میں یونہی ادھر ادھر دیکھ کر جواب میں کہہ دیتا ہوں۔

"جی وہ ابھی تک نہیں آئے۔"

اور شکریہ کی آواز کے ساتھ ٹیلیفون بڑی بے دلی سے بند کر دیا جاتا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ایک ریٹائرڈ اینگلو پاکستانی بوڑھا کافی ہاؤس میں آنے لگا ہے۔ وہ گھڑی دیکھ کر پورے، چار گھنٹے یہاں بیٹھتا ہے، ایک پلیٹ پلاؤ، روغن جوش اور انڈوں کا حلوا کھا کر وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد پانی کا پورا جگ پیتا ہے اور گھڑی دیکھ کر چلا جاتا ہے۔ اسے بھی ہمیں بھیج کی بڑی عادت ہے۔ چینی دان میں اگر کوئی چیونٹی بھی

نظر آجائے گی تو وہ چینی دان اٹھا کر میرے پاس لے آتا ہے۔

"بیرا کو بولیں چینی کھپال سے ڈالا کرے ---"

کھانے سے فارغ ہو کر وہ بڑا سنجیدہ چہرہ بنا کر اخباریں پڑھتا رہتا ہے اور قریب بیٹھا کوئی ڈھول کیوں نہ پیٹ رہا ہو اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کالج کے کچھ من چلے لڑکوں نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن بوڑھے نے کسی کو پاس نہیں آنے دیا۔

گرین ووڈ ٹی ہاؤس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں صبح سے لے کر ٹی ہاؤس بند ہونے تک ادیبوں اور شاعروں کی کوئی نہ کوئی ٹولی ضرور بیٹھی رہتی ہے۔ حضرت داغ کے یہ جانشین دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر بیٹھتے ہیں۔ بعض شاعر اپنے مداح ساتھ لاتے ہیں اور بعضوں کے ملنے والے شہر کے کونوں کھدروں سے انہیں ملنے ٹی ہاؤس آتے ہیں۔ یہ لوگ ان سے تازہ غزلیں اور نظمیں سنتے ہیں۔ انہیں چائے، سگریٹ اور اگر ہو سکے تو کھانا وغیرہ بھی کھلاتے ہیں۔ لیکن ایسے شاعر عام طور پر وہ ہیں جن کا کلام گھٹیا قسم کے ہفت روزوں اور فلمی ماہناموں میں چھپتا ہے۔ اچھے شعر کہنے والے شاعر اور ادیب عموماً آپس میں مل کر ہی بیٹھتے ہیں اور چائے وغیرہ کا بل آپس میں چندہ کر کے ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ زیادہ تر بیکار ہیں اور شعر اور کہانیاں اور دوسرے مضامین اخباروں میں لکھ کر روٹی کماتے ہیں اس لئے ہر وقت مالی پریشانیوں کا شکار بنے رہتے ہیں۔ چائے کا آرڈر دے کر ان کی مجلس جم جاتی

اور پھر دنیا بھر کے ادب، شاعری مصوّری اور فنونِ لطیفہ پر گرما گرم بحثیں ہوں گی، اور جب بل آئے گا تو کوئی جیب میں سے دونی، کوئی اکنّی اور کوئی چونّی نکال کر میز پر رکھ دے گا۔ تقریباً سبھی نئے لکھنے والے ہیں۔ انھی سے اردو ادب کی امیدیں وابستہ ہیں۔ ان میں نقاد بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، افسانہ نویس بھی ہیں اور مصوّر بھی ہیں۔ ترقی پسند بھی ہیں اور رجعت پسند بھی۔ وہ بھی ہیں جو خیال کو اسلوب پر ترجیح دیتے ہیں اور اور وہ بھی ہیں جو ادب میں محض اسلوب اور اظہار کے قائل ہیں۔ ویسے ان میں لاکھ اختلافات ہوں مگر جب چائے کا بل آتا ہے تو وہ سبھی متفق ہو جاتے ہیں اور زندگی کے ان روزمرّہ مسائل پر ایک ہی نقطے پر کھڑے ہو کر سوچ بچار کرتے ہیں۔ دبلے پتلے جسم کا لڑکا جو مصوّر ہے اور میو سکول آف آرٹ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے اپنی بغل میں کسی فرانسیسی یا اطالوی مصوّر کی تصاویر کی کتاب ضرور رکھتا ہے۔ وہ آبی رنگوں کی مصوّری کو روغنی رنگوں سے اعلیٰ اور انسانی احساسات کے زیادہ قریب سمجھتا ہے۔ وہ انگلینڈ کے موجودہ دور کے سب سے بڑے واٹر کلرسٹ فلنٹ کا بہت معتقد ہے اور اپنی باتوں میں اس کا ذکر بار بار کیا کرتا ہے۔ اس لڑکے کی آنکھیں چمکیلی، بال چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے اور چہرہ مغربی انداز کا ہے۔ ایک اور شاعر ہیں جن کا شمار اس دور کے اچھے غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شربتی آنکھیں بھیگی بھیگی سی رہتی ہیں اور وہ ہر وقت بیمار رہتے ہیں۔ انہوں نے کسی مولوی صاحب کو پرچہ نکالنے اور اسے ہزاروں کی تعداد میں فروخت کر دینے کا لالچ دے کر ان سے

دو سو روپے پیشگی وصول کر لئے ہیں۔ اب وہ مولوی صاحب بلاناغہ اپنی ڈاڑھی
میں انگلیاں پھیرتے ہوئے آتے ہیں اور ان سے تازہ کلام سن کر واپس چلے جاتے
ہیں۔

جو صاحب افسانہ نویس ہیں وہ بڑے انفرادیت پرست ہیں۔ انہیں اس بات
کا بہت خیال رہتا ہے کہ وہ محفل ہی سب سے الگ، سب سے جدا دکھائی دیں۔ چنانچہ
وہ شام کو اکثر صرف قمیض اور دھوتی پہن کر ہی تشریف لے آتے ہیں اور بڑے ٹھیٹھ
پنجابی لہجے میں اردو بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ سگریٹ وہ بے تحاشا پیتے ہیں اور
ان کی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کے بال ہونٹوں پر سے زرد ہیں۔ جب کبھی کوئی شاعر
افسانہ نویس کسی برقعہ پوش یا آزاد خیال لڑکی کو اپنے ساتھ لاتے ہیں تو وہ کسی سے بات
نہیں کرتے۔ چپکے سے کرسیوں کے درمیان سے گذر کر اوپر گیلری پر چلے جاتے ہیں
اور کیبن میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ طویل نظمیں کہنے والے ایک مختصر
سے شاعر نے کسی لڑکی سے محبت کی پینگ بڑھائی اور جب پینگ بہت اونچی چڑھ گئی
تو آپ نشانی کے طور پر اس لڑکی سے سونے کے بندے لے آئے جسے بیچ کر
انہوں نے ٹی ہاؤس کا قرض چکا دیا۔ اس کے بعد وہ لڑکی کا نام بھی بھول گئے۔ انہوں
نے مجھے کہہ چھوڑا ہے کہ اگر وہ لڑکی فون کرے تو میں کہہ دوں کہ وہ یہاں نہیں ہیں
چنانچہ جب کبھی کوئی لڑکی ان کا پوچھتی ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ وہ یہاں نہیں
ہیں۔ ان کے بل اب پھر زیادہ ہو گئے ہیں اور سنا ہے کہ آج کل وہ کسی نئی لڑکی

بس اتنا ہی ہے مجھے ادب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ سے عشق فرما رہے ہیں۔

جتنا کہ ایک عام ناولوں اور کہانیوں کا شوق رکھنے والے کو ہوتا ہے۔ میں نے ہزاروں کہانیاں اور سینکڑوں ناول پڑھ ڈالے ہیں، اور میری کاپی میں غالب سے لے کر حفیظ جالندھری تک ـــــ سبھی اچھے شاعروں کے محبت بھرے اشعار درج ہیں۔ پھر بھی جب کبھی میں ٹی ہاؤس میں سارا سارا دن بیکار بیٹھ کر ادب پر بحثیں کرنے والے ادیبوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے نہ معلوم کیوں اردو ادب کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے جالانکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں بالکل نہیں جانتا کہ ادب کا مستقبل روشن کیسے کیا جاتا ہے۔ بہرحال میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ لوگ لاکھ مفلس اور بدحال سہی، کم از کم زندہ دل اور دردمند ضرور ہیں اور ٹی ہاؤس کی گہما گہمیوں اور روشن ہنگاموں کی چمک دمک بہت حد تک انہی کے دم سے قائم ہے۔

میرے پاس ہی کاونٹر پر ٹیلیفون رکھا ہے۔

قریب کے دفتروں سے ہمیں چائے کے آڈر ٹیلیفون پر ہی موصول ہوتے ہیں ہم
تین ملازم صرف اسی کام کے لئے وقف ہیں کہ وہ ان دفتروں میں چائے لے جائیں
اکثر لوگ اس خیال سے بھی گرین وڈ ٹی ہاؤس کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہاں فون لگا ہے
اور وہ یہاں بیٹھ کر چائے بھی پی سکتے ہیں اور فون پر اپنے دوستوں کے پیغامات
بھی وصول کر سکتے ہیں۔ ٹیلیفون کی گھنٹی ہر پانچ منٹ کے بعد بجتی رہتی ہے اور کبھی
کبھی میں اس سے بہت تنگ آجاتا ہوں۔ کئی لوگ فون پر مجھے بہت زچ کرتے ہیں
مثلاً وہ ہیلو کے ساتھ ہی پوچھیں گے۔

”فلاں صاحب ہیں؟“

اب میں انہیں بالکل نہیں جانتا۔ جب میں اپنی لاعلمی کا اظہار کردوں گا تو وہ اس کا حلیہ بیان کرنے لگیں گے۔ مجبوراً مجھے ٹی ہاؤس میں ہر ایک گاہک کو گھور کر دیکھنا پڑے گا۔ جب میں کہوں گا کہ ایسے حلیے کا یہاں کوئی آدمی نہیں ہے تو وہ بہت حیران ہوں گے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے صاحب، وہ تو مجھ سے مل کر یہاں آئے ہیں۔ آپ ذرا پھر دیکھئے۔ انہوں نے ٹویڈ کا نسواری چیک کوٹ پہن رکھا ہے اور شیو بنی ہوئی ہے —— نہیں نہیں میں بھول گیا۔ آج انہوں نے شیو نہیں بنوائی تھی ——"

اور میں تنگ آ کر فون بند کر دیتا ہوں۔

ایک روز جبکہ میں شام سے کچھ دیر پہلے کاؤنٹر پر آکر بیٹھا ہی تھا کسی لڑکی نے فون کیا ہمیں اکثر عورتوں اور لڑکیوں کے فون آتے رہتے ہیں۔ کسی کو پیسٹری کا بھاؤ پوچھنا ہوتا ہے، کسی نے قریبی درزی کو کوئی پیغام دینا ہوتا ہے اور کسی کو یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ دس منٹ کے اندر اندر فرنچ ٹوسٹ تیار ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ میں نے رسیور اٹھایا۔

"گرین ووڈ ٹی ہاؤس!"

"ہیلو —— جی دیکھئے ذرا منصور صاحب کو تو بلا دیجئے —— مہربانی ہوگی۔"

منصور ابھی ابھی آیا تھا اور اپنے دوستوں میں بیٹھا پائپ صاف کر کے
اس میں تمباکو بھر رہا تھا۔ لڑکی کی آواز سے میں کچھ زیادہ اندازہ نہ لگا سکا۔ اس کی آواز نرم
اور صاف تھی اور اس میں ایک قسم کی خوش حالی اور تن پروری کا احساس تھا جیسے
وہ انگوروں سے بھری ہوئی پلیٹ ہضم کرنے کے بعد ریشمی صوفے پر نیم دراز ہو کر
فون کر رہی ہو۔ میں نے بیرے کے ذریعے منصور کو اطلاع پہنچائی اور لڑکی کو کچھ دیر
انتظار کا کہہ کر ریسیور کاؤنٹر پر رکھ دیا

منصور تمباکو سے بھرا ہوا بھدا سیاہ پائپ میز کے کنارے ٹکا کر آہستہ سے اٹھا
اور کاؤنٹر پر آ کر فون پر لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ میں لڑکی کی آواز نہیں سن رہا تھا
مگر منصور کی باتوں سے مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس موضوع پر بات کر رہے
ہیں۔ لڑکی کسی پارٹی کا ذکر کر رہی تھی جہاں منصور بھی گیا ہوا تھا اور جہاں وہ دونوں
ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے۔ منصور کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اکھ
دان کے کناروں پر انگلی پھیرتے ہوئے اپنی بھاری اور سپاٹ آواز میں بار بار یہی
فقرہ دہرا رہا تھا۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔"

اس وقت اس کے سانولے سے چوڑے ماتھے پر بڑی دلکش چمک تھی اور یہ چمک
اس وقت بھی موجود تھی جب لڑکی نے فون پر گفتگو بند کر دی۔ وہ حسبِ عادت لمبے
لمبے قدم اٹھاتا اپنی میز پر جا بیٹھا اور پائپ سلگا کر بڑی گرمجوشی سے کسی بحث میں

کودپڑا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے مخصوص بلند اور بے ہنگم قہقہے کی آواز گونجی اور مجھے اس لڑکی کا خیال آگیا جس نے اسے فون پر ابھی ابھی کہا تھا۔

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے"

منصور بے تحاشا ہنستا ہے۔ اس کے قہقہے لوگوں کو گردنیں موڑ کر پیچھے دیکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کسی وقت مجھے اس کے فتحمند قہقہے زندگی اور خوبصورتی کا پیام دیتے ہیں اور کسی وقت میرے ذہنی سکون کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے منصور کو میں نے پہلی مرتبہ اسی ٹی ہاؤس میں ہی دیکھا تھا۔ عام نوجوانوں ایسا قد اور دربا نہ جسم، عام قسم کے ترشے ہوئے سیاہ بال، سیاہی مائل بھوری آنکھیں، سانولا رنگ، چوڑا ماتھا اور متناسب و موزوں ناک، ہموار قسم کی غیر جذباتی آواز اور باتیں کرنے کا لہجہ انتہائی ٹھیٹھ۔ اردو بول رہا ہے تو پے در پے پنجابی زبان کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ پنجابی بول رہا ہے تو یوں محسوس ہو رہا ہے گویا کسی دیہات میں تین چار سال گذار کر آ رہا ہو۔ میرے نزدیک اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ نہ تو وہ شاعر تھا، نہ ادیب اور نہ ہی نقاد تھا۔ مصوّر بھی وہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ ادیبوں کے جمگھٹے میں ہی بیٹھا رہتا تھا اور جب وہ کسی موضوع پر گفتگو کرنے لگتا تھا تو اس کے دوست ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔ میری عادت ہے کہ میں ریڈیو بہت ہلکا کر کے رکھتا ہوں۔ ویسے بھی مال روڈ کے ہوٹلوں میں ریڈیو بجانے کا رواج بالکل نہیں ہے۔ اگر کسی وقت ریڈیو پر پکا گانا ہو رہا ہو اور اس کی آواز منصور تک پہنچ جائے

تو وہ دوستوں میں سے اٹھ کر کاؤنٹر پر آجائے گا اور کاؤنٹر پر کہنیاں رکھ کر سر جھکائے
گانا سنتا رہے گا۔ میں نے اسے کبھی خاص اہمیت نہیں دی تھی اور میرے نزدیک
اس میں کوئی ایسی خوبی بھی نہیں تھی جو مجھے اس کی طرف متوجہ کر سکتی۔ اس کے ساتھ
اٹھنے بیٹھنے والوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ مگر منصور کے متعلق مجھے صرف اسی قدر
علم تھا کہ وہ کسی بنک میں ملازم ہے۔ وہ عموماً شام کے وقت اپنے دوستوں کے ہم
ٹی ہاؤس آتا تھا اور دو تین گھنٹے گذارنے کے بعد انہی دوستوں کے ساتھ چلا جاتا تھ
گرمیوں میں وہ عام طور پر کھدر کا کرتہ اور پاجامہ پہنے ہوتا اور سردیوں میں فلالین کی پت
اور بھورے رنگ کے پرانے سے کوٹ میں ملبوس رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ پائپ پیتا تھا
تمباکو کا چوڑا ڈبہ ہر وقت اپنی پتلون کی عقبی جیب میں رکھتا تھا۔ چونکہ میں نے اس سے کبھ
کوئی بات نہیں کی تھی اس لئے مجھے بالکل نہیں پتہ تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اور ا
کے خیالات کیسے ہیں۔ ہماری جان پہچان صرف سلام علیک تک ہی محدود تھی اور
بھی اس وقت جب وہ کبھی اتفاق سے اکیلا ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا اور ہماری آنکھیں
ہو جاتیں۔ جب وہ اکیلا ہوتا تو وہ بڑا چپ چاپ اور سنجیدہ ہوتا تھا۔ خاموشی سے ک
کونے والی میز پر جا کر بیٹھ جاتا اور چائے کا پیالہ سامنے رکھ کر پائپ میں تمباکو بھرنے
چائے پیتے ہوئے یا تمباکو کا دھواں اڑاتے ہوئے وہ کبھی ٹی ہاؤس میں داخل
والوں یا اٹھ کر جانے والوں کو نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ بڑے سکون سے ٹانگیں دوس
کرسی پر رکھے اپنے خیالوں میں مگن رہتا تھا۔ یہ خیالات کیا تھے؟ اس کے متعلق

کبھی سوچ بچار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی ایسے لمحوں میں وہ بالکل تنہا ہوتا تھا اور مجھے خواہ مخواہ اس کی اس بے حسی اور سرد یکسوئی سے کوفت سی ہونے لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکا ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں میلوں تک کسی انسان کی شکل دکھائی نہیں دیتی جہاں چاروں طرف سنگین چٹانیں چپ چاپ کھڑی ہیں اور ویران رہ گذاروں پر موت کا سکوت طاری ہے۔ پھر جب اس کے دوست آجاتے تو وہ بڑی تیزی سے بدل جاتا اور بڑی گرمجوشی سے کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو شروع کر دیتا اور اس کے بے ہنگم قہقہے ٹی ہاؤس میں بار بار گونجنے لگتے۔ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ وہ اپنے سارے دوستوں کو دھوکا دے رہا ہے در اصل وہ کسی اور ملک کا باشندہ ہے جو ان کی زبان سیکھ کر اور بھیس بدل کر کسی اہم بات کا راز معلوم کرنے ان کے درمیان آگیا ہے۔ جب وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے تو باتوں ہی باتوں میں ان سے بہت ہی خفیہ باتیں اگلوا لیتا ہے اور تنہائی میں وہ سب کچھ اپنے ملک کے لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ میرا کئی بار جی چاہا کہ میں اس کے دوستوں کو بتا دوں کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ اسے کسی غیر ملک کے حاکم نے نہایت اہم مہم پر بھیجا ہے اور وہ انہیں دھوکا دے رہا ہے اور ایک نہ ایک دن ان سب کا راز فاش کر دے گا۔ مجھے اس بات کا وہم و گمان تک نہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب وہ اپنے تمام دوستوں سے الگ ہو کر میرے پاس آجائے گا اور مجھ پر اپنی تنہائیوں کے دروازے کھول دے گا اور ہم دونوں ان ویران

رہگذاروں پر سے گذریں گے جس کی دونوں جانب جھکی ہوئی سنگلاخ چٹانوں کے چہرے خاموش ہوں گے اور جہاں میل ہا میل تک ہمیں اپنی دنیا، ٹی ہاؤس کی دنیا کا کوئی باشندہ نہیں ملے گا۔ میں آج بھی جب گذرے ہوئے دنوں پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ انسان کا چہرہ اگر اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے تو بہت بڑا نقاب بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمیں اگر بہت کچھ بتا دیتا ہے تو بہت کچھ چھپا بھی جاتا ہے۔ جو منصور بعد میں مجھ سے ملا وہ اس منصور سے کسی طرح بھی نہیں ملتا تھا جسے میں نے شاعروں اور ادیبوں کے درمیان احمقانہ قسم کے قہقہے لگاتے دیکھا تھا اور جسے میں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ میرا خیال ہے مجھے اس وقت تک اس کے متعلق جتنا کچھ کہنا چاہیئے تھا کہہ چکا ہوں۔ اب میں آگے چلتا ہوں۔

تین چار روز گذرنے پر اس لڑکی نے پھر فون کیا۔

یہی شام کا وقت تھا اور اس روز میں بے حد مصروف تھا۔ کسی سرکاری ملازم نے اپنے ریٹائرڈ ہونے والے افسر کو چائے کی الوداعی پارٹی دی تھی اور ٹی ہاؤس میں بڑا ہنگامہ تھا۔ پارٹی تقریباً ختم ہو رہی تھی اور میں بڑی تیزی سے کھانے پینے کی چیزوں کا حساب بنا رہا تھا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے تھوڑے سے وقفے کے بعد ریسیور اٹھایا۔

"گرین ووڈ ٹی ہاؤس۔"

دوسری طرف سے کسی نے بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

"جی ذرا منصور صاحب کو بلا دیجئے ——— بہت بہت شکریہ۔"

میں نے فوراً آواز پہچان لی - یہ وہی لڑکی تھی جو منصور کو کسی پارٹی پر ملی تھی اور جس سے مل کر منصور کو بہت خوشی ہوئی تھی - اس وقت منصور اوپر گیلری میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور بڑی اونچی اونچی آواز میں باتیں کر رہا تھا اس وقت مجھے سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں تھی - علاوہ ازیں تمام بیرے کام میں جتے ہوئے تھے گیلری پر منصور کو اطلاع دینے کون جاتا - میں نے یونہی کہہ دیا -

"وہ ابھی نہیں آئے۔"

لڑکی نے بڑی ناامیدی سے "اچھا" کہا اور خاموش ہو گئی - میں نے ٹیلیفون بند کر دیا - تھوڑی دیر بعد اس نے پھر فون کیا -

"ہیلو ---- جی دیکھئے جب وہ آئیں تو انہیں کہیئے کہ لالہ رُخ نے فون کیا تھا اور کل اسی وقت میرے فون کا انتظار کریں۔"

اس وقت ٹھیک ساڑھے چھ بج رہے تھے - آٹھ بجے کے قریب جب منصور اپنے دوستوں کے ساتھ ٹی ہاؤس سے باہر جانے لگا تو میں نے اُسے بلا کر کہہ دیا کہ کسی لڑکی لالہ رُخ نے اسے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ کل شام کو ساڑھے چھ بجے وہ اس کا ٹیلیفون پر انتظار کرے - منصور نے قدرے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور دروازے سے نکل گیا -

اگلے روز شام کے ٹھیک ساڑھے چھ بجے لالہ رُخ نے فون کیا -

منصور دس منٹ پہلے وہاں آیا تھا اور میرے قریب ہی میز پر بیٹھا کوئی نسواری

بلڈ والی کتاب پڑھ رہا تھا“۔ میں نے ریسیور کاونٹر پہ رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کا فون“

منصور جلدی سے کتاب پر جھک گیا جیسے پڑھتے پڑھتے کوئی سطر اچانک غائب ہو گئی ہو۔ جیب میں سے پنسل نکال کر اس نے صفحے کے حاشیے پر کچھ نشان بنایا۔ کتاب میز پر الٹا کر رکھی اور ریسیور اٹھا کر اس لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ قریباً آدھ گھنٹہ وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں کئی بار میں نے چاہا کہ انہیں گفتگو ختم کرنے کو کہوں لیکن ہر بار جیسے کسی نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے آپ ہی آپ اس چیز کا شدید احساس تھا کہ میں نے کل شام اس لڑکی سے جھوٹ کہا تھا۔ اس سے جھوٹ بولا تھا اور اب انہیں زیادہ سے زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرنی چاہئیں۔ میرا خیال ہے اس روز منصور بہت خوش تھا۔ فون بند کرنے کے بعد اس نے مسکرا کر ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ کچھ روز اور گذر گئے۔ ایک دن منصور میرے پاس آیا اور کاؤنٹر پر جھک کر بولا۔

”معاف کیجئے گا اگر شام کو میرا فون آئے تو کہہ دیجئے میں ذرا گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔ کل واپس آجاؤں گا“

منصور یہ پیغام مجھے صبح نو بجے کے قریب دے گیا تھا۔ اسی شام اس لڑکی نے فون کیا۔

"ہیلو ....."

میں نے اسے بتا دیا کہ منصور صاحب صبح آئے تھے اور یہ کہہ کہ وہ گوجرانوالے جا رہے ہیں، چلے گئے تھے۔ لڑکی نے پہلے کی طرح بڑے مایوسانہ انداز میں 'اچھا' کہا اور فون بند کرنے ہی والی تھی کہ میں نے کہا۔

"آپ کو اگر کوئی پیغام دینا ہو تو دے دیں۔"

"جی نہیں شکریہ ـــ وہ کل تو آ ہی جائیں گے۔ میں پھر فون کر لوں گی۔ اور دیکھئے آپ میرے اس روز کے فون کرنے کا برا تو نہیں مانتے ہ؟"

میں نے بڑی دریا دلی سے کہا۔

"بالکل نہیں جناب۔ آپ جس وقت چاہیں فون کر سکتی ہیں۔ یہ تو ہوٹل ہے۔ یہاں تو چوبیس گھنٹے لوگوں کے فون آتے رہتے ہیں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ صبح اگر منصور صاحب آئیں تو انہیں میرا سلام کہیئے۔ میں شاید کل اسی وقت خود ہی فون کروں گی ـــ اچھا آداب عرض۔"

"آداب عرض۔"

ابھی ریسیور فون پر رکھا ہی تھا کہ منصور دروازے میں داخل ہوا۔ میں نے ذرا

مسکراتے ہوئے کہا۔

"ابھی ابھی آپ کا فون آیا تھا۔ میں نے تو انہیں کہا ہے آپ باہر گئے ہوئے ہیں۔"

منصور نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا اور پائپ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"بہت خوب ۔۔۔۔ میں سٹیشن سے واپس آگیا تھا۔ دراصل میں اپنا تمباکو گھر بھول آیا تھا اور جب تمباکو لینے گھر آیا تو دوبارہ سٹیشن جانے کو جی نہ چاہا ۔۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں ۔۔۔۔ کوئی پیغام تو نہیں دیا؟"

"کل اسی وقت فون کریں گی۔"

اتنا سن کر اس نے پائپ منہ میں رکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے دوستوں میں جا بیٹھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اس لڑکی کا نام لالہ رخ تھا۔ میں نہیں جانتا یہ اس کا اصلی نام تھا یا اس نے ویسے ہی رکھ چھوڑا تھا۔ بہر حال وہ اپنے آپ کو اسی نام سے پکارتی تھی اور ہمیں بھی اس کے علاوہ کوئی دوسرا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ دراصل اس لڑکی سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی جب مجھے اس کا وہ لہجہ یاد آتا جس نے منصور کی عدم موجودگی کا سن کر "ذرا سی اچھا؟" کہی تھی تو میرا جی چاہتا کہ میں جگہ پر منصور کو جھٹلا دوں اور لالہ رخ سے کہوں کہ وہ سارا دن فون پر اس سے

کرتی رہے۔ ویسے اب اس نے منصور کو بلاناغہ فون کرنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ فون ان
کے گھر پہ ہی لگا تھا اور شام کو ایک آدھ گھنٹے کے لیے ان کے گھر میں ذرا سکون ہوتا
تھا لہٰذا وہ دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ کسی روز اگر منصور ذرا دیر سے آتا یا وہ ذرا پہلے
فون کر دیتی تو کچھ منٹ کے لیے میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا۔ اسی طرح
ایک مہینہ گذر گیا۔ اس اثناء میں مجھے صرف اسی قدر معلوم ہو سکا کہ ان کی کوٹھی شہر
سے باہر سول لائنز کے علاقے میں ہے اور اس کا باپ جائداد اور زمینوں کی خرید و فروخت
کا کام کرتا ہے۔ اس سے آگے کچھ پوچھنے کی نہ تو مجھے کبھی جرأت ہوئی اور نہ ہی لالہ رخ
نے کبھی کچھ بتایا۔ منصور کے بارے میں بھی اس نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ بہت ہی
اچھا لڑکا ہے اور ان کی آپس میں دوستی ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں لالہ رخ سے باتیں کر
رہا ہوں اور منصور آ گیا۔ اور میں نے مسکرا کر فون دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے وہ بھی آ گئے اب خود ہی ان سے بات کر لیں۔“

ایک عجیب اتفاق سے میں ان دونوں کا رازدار بن گیا۔

مجھے ان دونوں سے نہ صرف دلچسپی بلکہ ایک طرح کا لگاؤ سا پیدا ہو چلا تھا۔ اب مجھ پر یہ بھید بھی کھل گیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ان ایک ماہ میں دو تین بار آپس میں مل بھی چکے ہیں۔ منصور کے اس کردار میں جو براہِ راست بیرونی تعلقات سے متاثر ہوتا ہے خاص قسم کی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے روز کے ملنے والوں میں بیٹھنا بہت کم کر دیا تھا۔ کاونٹر کے پاس ہی ایک میز ہے جس کے آزو بازو دیوار کے ساتھ دو نسبتاً آرام دہ کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ جب میں کاونٹر کی اونچی کرسی سے اکتا جاتا ہوں تو اٹھ کر اسی میز پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اسے میں اپنی میز تو نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس جگہ گاہک بھی آکر بیٹھ جاتے ہیں، اس کے باوجود یہ

میری ہی سمجھی جاتی ہے اور جب رات زیادہ ہو جاتی ہے اور ہوٹل میں لوگوں کی آمد و رفت کم ہونے لگتی ہے تو میں اسی میز کے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہوں اور اکثر اسی جگہ بیٹھ کر بل وغیرہ کاٹا کرتا ہوں۔ منصور نے بھی اب اسی جگہ بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ رسمی طور پر اپنے دوستوں سے جا کر ملتا۔ تھوڑی بہت گفتگو کرتا اور کاؤنٹر کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ ایک روز میں نے یونہی اس سے پوچھا کہ وہ اپنے روز کے دوستوں سے کھنچا کھنچا سا کیوں رہنے لگا ہے؟ اس پر اس نے ہلکا سا تضحیک آمیز قہقہہ لگایا اور بھدی آواز میں بولا:

"وہ مجھ سے پوچھتے ہیں ٹیلیفون والی لڑکی کون ہے؟ بھلا میں ہر ایرے غیرے کو کیسے بتا دوں کہ وہ کون ہے۔ اور پھر کبھی میں نے بھی ان سے اس قسم کے سوال پوچھے ہیں؟"

"شاید انہیں آپ سے ہمدردی ہو۔"

اس پر وہ اپنی بھوری اور چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"ہمدردی؟ ——— میرے خیال میں یہ حماقت ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی احمق تھے اور آج بھی احمق ہیں۔"

میں ہنس پڑا اور بل لکھنے لگا۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ اس دوران میں یہ قدرتی طور پر ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ اب لالہ رخ شام کو ضرور فون کرتی اور اگر منصور نہ ہوتا تو مجھ سے باتیں کرتی رہتی۔ ہم کئی طرح کی باتیں کرتے۔ سب سے پہلے وہ منصور کا ذکر کرتی۔ وہ مجھے بتاتی کہ

منصور اسے بہت پسند ہے اور وہ اس کا بے حد احترام کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ زندگی کے آخری لمحوں تک اس کی دوست بنی رہے۔ وہ مجھ سے پوچھتی کہ منصور کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور کیا وہ بھی اسے یاد کرتا ہے؟ میں اسے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے بتاتا جو منصور مجھ سے اس کے بارے میں کیا کرتا تھا۔ پھر ہم اردو کے تازہ چھپے ہوئے ناولوں یا نئی نئی فلموں پر باتیں شروع کر دیتے اور جب وہ فون بند کرنے لگتی تو کہتی۔

'وہ آئیں تو انہیں میرا بہت بہت سلام کہیے ـــــ انہوں نے آج قمیص کس رنگ کی پہنی ہوئی ہے؟ آج ان کے بالوں میں تیل لگا تھا؟ ان کے بال ہمیشہ خشک رہتے ہیں۔ اچھا ـــــ خدا حافظ'

اس اثنا میں اگر منصور ٹی ہاؤس میں آن داخل ہوتا تو میں ریسیور اس کی طرف بڑھا دیتا اور وہ مسکراتے ہوئے لالہ رخ سے باتیں شروع کر دیتا۔ رات کو جب ٹی ہاؤس خالی خالی سا ہو جاتا تو ہم دونوں چائے منگوا کر میز کے گرد بیٹھ جاتے اور دیر تک لالہ رخ کی باتیں کرتے رہتے۔ وہ مجھے فون پر کی گئی ایک ایک بات بتا دیتا اور لالہ کی آواز کے علاوہ اس کے آرٹسٹک مزاج اور پارہ صفت کردار کی تعریفیں کیا کرتا۔ وہ کہتا۔ لالہ زندگی سے بھرپور لڑکی ہے۔ وہ ہر کام بڑے اہتمام سے کرتی ہے۔ اس کی آواز میں پتھروں سے ٹکرا کر اچھلتے ہوئے پانی کی موسیقی اور اضطراب ہے۔ وہ کوئی بات کر رہی ہو اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور اس

کے منہ سے الفاظ یوں نکلتے ہیں جیسے چھٹی کے بعد اسکول سے بچے ناچتے کودتے نکلتے
ہیں۔ جب وہ درختوں، پھولوں، چشموں اور چاندنی راتوں کا ذکر کرتی ہے، تو اس کی
آواز میں گلپوش جھیلوں کا سکون اور عمیق گھاٹیوں کی گہرائی آجاتی ہے۔ وہ اپنی نرگسی
آنکھیں یوں سکیڑ لیتی ہے جیسے بہت دور کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھلے ہوئے سپید پھول
کو دیکھ رہی ہو، اور اس کے ترشے ہوئے باریک ہونٹوں کے کنارے کسی نامعلوم مسرت
کے بوجھ سے لرزنے لگتے ہیں۔ لالہ رخ کا ذکر کرتے ہوئے منصور کی اپنی بھی کچھ ایسی
ہی حالت ہو جاتی۔ اس کی بھوری بھوری آنکھوں میں ملائم سی روشنی جھلکنے لگتی اور
آواز میں بڑی تڑپ اور چمک سی پیدا ہو جاتی۔ میں خاموشی سے اس کی گفتگو سنا کرتا۔ میں نے
ابھی تک لالہ رخ کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اپنی کوئی ذاتی رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔
میرا خیال تھا کہ وہ عام وضع قطع کی لڑکی ہے جو بی۔ اے کر نے کے بعد اب گھر بیٹھ
کر صبح و شام وینٹی بیگ لئے ہوتی ہے۔ دوپہر کو کھانے کے بعد سیب کھاتی ہے اور نرم نرم تکیوں
میں گھس کر کیٹس اور شیلے کی رومانوی نظمیں پڑھتی ہے، اور پھر بلی کی طرح آنکھیں بند
کر کے سو جاتی ہے۔ منصور بھی اس سے زیادہ مرتبہ نہیں ملا تھا۔ میرا خیال ہے ان دو
تین مہینوں میں وہ بمشکل چار پانچ مرتبہ ملے ہوں گے۔ ان ملاقاتوں سے زیادہ وہ
فون پر ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے اور یوں لگتا تھا گویا وہ برسوں سے
ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ لالہ اگرچہ نسبتاً امیر گھرانے کی لڑکی تھی تاہم اسے اکیلی
گھر سے باہر نکلنے کی بہت ہی کم اجازت ملتی تھی۔ جس روز اسے منصور سے ملنا ہوتا،

وہ صبح ہی سے اپنی ایک سہیلی کے ہاں چلی جاتی اور پھر وہاں سے منصور کی طرف چل پڑتی
وہ دونوں عام طور پر چڑیا گھر کے دروازے پہ ملتے اور لارنس باغ میں سیر کرنے کے
بعد اوپن ایئر ٹی سٹال کے سبز کیبن میں بیٹھ کر باتیں کرتے، چائے پیتے اور پھر
وہیں سے جدا ہو جاتے۔

ایک رات منصور نے لالہ سے اپنی ملاقاتوں کا حال کچھ اس طرح بیان کیا۔

"اس رات پرانے طلبا کی طرف سے یونیورسٹی ہال میں کوئی تقریب تھی۔ میں
بھی اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔ ہال میں کافی لوگ بیٹھے سگریٹ
پی رہے تھے اور باتوں وغیرہ میں مشغول تھے۔ مارچ ابھی شروع ہی ہوا تھا چنانچہ
فضا میں بڑی پرسکوں حدت رچی ہوئی تھی۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ کوئی
صاحب اقتصادیات پر مضمون پڑھنے کے لیے سٹیج پر آئے اور بڑی جلدی پڑھ کر
واپس چلے گئے۔ تالیوں کے ہلکے شور کے ساتھ کوئی صاحبہ سٹیج پر آئیں اور انھوں
نے شیلے کی نظموں پر تبصرہ شروع کر دیا۔ ایک تو وہ بدحواس تھیں دوسرے ان کی آواز
انتہائی باریک تھی لوگوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ہال کی اگلی تین قطاروں میں
کچھ برقعہ پوش اور کچھ غیر برقعہ پوش خواتین بیٹھی تھیں۔ ان کی جانب سے ہلکی ہلکی تقریبی
سرگوشیاں اور قسم قسم کے تیز عطریات کی مہک آ رہی تھی۔ تیسرے نمبر پر یونیورسٹی
کے نائب مدیر نے انگریزی میں پاکستان کی زرعی ترقیات پر لیکچر دیا اور تالیوں
کے شور میں چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

اب ایک لڑکی نے سٹیج پر آکر اقبال کی نظم 'جگنو' پڑھ کر سنائی۔
نظم سے بڑھ کر مجھے اس لڑکی کی آواز نے متاثر کیا۔ لہجے میں بڑی سادگی اور
موسیقیت تھی۔ اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کا باریک نقاب تھا لیکن تیز روشنی
میں اس کے چہرے کے خدوخال بہت حد تک دکھائی دے رہے تھے۔ سٹیج سیکرٹری
نے اس لڑکی کا نام لالہ رخ بتایا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں اس لڑکی سے باتیں
کروں۔ اس وقت تو میں خاموش رہا مگر جب جلسہ ختم ہوا تو میں اپنے دوستوں سے
الگ ہو کر اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے میرا خیال تھا کہ عورتیں ضرور گذریں گی۔ ایک عجیب
اتفاق سے عورتوں نے عقبی دروازے سے نکلنا شروع کر دیا۔ میں نے اس لڑکی کا سپید
سینڈل دیکھ لیا تھا۔ میں ہال کا پورا چکر کاٹ کر عمارت کے عقب میں اس جگہ آ گیا جہاں
گول حوض میں فوارہ لگا ہے۔ دو تین لڑکیاں اس طرف آ رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے
قریبی گملے میں اُگے ہوئے لالہ کے تین سرخ پھول توڑ لئے اور ان لڑکیوں کا انتظار کرنے
لگا۔ ان میں سپید سینڈل والی وہ لڑکی بھی تھی جس کا مجھے انتظار تھا۔ اس نے چہرے پر سے
نقاب اٹھا رکھا تھا اور اپنی سہیلیوں سے باتیں بھی کر رہی تھی اور چل بھی رہی تھی۔ اس
کے قدم اٹھانے اور رکھنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ تیز چلنا چاہتی ہے لیکن اپنی سست
رفتار سہیلیوں کی وجہ سے مجبور ہے۔ جب وہ مجھ سے چند ایک قدموں کے فاصلے
پر رہ گئیں تو میں نے آگے بڑھ کر سرخ پھول پیش کر دیئے۔
"یہ میری طرف سے اظہارِ عقیدت ہے محترمہ ——— مجھے امید ہے

آپ قبول فرمائیں گی۔

لڑکیاں ایک دم ٹھٹھک سی گئیں وہ سب کھڑی ہو گئیں۔ لالہ نے آدھا چہرہ نقاب میں چھپا لیا۔ پہلے تو وہ جھجکی مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے سرخ پھول میرے ہاتھوں سے لے لئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ میں یونہی بولے جا رہا تھا۔

'آپ نے بڑی کامیابی سے نظم پڑھی ہے۔ میں آج اس نظم کا مفہوم سمجھا ہوں۔ آپ کی آواز میں بڑا سوز ہے۔ آپ نے کون سے سال میں کالج چھوڑا تھا۔ آپ ریڈیو پر کیوں نہیں پڑھتیں؟ وہاں اس قسم کی گھریلو اور پُرکشش آوازوں کی بڑی ضرورت ہے.....'

لالہ کی سہیلیاں ہنس پڑیں۔ لالہ بھی ہنس پڑی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ لالہ بولی

'جی ہاں۔ لیکن شاید میں ریڈیو پر نہ گا سکوں'

'کیوں؟ کیا آپ گھبرا جائیں گی؟'

'جی نہیں یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ میرے بھائی اور ابا اسے پسند نہیں کرتے'

'جی ہاں۔ یہ تو ہے'

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ہمارے سروں پر بہار کے کھلے نیلے آسمان پر گول چاند چمک رہا تھا۔ باغ میں اونچے لمبے درخت چاندنی میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ ہال کی پرلی جانب موٹروں کے ہارن دے کر دروازے سے گزرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ساتھ

زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ ہوا میں ادھ کھلے پھولوں کی دھیمی مہک تھی۔ یونیورسٹی کیفے کے پاس سے گذرتے ہوئے میں نے چائے کی پیشکش کر دی۔ پہلے تو لالہ اور اس کی سہیلیوں نے انکار کر دیا لیکن میرے از حد اصرار پر وہ صرف چند لمحوں کے لئے بیٹھنے پر راضی ہو گئیں۔ ہم لوگ کیفے کی پشت پر نیبو کے دو تین پیڑوں تلے سبز میز کے گرد بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پیڑوں کی ٹہنیاں نیبو کے سفید سفید شگوفوں سے لدی ہوئی تھیں اور باغ میں ان کی ترش خوشبو بس رہی تھی۔ چاندنی میں گھاس پر ڈھلکی ہوئی شبنم چمک رہی تھی۔ سردی زیادہ نہیں تھی۔ خنک ہوا بڑی خوشگوار تھی اور گرم گرم چائے کا ایک پیالہ پی لینے پر وہ بدن کو پیار سے تھپتھپانے لگی۔ لالہ میرے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ وہ زیادہ بات نہیں کر رہی تھی۔ لیکن اس کی خاموشی میں بھی ایک طرح کا اضطرار اور دھڑکن تھی۔ بولتے وقت وہ بڑے اہتمام سے کام لیتی جیسے کسی کو طشتری میں پھل رکھ کر پیش کر رہی ہو۔ میں اس مختصر سی پہلی ملاقات میں صرف اسی قدر جان سکا کہ اس کا رنگ سنہرا گندمی تھا اور آنکھوں میں زندگی کی گرمی اور چمک تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ پچھلے سے پچھلے سال میں نے گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا تھا اور آج کل ایک بنک میں ملازم ہوں۔ چائے پی لینے پر ہم وہاں سے اٹھے اور باغ میں سے ہوتے ہوئے یونیورسٹی کی عمارت سے باہر آ گئے۔ باہر آتے ہی لالہ اپنی سہیلی سے کہنے لگی۔

"نزہت خدا کے لئے کہیں سے تانگہ پکڑو۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔

بھائی جان تو میری جان نکال دیں گے۔"

میں ہنس پڑا۔

'آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی تانگے کا انتظام کرتا ہوں'

'جی ـــــ شکریہ'

جب تانگہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو میں دیر تک لالہ کی آواز سنتا رہا۔

جی ـــــ شکریہ! ـــــ جی ـــــ شکریہ!

اور ہاں چلتے وقت میں نے اسے ٹی ہاؤس کا فون نمبر دے دیا تھا۔ میرا خیال تھا لالہ بڑی اچھی لڑکی ہے اور میں اُسے ضرور اپنا دوست بناؤں گا ـــــ جیسا کہ آپ کو علم ہے لالہ نے تیسرے روز مجھے فون کیا اور ایک ہفتہ بعد ہم لارنس باغ میں چڑیا گھر کے دروازے پر ملے۔ میں نے لالہ کو بڑی مشکل سے وہاں آنے پر راضی کیا تھا۔ اسے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان کا گھر سول لائنز میں ہے اور لارنس میں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ مقررہ وقت کے آدھ گھنٹہ بعد وہ تانگے میں آئی۔ میں بڑی بےچینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تانگے میں اس کا سپید سینڈل دیکھ کر میرا دل خوشی سے لبریز ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ لائبریری جانے کا بہانہ کرکے آئی ہے اور بڑی مشکل سے آئی ہے۔ ہم نے کچھ دیر چڑیا گھر کی سیر کی اور اس کے بعد اوپن ایئر ٹی سٹال کے کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ اس روز لالہ نے جو ریشمی قمیص پہن رکھی تھی اس پر سرخ اور جامنی رنگوں کے بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ دوپٹہ ہلکے فاختائی رنگ کا تھا اور کانوں میں چھوٹی چھوٹی گول سنہری بالیاں تھیں۔ اس دن

میں نے لالہ کو قریب سے دیکھا۔ اگر خوبصورتی سپید رنگ، صراحی دار گردن، تلوار ایسی ناک اور ہرنی ایسی آنکھوں کا نام ہے تو لالہ خوبصورت نہیں تھی۔ اس کے نقوش اور خدوخال عام لڑکیوں ایسے تھے۔ لیکن ان سب کو ملا کر جو مجموعہ تیار ہوتا تھا وہ کسی بھی لڑکی سے نہیں ملتا تھا۔ اس کی عمر انیس بیس برس کے درمیان تھی مگر چہرے پر چودہ پندرہ سال کی لڑکیوں ایسا بھولپن اور حجاب تھا۔ وہ جتنی دیر میرے پاس کیبن میں بیٹھی رہی گھر کے خیال سے پریشان رہی۔ کوئی آنہ جائے۔ کوئی اُسے دیکھ نہ لے۔ اب اس کا بڑا بھائی دفتر سے آگیا ہوگا۔ اب اُسے چل دینا چاہیئے۔ وہ انہی وسوسوں میں گرفتار رہی اور میں اس سے اطمینانِ قلب کے ساتھ کوئی بات نہ کر سکا۔ اگر غور کیا جائے تو میں اسے کہنا بھی کیا چاہتا تھا؟ میرے پاس اسے کہنے کو جو کچھ تھا میں اسے کہہ رہا تھا۔ میں اس کی دوستی، اس کا قرب اور اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا اور یہ سب کچھ مجھے میسر تھا۔ ہاں دل میں یہ ضرور دھڑکا تھا کہ کوئی ہمیں یوں چھپ چھپ کر ملتے دیکھ نہ لے۔

اسی قسم کی تین چار سہمی سہمی ملاقاتوں کے بعد لالہ نے مجھے پہلا خط لکھا اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ لالہ جو ملاقات کے وقت ڈری ڈری سی رہتی ہے اور کھل کر کوئی بات نہیں کر سکتی خط لکھتے وقت آزاد پرندے کی طرح وادیوں کی نیلی فضا میں بازو پھیلائے پرواز کرتی ہے۔ اس کے خطوں نے مجھ پر اس بات کا انکشاف کیا کہ لالہ بڑی آئیڈیلسٹ لڑکی ہے اور وہ ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہی ہے جو کہکشاں کے نورانی ستونوں کے سہارے کھڑی ہے اور جہاں چاندی کے درختوں پر سونے کے پرندے نغمہ خوانی

کرتے ہیں اور رات کو پریاں چاندنی کے ساز پر طلوعِ آفتاب کے گیت گاتی ہیں اور کنول کے پھولوں میں لپیٹ کر سو جاتی ہیں۔ مجھے اس رات جگنو، نظم پڑھنے والی اور میرے پاس بیٹھی بار بار گھر کے خیال سے پریشان ہو جانے والی لالہ پر انگور کی جھکی ہوئی بیل تلے قالین پر لیٹ کر خط لکھنے والی لالہ کی کسی سہیلی کا شبہ ہو رہا تھا۔ میرے خیال میں آدمی کی اصلیت گھر جانے کے بعد کھلتی ہے۔ ایک آدمی اگر سارا دن بازار میں چلبلی اور سگریٹوں کی بلیک کرتا ہے تو بہت ممکن ہے وہ گھر پہنچ کر سجدے میں گر پڑتا ہو اور خدا سے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتا ہو ــــــ

اور پھر مجھے منصور نے لالہ کا پہلا خط دکھایا۔ یہ خط کافی طویل ہے میں اپنے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے اس خط کے کچھ حصّے درج کرتا ہوں۔ یہ سبز روشنائی سے نیلے کاغذوں پر لکھا گیا تھا اور کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا۔

"اچھے دوست!

آج صبح اپنے کمرے میں آتے ہی جب میں نے پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھولیں تو صبح کی سہانی ہوا کے نرم اور خوشگوار جھونکے، بنفشہ کے پھولوں کی خوشبو اور چنبیلی کی جھکی ہوئی سپید کلیوں کی پہلی مہک ہنستے مسکراتے مہمان بچوں کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ انہوں نے مجھے زندگی اور بہار کے پھولوں کا پیغام دیا لیکن افسوس میں ان مہمانوں کی آمد پر خوشی کا اظہار نہ کر سکی۔ میں ان کا استقبال مسرت اور شادمانی سے نہ کر سکی۔ میں نے رات بھر جاگ کر گذاردی ہے۔ میں رات بھر نہیں

سو سکی۔ رات کے پہلے حصے میں مجھ پہ تھوڑی سی غنودگی طاری ہو گئی تھی مگر نصف شب گذر جانے پر میری آنکھ کھل گئی اور میں پھر نہ سو سکی۔ محض تکیے پر سر رکھ کر جاگتے میں خواب دیکھتی رہی۔ جب لیٹے لیٹے تھک گئی تو تکیوں کو قالین پہ گرا کر ایک نئے انداز سے نیند کو بہلانے لگی۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح نیند آ جائے اور میرا بوجھل دماغ سکون پا سکے لیکن کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی اور نیند نہ آئی۔ رات کی خاموشی اور غمگین تنہائی میں میرے دل کے اندر کئی قسم کے شبہات کی نیند بھی ٹوٹ گئی تھی اور وہ بیدار ہو گئے تھے۔ اور میں سوچتی رہی ——— سوچتی رہی ——— چاند کھڑکی سے باہر نور کی آبشار سی گرا رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس نے اپنے سفر کو مشرق کی طرف آسمان کے آخری کناروں کو چھو کر ختم کر دیا۔ صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی مگر مجھے نیند نہ آئی۔

ہم صرف تین چار بار ملے ہیں اور ہم ایک دوسرے کے کس قدر قریب آ گئے ہیں۔ ہم نے اس وقت اپنی دوستی کی بنیاد رکھی ہے جب آسمان پہ بہار کا چاند مسکرا رہا تھا اور درختوں پہ شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ ہماری دوستی کا آبگینہ انتہائی نازک ہے۔ آؤ اس نازک آبگینے کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ میں سوچتی ہوں۔ میں رات بھر سوچتی رہی ہوں۔ میں تم سے ملتی ہوں۔ تمہیں فون کرتی ہوں اور اب خط لکھ رہی ہوں۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو کیا ہو گا؟ ہائے پھر میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ اگرچہ مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ لیکن پھر میں ضرور مر جاؤں گی۔ میں اپنے ماں باپ

کو بدنام ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ منصور! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میرا ذکر کسی سے نہ کرو گے۔
میرے سامنے اپنے اخلاص کی قسم کھاؤ کہ تم لالہ کی دوستی کا راز صرف اپنے تک
ہی محدود رکھو گے۔ بدنامی سے دوستی آزردہ ہو جائے گی اور اس کا دل ٹوٹ
جائے گا۔ میں یہ خط اپنی کوٹھی کے عقب میں ایک عظیم درخت کی گھنی چھاؤں میں
بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ بند کمروں میں میرا دل بہت جلد گھبرانے لگتا ہے۔ مجھے دیواروں
سے نفرت ہے۔ میں شہروں میں کبھی نہیں رہنا چاہتی۔ شہر گندگی کے مسکن ہوتے ہیں
میں پہاڑ کی گود میں، عشق پیچاں اور جوہی کی بیلوں میں گھرے ہوئے کسی پُرسکون
مکان میں زندگی گذارنا چاہتی ہوں۔

پچھلے دنوں ایک رات میں نے بڑا ہی خوبصورت خواب دیکھا۔ میں نے کئی بار
اس خواب کا تم سے ذکر کرنا چاہا لیکن نہ جانے کیوں نہ کر سکی۔ آج میں تمہیں پہلا خط
لکھ رہی ہوں۔ اپنی دوستی کا پہلا پھول بھیج رہی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ اس پھول
کی پتیوں پر اپنا سہانا خواب لکھ بھیجوں۔ اس رات میں تم سے مل کر آئی تھی اور بہت
خوش تھی۔ حسب عادت شام کو نہانے کے بعد میں نے کھانا کھایا اور ریڈیو سنتے سنتے
سو گئی۔ خواب میں دیکھتی ہوں کہ ایک بڑی خوبصورت وادی ہے۔ شبنمی مرغزار ہے
اور رنگ برنگے پھول کھل رہے ہیں اور آوارہ نکہتوں کے کارواں رقصاں ہیں۔ اسی مرغزار
میں ایک شاداب ٹیلے کے پہلو میں لیٹی ہوئی سبز جھیل ہے جس کے ارد گرد
چناروں کے گنجان درخت کھڑے ہیں۔ ہلکی ہلکی نیلگوں چاندنی کا حسن ہر شے کو

مسحور کئے ہے۔ نیلا چاند درختوں کی ٹہنیوں میں سے مرغزار کو دیکھ رہا ہے میں کنول
کے پھول اپنے بالوں میں سجائے جھیل کے کنارے بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی ہوں
کہ اچانک ایک جانب سے شہنائیوں اور دفوں کے بجنے کی آوازیں آتی ہیں میں
اٹھ کر ادھر ادھر دیکھتی ہوں مگر مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جب آوازیں بہت
قریب آجاتی ہیں تو مجھے رنگین عماریوں والا قافلہ ٹیلے کا موڑ گھومتا نظر آتا ہے۔
میں ایک درخت کی اوٹ میں چھپ جاتی ہوں۔ یہ لوگ خانہ بدوش ہوتے ہیں۔
ان کے سردار کو یہ جگہ بہت پسند آتی ہے اور وہ کچھ دنوں کے لئے وہاں رک جاتا ہے۔
خیمے نصب کر دیئے جاتے ہیں۔ جگہ جگہ آگ روشن ہو جاتی ہے اور چنگ و مردنگ
پر حسین رقاصائیں ناچنے لگتی ہیں۔ ایک رات جبکہ وادی پر گہرا سناٹا چھایا ہوتا
ہے اور خیموں کے باہر بجھی ہوئی آگ میں سے دبا دبا سا دھواں نکل رہا ہوتا ہے میرے
دل میں اس قافلے کے سردار کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور میں وادی میں اتر
آتی ہوں۔ ہر طرف خاموشی ہوتی ہے۔ رات کی ہوا میں خیمے کے آگے گرے ہوئے
پتے آہستہ آہستہ ہل رہے ہوتے ہیں۔ سردار کا خیمہ سب سے زیادہ خوبصورت اور بڑا
ہوتا ہے۔ میں وہاں پہنچ کر رک جاتی ہوں۔ خیمے کا پردہ سرکا کر اندر جھانکتی ہوں۔ کیا
دیکھتی ہوں کہ شمعدان میں تین موم بتیاں جل رہی ہیں۔ حنا کی خوشبو چاروں طرف پھیلی
ہوئی ہے۔ قالین پر ایک طرف پھولوں بھرے طشت پڑے ہیں اور پاس ہی ایک
بڑا خوبصورت شہزادہ سرخ تکیوں سے ٹیک لگائے سو رہا ہے۔ میں غور سے

دیکھتی ہوں تو میرے تعجب کی انتہا نہیں رہتی۔ کیونکہ اس شہزادے کی صورت منفعل
سے مشابہ ہوتی ہے۔ میں جلدی سے پردہ گرا دیتی ہوں اور بڑی اداس اپنے
گھر کی سمت چل پڑتی ہوں۔ ساری رات پہاڑوں پر گھومتے پھرتے گذار دیتی ہوں۔
دوسرے روز پتہ چلتا ہے کہ قافلے کا سردار اس وادی میں اپنی شہزادی کی تلاش
میں آیا ہے۔ وہ جہاں کہیں خوبصورت وادی دیکھتا ہے پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔ وہ
کہتا ہے اس کی شہزادی خوبصورت وادیوں کی شیدائی تھی۔ چونکہ شہر کے لوگوں
نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اس لئے وہ شہروں کو چھوڑ کر پہاڑوں پر آ گئی
ہے۔ میں سب کچھ سنتی ہوں اور دل میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ سارا دن میں اپنے
چھوٹے سے مکان سے باہر نہیں نکلتی۔ ایک رات میں دبے پاؤں سردار کے خیمے
کے باہر پہنچ کر پردہ آہستہ سے اٹھاتی ہوں اندر داخل ہوتی ہوں اور نرگس کے پھولوں کا
گلدستہ اس کے خوبصورت چہرے کے قریب رکھ کر واپس آجاتی ہوں، اور پھر اس
سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی ہوں۔ تمام رات میں سفر میں کاٹتی ہوں اور
کے وقت میں پہاڑ کی دوسری جانب کے جنگلوں میں پہنچ جاتی ہوں۔ دن نکلے
شہزادہ اٹھتا ہے تو اپنے سرہانے نرگس کے پھول دیکھ کر خوشی کا ایک نعرہ لگاتا ہے
اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی شہزادی اسی وادی میں ہے۔ وہ اپنے خادم
وادی کا کونا کونا چھان مارنے کا حکم دیتا ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ میرے
بھائی، بہنیں، ماں، ابا۔۔۔ میرے تمام گھر والے میری تلاش میں وہاں

ہیں۔ وہ مجھے پکڑ لیتے ہیں اور زبردستی اپنے ہمراہ گھسیٹنے لگتے ہیں۔ میں شور مچاتی ہوں۔ میں رو رو کر کہتی ہوں کہ میں شہر دل میں نہیں جاؤں گی۔ میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں اپنے شہزادے سے بھاگ کر آگئی تھی اور اب اسے ہی آوازیں دیتی ہوں۔ مدد کے لئے پکارتی ہوں۔ لیکن کوئی میری مدد کو نہیں آتا اور میرے والدین مجھے باندھ کر گھر لے آتے ہیں اور یوں وہ شہزادہ مجھ سے دور ہو جاتا ہے۔ مگر کچھ دنوں بعد میں ایک رات پھر گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں۔ میں سیدھی اس وادی میں پہنچتی ہوں اور میرا دل یہ دیکھ کر ڈوب جاتا ہے کہ قافلہ جا چکا ہے اور وہاں سوائے بجھی ہوئی آگ کے ڈھیروں اور ٹوٹی پھوٹی طنابوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں اسی جگہ ایک پتھر پر بیٹھ کر رونے لگتی ہوں۔ روتے روتے جب میرے دل کا غبار کسی قدر ہلکا ہوتا ہے تو اچانک کوئی میرے کندھے پر آہستہ سے اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ میں چونک کر دیکھتی ہوں تو میرے سامنے وہی شہزادہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ جھک کر مجھے کہتا ہے۔

"تم مجھے نرگس کے پھول دے کر گئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں تمہارا انتظار کروں۔ یہ پھول امید کا نشان ہے۔ اس میں ایک صبر آزما انتظار سلگتا رہتا ہے"

پھر میں بڑی جلدی خوش ہو جاتی ہوں اور میرے آنسو ایک دم خشک ہو جاتے ہیں۔ شاید دنیا میں آنسوؤں سے زیادہ جلدی خشک ہو جانے والی اور کوئی شے نہیں۔ میں شہزادے کے

سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور کہتی ہوں کہ ہم اب کبھی شہروں میں واپس نہیں جائیں گے۔ یہی ہمارا گھر اور یہی ہمارا شہر ہے۔ یہی ہماری دولت اور سرمایہ ہے۔ ہمیں قیمتی کپڑوں اور بیش قیمت زیوروں کی ضرورت نہیں۔ یہ پھول ہمارے زیور ہیں اور یہ وادیاں، چشمے اور جھیلیں ہمارے دوست اور ساتھی ہیں۔ یہ بڑے بڑے گنجان درخت ہمارے بزرگ ہیں۔ شفق کی سرخی، چاند کی ملائم کرنیں، پھولوں کی خوشبو، شبنم، ستارے، بادل، قوس قزح، کہکشاں کی جھلملاتی افشاں، یہ معطر ہوائیں، مرمریں آبشاروں کی گنگناہٹ ــــ یہ سب ہماری دولت ہے۔ یہ سب ہمارے ہیں۔ ہمارے اوپر کھلا نیلا آسمان ہوگا اور نیچے پھولوں سے لدی دھرتی ہوگی اور وسیع میدان ہوں گے اور رقص کرتے بادل ہوں گے۔ اس سے زیادہ ہمیں کیا چاہئیے۔ ہم اوس کی نیلی دھند میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈیوں پر ہاتھ میں ہاتھ دیئے گیت گاتے پھریں گے اور ہمیں کسی کا خوف نہ ہوگا کسی کا ڈر نہ ہوگا ــــ لیکن میری نیند ٹوٹ جاتی ہے اور سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور میں اپنے سامنے پتھریلی دیواروں میں ہنستی ہوئی کھڑکیاں اور دروازے دیکھتی ہوں اور میرے دل پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور میں بازوؤں میں چہرہ چھپا اپنے سنہرے خواب کے تعاقب میں بھاگتی ہوں مگر وہ رنگ کہیں اڑ گئے ہوتے ہیں اور وہ سورج کہیں ڈوب گئے ہوتے ہیں میں پریشان سی ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اچانک نزہت آگئی اور میری اداسی بہت حد تک دور ہو گئی۔

نزہت سے مل کر مجھے ہمیشہ یہی احساس ہوتا ہے کہ میں اسے پہلی بار مل رہی

ہوں۔ وہ میری بہت ہی اچھی سہیلی ہے۔ وہ بھی تمہیں بہت اچھا سمجھتی ہے۔ میں نے اسے سارا خواب سنایا۔ اور ہم بڑی دیر تک تمہاری باتیں کرتی رہیں۔ منصور کی باتیں کرتی رہیں۔ اپنے اچھے دوست کی باتیں کرتی رہیں۔ دن کافی خوشگوار اور روشن تھا۔ بستر چھوڑنے کے بعد میں نے سب سے پہلے نماز پڑھی۔ میں صبح کی نماز کبھی نہیں چھوڑتی۔ میرا نماز پڑھنے کا طریقہ اور لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ میں اکثر لیٹے لیٹے بھی نماز پڑھ لیتی ہوں۔ میرا مقصد تو صبح سویرے اٹھ کر چند لمحوں کے لئے خدا کی یاد میں کھو جانا ہوتا ہے۔ مجھے خدا سے دعا مانگ کر اور اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر بے انداز مسرت ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا ہی انسان کو سب کچھ عطا کرتا ہے۔ وہ جس کو چاہے عزت دے دے اور جس کو چاہے ذلت کے گڑھے میں پھینک دے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے چائے پی۔ آسمان پر دیکھتے دیکھتے بادلوں کے ٹکڑے منڈلانے لگے۔ یہ تو موسم کے خوشگوار ہونے کا پیام تھا۔ بادلوں کے چند ٹکڑے موسلا دھار بارش کا دیباچہ بن گئے۔ پھر اتنی بارش ہوئی کہ پھولوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ ایسی بارش میں انسان کو ضرور بھیگنا چاہیے۔ یہ تو پریوں کے آنسو ہوتے ہیں۔ بارش کی آواز میں ایک دلگداز ترنم ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی گمنام جزیرے میں دو محبت کرنے والے باتیں کر رہے ہوں۔ ریڈیو پروگرام شروع ہو چکا تھا اور سریندر کور فلم سانوریا کا ایک دردانگیز گانا گا رہی تھی۔ میں کھڑکی پہ جھکی باہر کا سماں دیکھ رہی تھی۔ بارش کا رُخ میری طرف تھا۔ میں بھیگتی جا رہی تھی۔ امی وہاں کھڑے ہونے سے منع کر رہی تھیں۔ لیکن مجھے تو اس ہلکی ہلکی پھوار میں جو انگور کی نازک بیلوں کو چھو کر آتی

تھی۔ بھیگتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں آئس کریم کھا رہی ہوں۔ یہ پہاڑوں او
وادیوں سے آنے والے نم آلود جھونکے تھے اور مجھے ان کے استقبال میں بازو پھیلا
چاہیے تھے۔ یہ تو مجھے اجنبی وادیوں کے پھولوں اور درختوں کے سلام کہنے آئے
جب بارش زیادہ تیز ہوگئی تو میں سب کی نظریں بچا کر باغ میں نکل آئی اور آنکھیں بن
کر کے گھاس پر سیدھی لیٹ گئی۔ مجھ پر مینہ کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں۔ بارش کے موٹے
قطرے میرا سارا بدن چوم رہے تھے۔ یہ پریوں کے آنسو اور یہ بادلوں کے تھنوں سے
ہوا چمکیلا دودھ۔ میرے سارے غم دھلتے جا رہے تھے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے
مگر مجھے ان کی کب پرواہ تھی۔ میری قمیص کا رنگ بھی بادلوں ایسا تھا۔ سرمئی، ہلکا
۔۔۔ بادل مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ یہ میرے اس قدر قریب آجائیں کہ
انہیں اپنے ہاتھوں سے چھو سکوں۔ یہ برف پوش چوٹیوں کو چوم کر آنے والے باد
یہ شہروں کی گندگی دھونے آتے ہیں۔ یہ اپنے ساتھ پھولوں کی مہک اور کلیوں کی پاکیز
لاتے ہیں۔ یہ لوگوں کو پاکیزگی اور حیا کا سبق دینے آتے ہیں۔ یہ مجھے بلانے آتے ہیں
میرے دروازے کے باہر دستک دے کر کہتے ہیں" لالہ! آؤ۔ ہمارے ساتھ آؤ
گھر ہمالیہ کی چوٹیوں پر ہے۔ ہم گلپوش وادیوں پر جھک کر گزرتے ہیں۔ ہم دہقانو
جھونپڑیوں پر سے صرف گرج کر گزرتے ہیں اور ہم شراب خانے پر کھل کر برستے ہیں
کسانوں کا رزق ہیں اور شاعروں کی شراب ہیں اور پہاڑیوں کے آنچل ہیں۔ ہم منصور کے
بھی گئے تھے لیکن وہ ٹی ہاؤس کے بند کمرے میں بیٹھا جلی ہوئی چائے پی رہا تھا۔

منصور! ہم عمر بھر دوستوں کی طرح رہیں گے۔ ہم پہلو بہ پہلو مرغزار درندوں سے اٹے ہوئے جنگلوں سے گزریں گے۔ ہم سنسان وادیوں اور تاریک گھاٹیوں کو عبور کریں گے۔ انسانوں سے محفوظ ہونے پر ہم جنگلی درندوں کے خوف سے آزاد ہوں گے۔ ہم زرد دانتوں اور زرد آنکھوں والے چیتوں کو اپنا ساتھی بنائیں گے۔ ہم بھیسن کی طرح خون آشام شیروں سے لڑیں گے اور ہم جھاگ اڑاتے منہ زور گھوڑوں پر سواری کریں گے اور ہمارے برق رفتار رتھوں کے پہیے ایک جنگل سے دوسرے جنگل اور ایک فتح سے دوسری فتح کی طرف دوڑیں گے —— میرے دوست! کیا ہمارے یہ خواب پورے ہو سکیں گے۔ کیا خواب کے مرغزاروں میں ساتھ دینے والے ساتھی دن کے ویرانوں میں ساتھ چھوڑ جاتے ہیں؟

منصور! مجھے دنیا والوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ میں اگر چاہوں تو تمہیں ہر روز ملنے کے لئے آسکتی ہوں۔ گھر والے مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ میرے کسی بہانے کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن میں ان کے اعتماد کو دھوکا دینا نہیں چاہتی۔ مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کا بھی خیال ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔ ابھی ہماری دوستی نے اپنی آنکھیں کھولی ہی ہیں۔ ابھی اس کتاب کا پیش لفظ ہی لکھا جا رہا ہے اور ابھی یہ گاڑی اپنے جنکشن سے نکل ہی رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ہم پر آوازے کسنا شروع کر دیں اور یہ کتاب اپنے پیش لفظ پر ہی ختم ہو جائے اور یہ گاڑی آؤٹر سگنل پر ہی کھڑی ہو جائے۔ ہم ابھی نہیں ملیں گے۔ میں فون بھی دوسرے دن کیا کروں گی اور خط بھی کبھی کبھار لکھا کروں گی۔ ویسے تم اس کا جواب مجھے کل ہی دے دینا ہم سرما میں جبکہ پہاڑوں پر برف گر رہی ہوگی

اور گندے لوگ اپنے اپنے ڈربوں میں بند ہوں گے کسی انتہائی بلند اور پاکیزہ مقام پر
ملیں گے ہماری دوستی قربت اور ہمسائگی کی محتاج نہیں ہے۔ ہم الگ رہ کر بھی ایک دوسرے
کو یاد کر سکتے ہیں۔ اور ہماری دوستی کی بیل ہری بھری رہ سکتی ہے۔

کل ہم سب لوگ راوی کی سیر کو گئے۔ نزہت اور میں دریا کنارے گھاس پر بیٹھ کر تمہاری
باتیں یاد کر کے ہنستی رہیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"پہلے روز جب منصور نے پھول پیش کئے تھے۔ کتنا معصوم بنا ہوا تھا"۔

یہ خط پڑھ کر پھاڑ دینا۔ تم سے کہیں ادھر ادھر ہو جائیگا۔ نزہت سلام کہہ رہی تھی اس
کا خیال ہے کسی روز ہم تینوں مل کر دریا کی سیر کریں۔ کیا خیال ہے؟ میں بڑی ٹھنڈی چھاؤں
والے درخت تلے بیٹھ کر اس خط کے آخری الفاظ لکھ رہی ہوں اور تم کلیم بھائی کے پاس
ٹی ہاؤس میں بیٹھے گرم گرم چائے پی رہے ہو گے۔

DRINK HOT COFFEE
DRINK HOT TEA
BURN YOUR LIPS
AND THINK FOR ME

تمہاری دوست

لالہ رُخ

اگرچہ اپنے اس پہلے خط میں لالہ نے محبت کا لفظ کہیں استعمال نہ کیا تھا لیکن اسے پڑھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ سارا خط اسی ایک لفظ کو چھپا کر لکھا گیا ہے۔ ویسے بھی جہاں پانی گہرا ہو وہاں دریا خاموش ہوتا ہے اور جہاں محبت کا لفظ زبان پر نہ آئے وہاں اس کی جڑیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جذباتی ہونے کے باوجود لالہ نے اپنے خط میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا لیکن اس کے جواب میں منصور نے کھلے الفاظ میں اپنی محبت کا اعتراف کر لیا۔ اس نے لکھا۔

"اچھی لالہ!

تمہارا پہلا خوبصورت خط مجھے ملا۔ کل ہی اس کا جواب لکھنا چاہتا تھا مگر عین وقت پر سینما کا پروگرام بن گیا۔ کلیم بھائی بھی ساتھ ہی تھے۔ فلم دیکھ کر باہر نکلے

تو کلیم نے کہا:

"ٹی ہاؤس چل کر چائے پی جائے"

دراصل میں وہیں سے گھر بھاگنا چاہتا تھا۔ دل میں یہ خیال تھا کہ گھر جا کر تمہیں خط لکھونگا
مگر کلیم بھائی کی خواہش کا احترام کرتے ہی بنی۔ ٹی ہاؤس کھلا تھا۔ اندر بیٹھ کر چائے بنوائی،
پی۔ سگریٹ اڑائے۔ فلم پر کچھ تنقید و تبصرہ کیا۔ کچھ دیر تمہاری اور تمہاری سہیلی نزہت
کی باتیں ہوتی رہیں۔ پورے ڈیڑھ بجے گھر پہنچا۔ لیمپ جلایا۔ تمہارا خط ایک بار پھر پڑھا۔ بٹوے
میں سے تمہاری تصویر نکال کر دیکھتا رہا۔ خط لکھنے بیٹھا تو پتہ چلا کہ سیاہی ختم ہو گئی ہے۔ ناچار
اٹھا اور پلنگ پر نیند کا انتظار کرنے لگا۔ کتنی ہی دیر تک میں تمہارے خط اور تمہاری دلچسپ
باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ میرے کانوں میں تمہاری خوبصورت باتیں اور لاابالی قہقہے گونج
رہے تھے۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ صبح حسبِ عادت پانچ بجے آنکھ کھل گئی۔ بستر پہ لیٹے ہی لیٹے
نیند میں بھی ہوئی آنکھیں کھول کر آسمان کو دیکھا۔ بھڑکتے ہوئے نیلے تاروں کی رنگت اڑی
جا رہی تھی۔ ہوا تازہ اور خوشگوار تھی۔ مجھے تمہارا خیال آ گیا۔ یہ سوچ کر کہ تم اس وقت سو رہی
ہو گی۔ میں ہنس پڑا۔

سیر کے لئے اٹھ کر نیچے آیا۔ پتلون پہنی۔ بوٹ پہن رہا تھا کہ نیند کا ایک زبردست
جھونکا آیا اور مجھے پلنگ پر گرا کر آگے نکل گیا۔ دراصل اوپر ٹھنڈ تھی اور نیچے دیوان خانے
میں ہلکی ہلکی گرمائش (جسے پنجابی میں نگھ کہتے ہیں) تھی اور اس نے بھنگ کا کام کیا۔
میں وہیں سو گیا —— ہائے نیند! —— مجھے نیند سے عشق ہے۔ صبح آنکھ کھلی تو نو بج

رہے تھے۔ چونکہ اتوار تھی۔ بڑے مزے سے اٹھا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ نمکین چائے کا پیالہ پیا اور پلنگ پر لیٹ کر مرزا صاحباں کا وہ حصہ پڑھنے لگا جہاں مرزا اپنے نیلے گھوڑے پر سوار ہو کر صاحباں کے گاؤں جانے لگتا ہے اور اس کی بہن اسے کہتی ہے

چڑھدے مرزے خان نوں
اوہدی بھین رہی سمجھا
وے منڈے موہنی صاحباں
اوہدی گلیاں مول نہ جا
وے نیلی گھوڑی والیا
گھوڑی نوں موڑ لیا
ساڈی گھڑی پلاں دی سانجھ نوں
بہتیں اپنے ڈولی پا

اور ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ میں نے کتاب منہ پر رکھ لی اور سو گیا۔ سونا میری بہت بڑی عیاشی ہے۔ نیند وفادار کتے کی طرح میرے اشارے کی منتظر رہتی ہے۔ میں جس وقت اور جب چاہوں سو سکتا ہوں۔ لوگ چائے پی لیں تو ان کی نیند غائب ہو جاتی ہے اور میں چائے پی کر سونے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگتا ہوں۔ کچھ دنوں کی بات ہے میں سیر سے واپس آنے لگا تو ایک جگہ کھیتوں میں رہٹ چلتا دیکھ کر رک گیا۔ پیاس بھی لگ رہی تھی۔ پانی پیا۔ جوتے اتار کر

برے چھینکے اور پاؤں چہ بچے کے ٹھنڈے پانی میں لٹکا کر درخت کے تنے سے ٹیک لگا دی۔ اور خدا کی قسم فوراً نیند آ گئی۔ جس وقت آنکھ کھلی سورج نکل چکا تھا۔ کھیتوں پر چمکیلی دھوپ پھیلی تھی اور میرے اوپر درخت کی شاخوں میں چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ ایک رنگین سی چڑیا میرے بالکل قریب منڈیر پہ پھدک رہی تھی۔ میں نے ایک آنکھ بند کر کے بڑی مکاری سے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ وہ میرا ارادہ بھانپ گئی اور پھُر سے اڑ گئی۔

اچھی لالہ! میں تمہیں بہت یاد کرتا رہتا ہوں۔ تمہیں ملے پندرہ روز ہو گئے ہیں کبھی کبھی میں بڑا اداس ہو جاتا ہوں۔ رات کو جب ٹی ہاؤس میں گاہکوں کی آمد و رفت کم ہو جاتی ہے تو کلیم اور میں ایک جگہ بیٹھ کر تمہاری باتیں کیا کرتے ہیں۔ تمہیں کلیم کو اپنا بھائی سمجھنا چاہیے۔ وہ ہمارا دوست ہی نہیں ہمدرد بھی ہے۔ تمہارا خط برق رفتار تھا۔ اس میں بڑی روانی اور سلاست تھی۔ دراصل تمہارا ذہن تمہارے قلم کا ساتھ دیتا ہے اور اپنا یہ عالم ہے کہ کبھی ذہن پیچھے رہ جاتا ہے اور کبھی قلم —— ویسے بھی میں آہستہ آہستہ لکھتا ہوں اور بسا اوقات دل کی بات بیان کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ مگر تمہارا خط پڑھ کر میرا دل شیر کا دل ہو گیا ہے اور وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے سینے میں صرف دل ہی دل ہے۔ اب میں ہر بات پوری بے باکی اور آزادی سے بیان کر سکوں گا۔ لالہ! تمہاری عزت اور ناموس کی پاسداری مجھ پر فرض ہے۔ میں تمہارے وقار اور خلوص کی راتوں کو جاگ کر حفاظت کروں گا۔

تمہاری حیا اگر تمہاری شخصیت کا نگینہ ہے تو میرے سر کا تاج بھی ہے۔ اب میں تمہیں اپنے دل کی باتیں کہنے لگا ہوں۔ تم ان باتوں کا برا نہ ماننا لالہ! تم کہیں روٹھ نہ جانا۔ اس لئے کہ پھول کبھی شاخ سے نہیں روٹھا اور سورج کبھی اپنی کرنوں سے بیزار نہیں ہوا۔ تم میرے مشرق کا سورج ہو اور میری شاخ کا پھول ہو۔ سدا مہکنے والا شگفتہ پھول — میں تمہیں چاہتا ہوں، تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ مجھے پہلے خدا پر اور بعد میں اپنے خلوص پر بھروسہ ہے۔ تمہاری محبت میرے تاریک سمندر میں گمشدہ جزیرے کی طرح ابھری ہے یہ شعلہ میرے دل میں اسی شام بھڑک اٹھا تھا جب تم سٹیج پر آئی تھیں اور تم نے نظم پڑھی تھی اور میں نے تمہیں لالہ کے سرخ پھول پیش کئے تھے۔ خدا میرے ساتھ ہے۔ کلیم کی دوستی میرے ساتھ ہے اور اگر تمہاری محبت بھی شریک حال رہی تو میں شہر کی سب سے بلند عمارت پر کھڑے ہو کر اپنی خوش بختی کا اعلان کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ تمہیں اس سے پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ کنیز سے بچھڑ کر تمہیں پا لینے کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہیں تھا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ مجھے زندگی کے تپتے صحراؤں میں تمہاری محبت کے ٹھنڈی اور خوشبودار چھاؤں والے درخت نصیب ہوں گے۔ کنیز کے جانے پر میری جھولی میں جتنے پھول باقی بچے تھے میں نے وہ سارے تمہارے قدموں پر ڈھیر کر دیے ہیں۔ میں جھولی جھاڑ کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ اگر تم بھی میری زندگی سے نکل گئیں تو میں چپکے سے بابل و نینوا کے کھنڈروں کی طرف نکل جاؤں گا اور ان

دنوں کو یاد کر کے رویا کروں گا جب محبت کی خاطر پھول ایسے نازک جسموں والی دوشیزائیں بلند قلعوں کے میناروں سے کود گئیں اور کھولتے لاوے میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گئیں۔

لالہ! میں نے تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ اس روز لارنس کے کیفے میں بیٹھے میں نے تمہیں صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ میں نے کنیز سے بڑی محبت کی ہے۔ اتنی محبت کہ اس کی چمک سے کنیز کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ میں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر پاگلوں کی طرح اس کے نام کا ورد کیا ہے۔ اس کی باتوں کو یاد کر کے ہنسا ہوں اور اس کی رخصتی کا منظر دیکھ کر رویا ہوں۔ میں اسے حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی چٹان سے ٹکرا گیا۔ لیکن کمزور لڑکی نے مجھے بے دست و پا کر کے رکھ دیا۔ اس نے مجھے اپنی محبت کا واسطہ دے کر مجھ سے جدائی کی بھیک مانگی۔ اور یوں ڈھیلی کمان سے نکلا ہوا تیر تھوڑی ہی دور جا کر گر پڑا۔ کنیز کے بارے میں تمہیں کچھ باتیں اور بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ میں تمہیں اپنے بہت ہی قریب لا رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ تم میرے ساتھ ایک میز پر بیٹھو میں تم پر اس میز کے تمام خانے کھول دینا چاہتا ہوں۔ میں نے کنیز کا ذکر سوائے تمہارے کبھی کسی سے نہیں کیا۔ میں اپنی محبت کو مشکِ آہو کی طرح بڑا چھپا چھپا کے رکھتا ہوں۔ یہ میری عادت ہے۔ میں نے کنیز سے محبت کی اور اس کی محبت کو کوٹ کی اندرونی جیب میں یوں چھپا لیا جیسے وہ کوئی چوری کا مال ہو۔ میں اپنے درد میں کبھی کسی کو شریک نہیں کیا کرتا۔ میں کئی کئی دن سر درد میں مبتلا رہا

ہوں اور میرے گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکی۔ میں تمہیں کنیز کا اصلی نام پھر کبھی بتاؤں گا۔ فی الحال تمہیں اسے ہی اصلی سمجھو۔

کنیز ہماری زیادہ دور کی رشتہ دار نہیں تھی۔ وہ نہ تو اتنی خوبصورت تھی اور نہ زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی ہو گی اگر میں یہ کہوں کہ وہ مجھے چاہتی نہیں تھی یا اس نے میری قدر نہیں کی۔ دراصل وہ اپنے ماں باپ کی بہت زیادہ فرمانبردار لڑکی تھی اور اس کے ماں باپ جہاں اس کی شادی کرنا چاہتے تھے وہاں سے انہیں اچھی خاصی رقم ملنے کی توقع تھی۔ اتنی رقم جس کی مدد سے وہ اپنا رہن شدہ مکان چھڑا سکتے تھے۔ چنانچہ کنیز بے بس ہو گئی۔ علاوہ ازیں ہم اپنے رشتہ داروں میں کافی بدنام ہو چکے تھے۔ ہمارا ملنا جلنا بالکل بند ہو گیا۔ اس کی شادی ہونے لگی۔ اس نے نہ جانے کیا سوچ کر افیم کھا کر خودکشی کی کوشش کی لیکن بچا لی گئی، اور دو تین ہزار کی رقم ڈوبتے ڈوبتے بچ گئی۔ میں نے صرف کنیز سے شادی کرنے کے لئے اپنے مستقبل کے تمام درخشاں خوابوں کی بازی لگا دی۔ مگر کنیز کے بھائیوں کے سوائے خاندان کے ہر فرد نے میری زبردست مخالفت کی۔ میں نے کنیز سے کہا "چلو بھاگ چلیں"۔ وہ کھڑی تھی۔ اتنا سن کر بیٹھ گئی۔ "کیسے بھاگ چلوں؟ کیسے بھاگ چلوں؟" ...... وہ رونے لگی ___ روتی رہی اور روتے روتے ڈولی میں سوار ہو گئی اور میں نے سنا ہے وہ آج کل بھی روتی ہے۔ مجھے یاد کر کے نہیں۔ ان دنوں کو یاد کر کے جو اس نے اپنے میکے میں کنواری رہ کر بسر کئے تھے۔ شادی پر اس کے بھائیوں نے مجھے بھی بلاوا بھیجا۔ مگر لالہ! کبھی کوئی اپنے جنازے پہ بھی گیا ہے؟

عورت بہت جلد دوسرے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں ــــ کنیز بھی نئے ماحول کو اپنا لے گی۔ میں اسے کبھی نہ مل سکوں گا۔ میں اسے کبھی نہیں ملنا چاہتا۔ میں اسے مل کے کیا کروں گا؟ خدا اسے اپنے گھر میں خوش رکھے اور بچے پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے ــــ میں نے اس سے بے غرض محبت کی تھی جسے وہ ہمیشہ یاد رکھے گی اور جو اسے پھر کبھی نصیب نہ ہو سکے گی۔ صبح سے شام تک دفتر میں کلرکی کرنے والا اور رات کو اس کی ہڈیاں جھنجھوڑنے والا خاوند اسے سوائے مریل بچوں کے اور کچھ نہ دے سکے گا۔ میں کنیز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھلا دینا چاہتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجھے چھوڑ گئی ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے ذہنی اور روحانی طور پر مجھے بہت تکلیف دی ہے۔ وہ میری محبت کی تھاہ تک نہ پہنچ سکی ورنہ مجھے اس قدر آسانی سے چھوڑ کر نہ جاتی۔ پھر بھی جو کچھ ہوا ہے ٹھیک ہوا ہے۔ ان دنوں جب میں کنیز سے شادی کی سر توڑ جدوجہد کر رہا تھا کبھی کبھی اپنے آپ سوچنے لگتا کہ اگر کنیز وہ نہ بن سکی جو میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں تو کہیں میں اس سے بیزار تو نہیں ہو جاؤں گا؟ ظاہر ہے وہ مجھ سے کبھی ہمالیہ کی نیلگوں پہاڑیوں، ہالینڈ کے جنگلوں، پیرس کے قہوہ خانوں، ادب کے تازہ نظریات اور نیل کے نخلستانوں اور کانٹ کے فلسفۂ جمالیات پر گفتگو نہ کر سکے گی۔ وہ مجھ سے کبھی نہ پوچھے گی کہ جب مشرقی افق پر سورج کا جوالا مکھی پھوٹتا ہے تو سبز جھیلوں میں اگے ہوئے کنول کا رنگ کیوں ہو جاتا ہے اور جب گنجان جنگلوں میں بارش ہوتی ہے تو جھرنوں کا شور تیز کیوں

ہو جاتا ہے ؟ پھر — پھر کہیں میری طبیعت کا ملمع اتر تو نہیں جائے گا ؟ میں اپنے ذہن میں کسی نامعلوم کانٹے کی چبھن سی محسوس کرتا اور فوراً اپنا خیال کسی اور طرف لگا دیتا۔ میں یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلیاں دیتا کہ اگر کنیز پڑھی لکھی نہیں تو کیا ہوا ؟ مجھے اس کی محبت چاہیئے۔ اس کا خلوص چاہیئے۔ اس کے باوجود جب میں دیکھتا کہ شادی کے بعد میں یورپ نہ جا سکوں گا۔ ان ملکوں کی سیر نہ کر سکوں گا جہاں بڑے بڑے کتب خانے ہیں اور عجائب گھر ہیں اور کارخانے ہیں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر ایستادہ مجسمے ہیں اور گلی کوچوں میں بہنے والی نہریں ہیں — بلکہ ایک عام قسم کے مکان کی چار دیواری میں گندے اور احمق مردوں، عورتوں اور بچّوں کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقیّد ہو جاؤں گا تو میں کانپ اٹھتا۔ مجھے کنیز سے محبت ضرور تھی لیکن میں اس کے جاہل رشتہ داروں اور ان کے گندی گالیاں دینے والے اور ہر وقت رونے بسورنے والے بچّوں سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔ بس یہی ایک خیال ہے جو اب بھی کبھی کبھی میرا دل بہلایا کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں آج سے چند سال بعد میں اگر کنیز سے ملا تو اس کا رنگ زرد ہو گا، رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی ہوں گی۔ ایک بچہ اس کے پیٹ میں ہو گا اور دوسرا اس نے گود میں اٹھایا ہو گا اور بہت ممکن ہے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ قمیص اٹھا کر اپنے بچے کو وہیں دودھ پلانا شروع کر دے، اور اس کے باپ کو گالیاں دینا شروع کر دے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں لالہ کہ اس وقت میرے ذہن کی حالت کیا ہو گی۔

مگر اب جبکہ سورج ایک بار پھر طلوع ہو رہا ہے۔ میں نے اپنا چہرہ اوپر
اٹھا لیا ہے اور بازو کھول کر بادبانوں کی طرح ہوا میں پھیلا دیئے ہیں۔ میں اس کی
روشنی، تازگی اور محبت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے جسم کے ذرّات میں محفوظ کر لونگا۔
یہی وہ سورج ہے جس کی کرنوں میں روشنی اور محبّت دونوں باتیں ہیں۔ کنیز صرف
محبّت کر سکتی تھی۔ اس کی محبت سہمے ہوئے خرگوش کی طرح پنجرے کی سلاخوں
میں سے مجھے تک رہی تھی اور تمہاری محبّت کلّو کی چرواہن ہے جس کے بالوں میں
مکھن کی مہک ہے، کانوں میں سیب کے شگوفے ہیں اور پاؤں میں کھلے راستوں
کی گرد ہے۔ جو اونچے پہاڑ کی دھوپ میں کھڑی مجھے چناروں، سناروں اور ان
جنگلوں کی طرف بلا رہی ہے جہاں پھول کھلتے ہیں، جہاں چشمے پھوٹتے ہیں، جہاں
بادل اترتے ہیں اور جہاں برف گرتی ہے ——!

لالہ! تمہاری دوستی اور تمہاری محبت سمندر میں تیرتے ہوئے مجھے سیپ
کی طرح اچانک مل گئی ہے جس کا سینہ دمکتے ہوئے بیش قیمت موتیوں سے بھرا ہوا
ہے۔ میں نے ان تمام موتیوں کو اپنے دل میں جڑ لیا ہے اور میرا سینہ یوں منور ہو رہا
ہے جیسے میرے دل کے عقب میں چاند طلوع ہو رہا ہو۔ میں تمہاری محبت کو
اکلوتا بچہ سمجھ کر اپنے ساتھ چمٹائے ہوئے ہوں اور اسے کبھی اپنے سے الگ
نہیں کروں گا۔

اس اعتراف میں میری سُبکی نہیں عظمت ہے۔

تمہاری محبت نے مجھے وہ سنہری پر عطا کئے ہیں جنہیں اپنے بازوؤں پر لگا کر میں ایک بار پھر الوداع کہہ رہا ہوں اور نیلگوں فضاؤں میں پرواز کے لئے عقاب ایسے وقار کے ساتھ پر تول رہا ہوں۔ ہم نے ایک دوسرے کو روشنی عطا کی ہے اور ہم گلاب کے خوشبو دار اندھیروں میں جنگلوں کی طرح روشنی پھیلائیں گے۔ مجھ سے اپنے دل کی بات نہ چھپانا۔ میری کمزوریوں پر بے دھڑک انگلی رکھ دینا۔ مجھ میں بے شمار خامیاں ہیں اور میری تحریر تمہاری محبت کے مقابلے میں پست ہے۔ تم اس کا خیال نہ کرنا۔ اگر ہم نے زندگی کے میلے میں ایک دوسرے کو کھو دیا تو ہمیں ان پُر محبت دنوں کو فراموش نہیں کرنا ہو گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی کسی سے بات نہیں کروں گا۔ پھر کبھی کسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لوں گا۔ میں اس شہر سے چلا جاؤں گا اور لوٹ کر ان لوگوں کے درمیان نہ آؤں گا۔ میں غریب ہوں لالہ! ممکن ہے میری غریبی تمہیں مجھ سے چھین لے مگر تمہاری محبت مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ وہ میرے جسم کا خون اور میرے ذہن کی مہک ہے۔

ہمیں واقعی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں جانتا ہوں اگر ہم کسی کھلے باغ میں بیٹھ جائیں اور ہمارے اوپر چناروں کے سنہری پتے ہوں اور نیلا آسمان ہو اور نظر نہ آنے والی ہواؤں کی خوشبو ہو تو وہ دن ہماری زندگی کا حسین ترین دن ہو گا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر ہمیں کسی نے وہاں بیٹھے دیکھ لیا تو چناروں کے سنہری پتوں والے درخت دھڑام سے ہم پر آن گریں گے ہمیں

ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیئے۔ مبادا سنگِ مرمر کے وہ ٹکڑے جو ہم اپنے تاج محل کے لئے جمع کر رہے ہیں بدنامی کے سیلاب میں بہہ جائیں۔ میں جو تمہارے سفر میں شریک ہوا ہوں تو کسی دیہاتی اسٹیشن پر راستے میں ہی نہیں اتر جاؤں گا۔ ہمارا ساتھ تو اس آخری پڑاؤ تک ہے جہاں پہنچ کر ریل ختم ہو جاتی ہے اور سمندر شروع ہوتا ہے۔

لالہ! سچ جانو۔ تمہارا ذہن بہت خوبصورت ہے۔ تمہاری آنکھوں سے بھی زیادہ، تمہارا لکھنے کا انداز بڑا شگفتہ ہے۔ جب میں تمہارا خط پڑھ چکا تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا گویا میں نیکی، حسن اور روشنی کے عظیم دیوتاؤں کے روبرو کھڑا ہوں۔ میرے چہرے پر صبح کا اجالا ہے اور سر پہ گلاب کے شگوفوں کا تاج ہے۔ تمہارے خط کا ہر لفظ پھول کی نازک پتی کی مانند تھا جس کے نیچے رو پہلی مفہوم کے جیئے روشن تھے اور میں نے ہر سطر میں روشنی اور خوشبو کو گلے میں بانہیں ڈالے دیکھا ہے۔ تم نے اپنی تحریر میں جگہ جگہ میرے ہی جذبات اور میرے ہی خیالات کی نقاب کشائی کی ہے۔ ہائے طلوعِ آفتاب کا منظر —— میں اس منظر کا دیوانہ ہوں لالہ —— مجھے تو کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سورج صرف میرے لئے طلوع ہوتا ہے اور اگر میں نہ ہوتا تو صبح کبھی نہ ہوتی۔ میں سورج کا خیر مقدم گھر سے باہر کھیتوں میں جا کر کرتا ہوں۔ میں کسی اونچے درخت کے پاس کھڑے ہو کر سورج کے تھال کو آہستہ آہستہ بلند ہوتے اور شفق کو مختلف رنگ بدلتے دیکھتا ہوں اور میرا سر اس واحد اور مکمل قوت کی تعظیم

میں خود بخود جھک جاتا ہے جو رات کو تاروں کے فانوس جلاتی ہے اور پھولوں میں خوشبو اور پھلوں میں رس ڈالتی ہے۔ جو ندی بن کر خیابانوں سے گذرتی ہے اور طوفان بن کر سمندر میں جاگتی ہے۔ جو کنیز کے روپ میں بچھڑتی ہے اور لالہ بن کر پھر آن ملتی ہے۔

اچھی لالہ! میں زیادہ دیر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اس وقت میں چھبیسویں سال میں ہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ پچیس سال اور زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں عمر کا یہ باقی حصہ بڑے سلیقے سے بسر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ میرے بعد لوگ مجھے یاد رکھیں گے یا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جتنی دیر زندہ رہوں ملک ملک گھومتا رہوں اور جب مرجاؤں تو مرجاؤں۔ دنیا اگر یاد رکھے گی تو مجھے اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بھول جائے گی تو نقصان نہیں پہنچے گا۔ میرا انٹرسٹ صرف اس وقت تک ہے جب تک میں زندہ ہوں۔ جہاں زندگی ختم ہوئی یہ انٹرسٹ بھی ختم ہو جائے گا پہلے ہمیں ایسے انداز سیکھنے چاہئیں جس سے ہم اپنی نیک آرزوؤں کو عمل کے سانچے میں ڈھال کر خوش اسلوبی اور سکون سے زندگی گذار سکیں۔ موت کے بعد کیا ہوگا؟ یہ پھر سوچ لیں گے۔ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا، مرنے کے بعد زندہ رہنے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

کبھی کبھی اس شہر کے لوگوں کے درمیان گھومتے پھرتے مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی اجنبی مقام پر آگیا ہوں۔ مجھے خود پر ادھ پکے کچھ سنہری کچھ سبز کچے میٹھے

کچھ تلخ اناناس کا گمان ہوتا ہے جو دریائے ایراوتی کے دہانے پر بانس کے گنجان جنگلوں میں اگا ہو اور جیسے کوئی پھل فروش اپنی چھابڑی میں رکھے قصاب منڈی سے گذر رہا ہو۔ میں اپنے ارد گرد ذبح ہوتی بھیڑوں کی چیخ و پکار سنتا ہوں اور گرم خون کی بو سونگھتا ہوں۔ یہ بڑے پن کا احساس نہیں لالہ — اجنبیت کا احساس ہے۔ شدید اجنبیت کا۔ پھر میں کسی تنہا جگہ بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور بڑا اداس ہو جاتا ہوں۔ میری آنکھیں بند ہوتی ہیں مگر میرا دل کائنات کی عظیم قوتوں سے پوچھ رہا ہوتا ہے۔

"میرا گھر کہاں ہے؟ میرا ملک کہاں ہے؟"

لالہ! تمہارا دل ذہن کی اپنی رفعتوں کا امیں ہے۔ اگر تم نے انہیں کھو دیا تو اس کا دکھ نہ صرف مجھے ہو گا بلکہ ان بلندیوں کو بھی ہو گا جن کی چوٹیوں پہ گری ہوئی برف تمہارے چہرے سے شفق کا سونا مستعار لیتی ہے اور جس کے تقدس میں تمہاری نیکی اور حیا ہے — کبھی کبھی جب میں تمہارے اور اپنے ماحول کے تضاد پر غور کرتا ہوں تو جیسے کوئی میرے دل کو اپنی مٹھی میں دبا لیتا ہے۔ میں کس ماحول میں زندہ ہوں: اس کے متعلق میں تمہیں پھر کبھی لکھوں گا۔ ابھی تم اتنا ہی سمجھ لو کہ میری زندگی مسلسل جہد و جہد کی زندگی ہے۔ بنک کی ملازمت مجھے اتنے پیسے نہیں دے رہی کہ میں وقت اور موسم کے مطابق کپڑے پہن سکوں۔ میں اپنے دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ہر حال میں خندہ پیشانی سے ملتے ہیں اور مجھے اپنے درمیان بیٹھنے کو جگہ عطا کرتے ہیں۔ تمہارا

پاس رات کو اٹھ کر ٹھنڈی چاندنی میں ٹہلنے کے لئے ایک خوبصورت روش موجود ہے جس کے ایک طرف چنبیلی کے جھاڑ ہیں تو دوسری جانب گلاب کے شگوفے

لیکن میری راتیں خوبصورت پتھریلی روشوں پر چمکنے والی چاندنی سے محروم ہیں۔ تمہارے عظیم درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر لکھے ہوئے الفاظ میں بجلی کے کھمبوں سے ٹیک لگا کر پڑھتا ہوں۔ اس ملک میں رہنے والوں کی زندگی کس قدر مضحکہ خیز ہے لالہ! یہاں زندگی بسر کرنے کے طریقے کتنے گھٹیا ہیں!

جنوب مشرقی سمندر کے دو ایک شہروں میں، میں نے اپنی زندگی کے کچھ اچھے دن گزارے ہیں اور ان دنوں کی یاد ڈھکے ہوئے کنوئیں کی طرح میرے دل میں ہمیشہ محفوظ اور شفاف رہے گی۔ تمہارے شہر میں میرے پاس ایک بھی کھڑکی ایسی نہیں جس پر انگور کی بیل نے گھونگھٹ کاڑھ رکھا ہو اور اب تو ایسی کوئی خواہش بھی نہیں رہی۔ یہ لوگ مجھے کیا دے سکیں گے۔ یہ جہالت کے تاریک بندھنوں میں جکڑے ہوئے غلام چھوٹی سے چھوٹی بات پہ بڑے سے بڑا جھگڑا کھڑا کر دینے والے انسان! مگر آج نہیں تو کل ان کھارے سمندروں سے اپنے جہاز کا لنگر اٹھانا ہی ہوگا۔ میں نے بادبان کھول دیئے ہیں اور ان ہواؤں کا منتظر ہوں جو ہمالیہ کے کہستانی سلسلے سے اٹھیں گی۔ مجھے امید ہے اس سفر میں تم بھی میرے ساتھ ہو گی۔ پھر دیکھنا ہمارا جہاز کس برق رفتاری سے کھارے سمندروں کو عبور کرتا ہے اور کتنی جلد نیلے سمندروں میں پہنچتا ہے ——— تمہارا خواب انتہائی خوبصورت خواب تھا۔ میں واقعی تمہارے

دیئے ہوئے نرگس کے پھول لے کر تمہاری تلاش میں نکلا ہوں۔ اگرچہ میری راہ میں سائبیریا کے سرد ویرانے اور روم کے سمندر حائل ہیں۔ لیکن میں تمہیں حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ میری زندگی کی یہ بہت بڑی خواہش ہے کہ تمہیں حاصل کرنے کے بعد تمہیں اپنے ساتھ لے کر کنیز کے پاس جاؤں اور تمہیں اپنے ساتھ لگا کر اسے کہوں۔ کنیز! تم مجھے ناکامی کے لق و دق صحراؤں میں اس لئے چھوڑ گئی تھیں کہ میں بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو کر ایک دن دم توڑ دوں۔ مگر تم نہیں جانتی تھیں کہ میٹھے چشمے گرم صحراؤں میں ہی پھوٹتے ہیں اور جہاں صحرا ختم ہوتے ہیں وہاں سے سایہ دار نخلستان شروع ہو جاتے ہیں۔ دیکھو! یہ ہے میرا شیریں چشمہ۔ میرے صحرا کا نخلستان اور میرا انجیر کا درخت اور میری لالہ —— جس کی محبت ہارنا نہیں جانتی۔ جس کی محبت کا قطب مینار ریت کی بوریوں پر نہیں، سنگین چٹانوں پر تعمیر ہوا ہے۔ جو چار مہینوں میں میرے ساتھ اڑتی ہوئی ان کہساروں پر نکل آئی ہے جہاں تم چار ہزار سال میں بھی نہیں پہنچ سکی تھیں۔ جو میرے دل کی ملکہ ہی نہیں ذہن کا پھول بھی ہے ۔۔۔

کاش لالہ کبھی ایسا ہو سکے !

تم نے پرسوں فون پر بتایا تھا کہ رات کو تمہیں بال کھول کر سونے کی عادت ہے۔ آہا! بال کھول کر سونا کتنی رومانوی بات ہے۔ تم رات کا صحیح لطف اٹھاتی ہو۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی ندی کنارے ہری ہری دوب پر لیٹ جائے اور پانی کی سطح پر ہونٹ رکھ کر پیاس بجھائے۔ کھلے بالوں کے ساتھ قالین پر لیٹ کر نیلی رات

اور میٹھی نیند کا لطف اٹھانا حسین شہزادیوں کا ہی حصہ ہے۔ میرا دل تمہیں اس طرح سوتے ہوئے دیکھنے کو بڑا بے چین ہے۔ تم کچھ یوں لگ رہی ہو گی جیسے ——— وہ بادلوں میں چاند والی تشبیہہ دقیانوسی بات ہے ——— جیسے سیاہ جھیل پر کنول سو رہا ہو۔ جیسے خزاں کے زرد پتوں میں کوئی پھول اُگ آیا ہو یا جیسے ہیلن آف ٹرائے نیند میں ہو اور اس کے بالوں کا سنہری ریشم اس کے مدور شانوں پر بکھرا ہوا ہو۔ میں اسی ریشم کا کیڑا ہوں۔ کاش میں عمر بھر اسی ریشمی جزیرے میں پڑا رہوں ——— ! آج میں تمہیں اپنی محبت کا پہلا خط لکھ رہا ہوں۔ آج رات روشنیوں سے جگمگاتا ہوا خواب آنا چاہیئے۔ بس یونہی کسی جھیل میں تیر رہے ہوں۔ تمہارے بالوں میں کنول کی کلیاں ہوں اور رخساروں پر پانی کے موتی جھلملا رہے ہوں۔

آؤ ——— قدیم ہسپانوی کھنڈرات میں مہندی کی جھاڑیوں کے پاس سرخ گلاب کے قالین پر بیٹھ جائیں اور چھت تاس الاؤ روشن کر کے گتار پر مور بہادروں اور غمزدہ شہزادیوں کی داستانیں چھیڑیں جنہیں تاریخ اپنے ساتھ لے گئی اور جن کی باتیں خواب ہو گئی ہیں۔

نزہت کو میرا سلام کہنا، اور کل شام ضرور فون کرنا۔

تمہارا

منصور"

میرے وہم میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ منصور اتنا رومانی ہو سکتا ہے۔

میں اب سمجھا تھا کہ وہ جس دنیا کا سفر تھا وہ چاندنی، پھول اور آبشاروں کی دنیا تھی۔ لالہ کو کسی حد تک ایسا ماحول میسر تھا لیکن منصور اس سے بالکل محروم تھا۔ اس کے باوجود وہ لالہ سے زیادہ خیال پرست اور رومانی تھا۔ منصور کے اس خط نے لالہ کے سوئے ہوئے تاروں کو بیدار کر دیا اور اس نے اپنے دل کے تمام دروازے منصور پر کھول دیئے۔ اس نے جواب میں جو خط لکھا وہ یہ تھا:

اچھے منصور!

تم نے اس قدر خوبصورت خط لکھا ہے کہ میں اُسے کئی بار پڑھ چکی ہوں۔ کون کہتا ہے تمہیں خط لکھنا نہیں آتا؟ اگر یہ تم کہتے ہو تو جھوٹ کہتے ہو۔ سچ تمہارا خط پڑھ کر میں کسی اور ہی دنیا میں نکل گئی تھی۔ میں رات کے پچھلے پہر پلنگ پر نیم دراز ہو کر تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ میرے کمرے میں کوئی نہیں۔ کھڑکی سے تازہ ہوا اندر آ رہی ہے۔ باغ میں رات کے آخری سائے مدھم ہو رہے ہیں۔ شاید آسمان پہ بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہوا میں نمی سی ہے۔ بڑی پُراسرار سی خاموش رات ہے۔ اگر یہی رات مجھے کسی پہاڑ پر ملتی تو اس کے خاموش حسن میں اضافہ ہو جاتا۔ پہاڑوں پر سوئی ہوئی رات کتنی سحر انگیز ہوتی ہے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گی۔ اگر زندگی واقعی اتنی ناقابلِ اعتماد

ہے اور اسے چھوٹے سے چھوٹا حادثہ ختم کر سکتا ہے تو پھر کیوں نہ اسے کہساروں اور وادیوں کے درمیان گھوم پھر کر گذار اجائے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے ابھی جنگلی پھولوں سے ڈھکی ہوئی چراگاہوں میں ریوڑ چرانے ہیں۔ ان دیکھے خوابگوں جزیروں میں آنکھ مچولی کھیلنی ہے۔ کہستانی چاندنی کی آبشاروں میں غسل کرنا ہے اور درختوں کے جھنڈوں میں بہنے والے جھرنوں کے گیت سننے ہیں۔ یہ شہر بڑے گندے ہیں منصور۔ یہاں ہر چیز میں ملاوٹ اور کھوٹ ہوتی ہے۔

اگر تم نے مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے اپنی زخمی محبت کا حال سنایا ہے تو تمہارا یہ مان کبھی شرمندہ نہ ہوگا۔ لیکن خدا کے لئے اپنا یہ فقرہ واپس لے لو کہ عورت بہت جلد بدل جاتی ہے۔ عورت اگر وہ عورت ہے تو کبھی نہیں بدلتی اور کبھی نہیں بھولتی۔ تم کنیز پر بے وفائی کا الزام نہ لگاؤ۔ لڑکیاں بہت مجبور ہوتی ہیں۔ وہ بے چاری بھی مجبور ہو گئی ہوگی۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اگر دو محبت کرنے والے دل ایک ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی مجبوری انہیں الگ نہیں کر سکتی۔ محبت قانون اور ضابطے نہیں دیکھا کرتی۔ وہ دل کی قوتِ فیصلہ کا نام ہے اس کشتی میں سوار ہونے والے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کو ٹھکرا دیا کرتے ہیں۔ محبت کی بازی وسوسوں اور وہموں سے نہیں جیتی جاتی۔ بلکہ عزم و قوت سے جیتی جاتی ہے۔ پھر بھی میں تمہیں یہی کہوں گی کہ لڑکیاں بے بس کر دی جاتی ہیں۔ شریف لڑکی بدنامی سے بہت گھبراتی ہے۔ اس کی محبت خوف سے شروع ہو کر ایثار پر ختم ہو جاتی

ہے۔ اور جب اسے اپنے چاہنے والے سے زبردستی علیحدہ کر کے کسی دوسرے شخص کے حوالے کر دیا جاتا ہے تو وہ اپنی اس حالت کا نقشہ کسی کے سامنے نہیں کھینچ سکتی۔ مرد، عورت کے اس گہرے دکھ سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔ اس کی ایک جانب تو وہ مرد ہوتا ہے جس کی محبت اسے آسمان کی طرف سے عطا کی گئی ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ مرد ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ ارضی قانون کے تحت پیوستہ ہوتی ہے۔ حلقۂ زوجیت میں آنے کے بعد جب اسے اپنا جسم کسی دوسرے کے آگے پیش کرنا پڑتا ہے تو اس کی روح کانپ اٹھتی ہے اور اس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ ناقابلِ بیان اذیّت میں مبتلا ہوتا ہے۔

منصور! کنیز کو بُرا نہ کہو۔ ہم اسے یاد رکھیں گے۔ اچھے دوست کی طرح یاد رکھیں گے۔

کل رات میں تمہارا خط پڑھنے کے بعد ابھی اچھی طرح سونے نہ پائی تھی کہ آسمان ایک دم بادلوں میں چھپ گیا۔ بھیگی بھیگی خنک ہوا چلنے لگی اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ ہائے یہ کیسا موسم ہے۔ سوتے میں بارش آجائے تو مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔ میں نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں لیے اٹھی اور برامدے میں سے ہوتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ پلنگ پر پھوپھی صاحبہ لیٹی ہوئی ہیں۔ بارش سے بھاگ کر وہ صرف چند لمحوں کے لئے میرے کمرہ میں آئی تھیں اور اس انتظار میں تھیں کہ دوسرے کمرے میں پلنگ بچھ جائیں۔ جب مجھے نیند آرہی ہو تو کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ چونکہ صبح پانچ بجے اٹھنا ہوتا ہے اس لئے رات کو گہری نیند سوتی

ہوں میں نے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بڑے صبر سے ان کے اٹھنے کا انتظار کیا مگر وہ نہ اٹھیں۔ بلکہ تھوڑی دیر بعد لمبے لمبے بے ہنگم خراٹے لینے لگیں جب دوسرے کمرے میں پلنگ بچھ گئے تو میں نے کہا

"پھوپھی جان بستر تیار ہو گئے ہیں"

پہلے تو ٹس سے مس نہ ہوئی اور جب میں نے ذرا ہلایا تو صرف ایک آنکھ کھول کر بولیں۔

"اے ہے کیا ہے بچّی! تم بھی یہیں پڑ جاؤ۔ دیکھو تو کتنی جگہ ہے"

اور اتنا فرما کر پھر سو گئیں۔ مجھے سخت غصّہ آیا۔ جی چاہا کہ انہیں اٹھا کر کھڑکی سے باہر باغ میں پھینک دوں۔ میں نے امی سے کہا کہ پھوپھی جان کو میرے پلنگ سے اٹھا دیں۔ امی کہنے لگیں۔

"میں نے اٹھا دیا تو ابھی گھر چلنے پر تیار ہو جائے گی اور پھر گھر گھر تیری برائیاں کرتی پھرے گی کہ آجکل کی پڑھی لکھی لڑکیاں تو بزرگوں کے پاس بیٹھنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ یا ثریا کے پاس سو رہو"

لیکن مجھے ثریا کے ساتھ کبھی نیند نہیں آئی۔ ایک تو یہ کہ وہ سونے سے پہلے مجھ سے جنگ ضرور کرے گی۔ اور دوسرے سونے کے بعد اپنے دونوں گھٹنے میرے پیٹ

میں گڑبڑ کر دے گی۔ علاوہ ازیں میں اپنا کمرہ بالکل نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ کیونکہ جہاں میرا پلنگ ہے اس کے سرہانے کی جانب لمبی سی دریچی ہے جس کے ساتھ انگور کی بیل چمٹی ہوئی ہے۔ میں اکثر اوقات اسی کھڑکی پر سر رکھ کر سوتی ہوں۔ ہوا کے جھونکے مجھے لوریاں دیتے ہیں اور انگور کے پتے سرگوشیاں کرتے ہیں اور اب یہ اتنی بڑی بوری میرے پلنگ پر لیٹی تھی۔ اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔ غرض ساری رات کھڑکی میں بیٹھی باہر باغ میں بارش کے گیت سنتی رہی۔ ہلکے ہلکے اندھیرے میں ہلکی ہلکی بارش کی آواز — یہ لمحے بڑے پُراسرار، بڑے اجنبی اور البیلے ہوتے ہیں۔ جانی پہچانی چیزیں انوکھا روپ دھار لیتی ہیں۔ صبح پانچ بجے جب وہ نماز کے لئے اٹھیں تو مجھے کھڑکی میں بیٹھا دیکھ کر بولیں۔

"نماز نہیں پڑھو گی بیٹی؟"

میں نے جل بھن کر کہا۔

"ساری رات پڑھتی رہی ہوں۔ اب آپ کی باری ہے۔"

وہ چلی گئیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بستر پر سب سے پہلے جراثیم کش دوائی چھڑکی اور پھر گرم چادر میں منہ سر لپیٹ کر سو گئی۔

تم تمباکو زیادہ نہ پیا کرو منصور۔ میں نے سنا ہے یہ بہت نقصان دیتا ہے۔ کیا تم ان مور پیتے ہو؟ مجھے بتاؤ یہ کہاں سے ملتا ہے۔ میں تمہیں اس کے دو تین ڈبے بھیجنا چاہتی ہوں۔ مجھے جو گھر سے پیسے ملتے ہیں میں ان کے چاکلیٹ کھا جاتی ہوں۔ مجھے عورتوں نے

کا سگریٹ پینا بہت زہر لگتا ہے۔ جو عورت سگریٹ پیتی ہے وہ عورت نہیں کچھ اور
ہوتی ہے۔ ویسے مجھے سگریٹ کا دھواں اور اس کی خوشبو بڑی اچھی لگتی ہے۔ جب
کبھی آسمان پر بادلوں کے سرمئی آنچل لہراتے ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھڑکی
کے پردوں سے کھیلتی اندر داخل ہوتی ہیں، تو میں بھائی جان کی میز پر سے سگریٹ
چرا کر لے آتی ہوں اور اسے سلگا کر راکھدان سمیت کھڑکی میں رکھ دیتی ہوں۔ ہوا
کے ساتھ جب پتلے دھوئیں کی لکیر پیچ و تاب کھاتی ہے تو بڑا مزہ آتا ہے اور میں
جاگتے میں خواب دیکھنے لگتی ہوں۔

ابھی بادل ذرا چھٹے ہیں اور پھیکی سی چاندنی باغ میں بچھ گئی ہے۔ میں یہ چاندنی بھی
اس خط کے ساتھ ہی بھیج رہی ہوں۔ تم مجھے اس کا بڑا طویل جواب دینا۔ ہم دونوں
اپنے اپنے جزیروں میں رہتے ہیں اور ان کے درمیان ہمارے خط مشک و عنبر سے
لدی ہوئی کشتیاں ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے اگر کسی روز کوئی کشتی ڈوب گئی تو؟

میں چاہتی ہوں کہ ہماری دوستی جو ستاروں سے زیادہ روشن اور بلند ہے زندگی
کے آخری لمحوں تک نبھے۔ میں تمہیں ایک بار پا کر کبھی کھونا نہیں چاہتی۔ کبھی کبھی مجھے
بڑا خوف محسوس ہوتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہیں ہماری دوستی اور محبت کو نظر
لگ جائے۔ ہم دونوں جذباتی ہیں منصور —— ہمیں آج سے عہد کرنا چاہیے کہ ہم
اعتدال کی حد سے کبھی آگے نہیں گذریں گے اور جب ایک جذبات کی رو میں بہنے
لگے گا تو دوسرا حقیقت پسند بن جایا کرے گا۔ دوستی اور محبت کے علاوہ ہمیں

میں اور کام بھی کرنے ہیں۔ میں اسی لئے تمہیں بار بار فون نہیں کرتی۔ پھر میں اداس اداس سی پھرتی ہوں اور کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ منصور! مجھے کوئی ایسا طریقہ بتادو جس پر عمل کرکے ہم زندگی بھر ساتھ ساتھ رہیں۔ ہماری دوستی کے پھول کبھی نہ مرجھائیں۔ پیار کا یہ چراغ جسے دو پریم پجاریوں نے اپنے دل کے مندر میں روشن کیا ہے کبھی نہیں بجھنا چاہیئے۔ اگر تم دل سے میرے ساتھ ہو منصور تو لالہ زندگی کے ہر مقام پر تمہارا ساتھ دے گی۔ خدا وہ دن کبھی نہ لائے جب ہماری محبت کا چہرہ زرد ہو جائے۔ جب ہماری دوستی تھک جائے اور ہم ایک دوسرے کو پہلے ایسی شدت سے یاد نہ رکھ سکیں۔ ہماری دوستی اور پیار سدا بہار پھول کی مانند ہونا چاہیئے۔ نہ تو ہم ساون کے بادل ہیں کہ برسیں اور گذر جائیں اور نہ ہم موسمی ہوائیں ہیں کہ ادھر سے آئیں اور ادھر سے گذر گئیں۔ ہم زندگی کے افق پر ہمیشہ چمکنے والے درخشندہ ستارے ہیں جن سے نیکی اور شرافت کی چمک قائم ہے۔

تمہیں خط لکھتے ہوئے اب مجھے کوئی خوف یا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ میں جانتی ہوں جو شخص میری محبت کو چھپا سکتا ہے وہ میرے خطوں کی بھی حفاظت کریگا۔ منصور! رازوں کی تجارت کرنے والے انسان بڑے ذلیل ہوتے ہیں!

ہماری محبت کی گاڑی چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہیں اسے اچانک کوئی دھکا نہ لگ جائے۔ ہم مہینوں کی مسافت دنوں میں اور سالوں کا سفر مہینوں میں طے کررہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات

میرے دل میں ڈراؤنے خیالات بیدار ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور میں یونہی چونک
اٹھتی ہوں۔ لیکن نہیں۔ میں پاگل ہوں جو ایسا سوچتی ہوں۔ مجھے اپنے خدا پر پورا
بھروسہ ہے۔ وہ میرے دل کا حال جانتا ہے۔ وہ میری نیت کو جانتا ہے۔ میں اس
کے آگے دعا کروں گی کہ وہ اپنی رحمتوں کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

منصور! اگر ہمارا خدا پر یقین ہوا اور ہم نے ایک دوسرے کی عزت کا خیال رکھا
تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ مجھے اپنے خدا پر مکمل بھروسہ ہے۔
میں یہ جو صبح صبح اس کی عبادت کرتی ہوں اس لئے نہیں کہ وہ میرے کام آئے۔ بلکہ
اس لئے کہ وہ عبادت کے لائق ہے۔ میرا تو اگر نقصان بھی ہو جائے تو میں اس سے کبھی
خفا نہیں ہوتی۔ پہلے پہل میں پانچوں وقت نماز پڑھا کرتی تھی لیکن اب صرف فجر اور
عشا کی پڑھتی ہوں۔ میں نے یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتائی تھی۔ لڑکیاں عام طور پر نماز
پڑھنے والی لڑکی کو اس طرح دیکھتی ہیں جیسے وہ کوئی گنوار ہو۔

کل جب دوپہر کو مینہ برسا تو میں باہر باغ میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ پہلے تو جی چاہا کہ
بیٹھی رہوں۔ پھر یاد آگیا کہ تم نے بارش میں نہانے سے منع کیا ہوا ہے۔ فوراً اپنے کمرے
کی طرف بھاگ آئی۔ دیکھا، میں نے تمہارا کہا مان لیا ہے ناں! مجھے کوئی پیار سے سمجھائے
تو میں بڑی جلدی کہنا مان لیتی ہوں لیکن اگر کوئی مجھے حکم دے اور رعب ڈالے تو قطعی
تک نہیں مانتی۔ پھر میں بڑی ضدی بن جاتی ہوں۔ اپنے کمرے میں جا کر میں نے تمہارا
خط ایک مرتبہ پھر پڑھا۔ خط پڑھ کر میں برآمدے میں آئی تمہیں فون کیا۔ تم ابھی دفتر

نہیں آئے تھے۔ دیر تک کلیم بھائی سے باتیں کرتی رہی۔ ٹی ہاؤس میں اتنا شور کیوں رہتا ہے؟ کلیم بھائی کو بار بار بل لکھنے کے لئے اور کبھی گاہک سے بات کرنے کے لئے رکنا پڑتا ہے۔ اتنی دیر میں ریڈیو سے اٹھتی ہوئی موسیقی کی ہلکی ہلکی آواز سنتی رہتی ہوں۔ فون کرکے اپنے کمرے میں آئی تو ثریا اور رضیہ بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں۔ میں بھی کھیل میں شامل ہو گئی۔ ثریا مسکرا کر پوچھنے لگی۔

"فون کرکے آئی ہو؟"

میں نے اسے ڈانٹا تو وہ اور زیادہ ہنسنے لگی۔ رضیہ بھی ہنس پڑی۔ پھر ہم آپ کی اور کلیم بھائی کی باتیں کرنے لگیں۔ میری دونوں بہنیں بھی آپ کو بہت اچھا سمجھتی ہیں اور آپ کی باتوں کی بہت تعریف کیا کرتی ہیں۔ بہت جلد وہ بھی میرے ساتھ آپ سے ملیں گی۔ باہر بارش بڑے زور سے ہو رہی تھی۔ ہم نے کیرم بورڈ چھوڑ دیا تھا اور قالین پر بیٹھی آپ کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ بارش کا مزہ سردیوں کی رات کو آتا ہے۔ سردیوں کی لمبی کالی راتوں میں — جب ہم ریشمی گرم لحاف کے اندر دبکے ہوں یا پھر گرم سویٹر پہنے آتشدان کے پاس بیٹھے ہوں۔ باہر موسلا دھار مینہ پڑ رہا ہو، کمرے میں ٹیبل لیمپ کی ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی ہو۔ بالکل ایسی جیسی پریوں کی خوابگاہوں میں ہوتی ہے، جیسی بلیک اور مور کے شعروں میں ہوتی ہے۔ کھڑکی کے چھجے پر بارش کے قطرے جلترنگ سی بجا رہے ہوں اور انگور کی بیل ٹھنڈے پانی میں غسل کر رہی ہو — منصور! ہم سردیوں کی کسی بارانی رات کو ضرور ملیں گے۔

مجھے پھر تمہارے خط کا خیال آگیا ہے۔ تمہارا خط تمہارے دل کی دھڑکنوں
کی ترجمانی کرتا تھا۔ تم پاگل ہو منصور! جو تمہیں اپنی غریبی کا احساس ہوتا ہے۔ کون
کہتا ہے تم غریب ہو؟ اور پھر میں دولت کی پجارن نہیں ہوں منصور! تم میرے
خوبصورت گھر اور انگور کی بیل والی کھڑکی کی تعریف کر کے میری توہین نہ کرو۔ خدا کے
لئے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم اس قدر مالا مال ہو کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ دولت
صرف چاندی سونے کے ڈھیر کا نام ہی نہیں ہے۔ تمہارا نیک دل، تمہارے بلند
ارادے اور تمہارا زندگی کے متعلق اتنا حسین پروگرام اور سب سے بڑھ کر تمہارا
خوبصورت ذہن —— کیا اس دولت کا مقابلہ چاندی کے سکوں سے ہو سکتا ہے؟
میں دولت کی اہمیت سے انکار نہیں کرتی۔ مگر دولت کو ہی شخصیت کی معراج کا زینہ
سمجھ لینا بالکل غلط ہے۔ دولت مند دل درد سے خالی ہوتے ہیں۔ منصور شاید اگر تم
کسی امیر تاجر کے گھر پیدا ہوتے تو تمہارے پاس دردمند دل کی بجائے احمق ذہن ہوتا
اور تمہارا وجود اس دھرتی کا بوجھ بننے کے سوا اور کسی کام نہ آسکتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا
خدارا انہیں سمجھنے کی کوشش کرنا۔ میں تمہیں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن عین وقت
پر کچھ کہنے اور کچھ نہ کہنے کا پھندا گلے میں پھنس جاتا ہے۔ تمہارے پاس جو دولت ہے
دنیا کی کوئی دولت نہیں خرید سکتی۔ اسے میں سمجھتی ہوں۔ ایک عورت ہی سمجھتی ہے۔ تم نہیں
سمجھ سکتے۔ اور پھر منصور! میں نے تم سے، تمہارے دل اور تمہارے ذہن سے دوستی
اور محبت کا رشتہ استوار کیا ہے۔ مجھے اس سے کیا غرض کہ تمہارا بینک بیلنس کتنا۔

تم نے اپنی زخمی محبت کی داستان بیان کر کے مجھے اگر اپنے اعتماد میں لیا ہے تو میں بھی تمہیں اپنی زندگی کی ہلکی سی جھلک دکھانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ اس سے تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے امیدوں کے چراغ کو کیسی کیسی بھیانک آندھیوں کی لپیٹ سے بچایا ہے۔ میں ۱۹۲۹ء کی ایک خوشگوار صبح کو اسی شہر میں پیدا ہوئی۔ ہم لوگ شہر کے اندر اپنے آبائی مکان میں رہتے تھے۔ گھر چونکہ بہت بڑا تھا۔ اس لئے میری ماسی بھی ہمارے گھر میں رہتی تھی۔ جب میں ۲ سال کی ہوئی تو میری منگنی ماسی کے لڑکے سے ہو گئی۔ میری ماسی کے پاس کافی روپیہ تھا۔ یہ لڑکا مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ جب میں ساتویں جماعت میں داخل ہوئی تو میری شادی کی بات چیت شروع ہو گئی۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے دن رات رونا شروع کر دیا۔ میں اتنی جلدی شادی کی مصیبت مول لینا نہ چاہتی تھی۔ میں کالج میں تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں اپنی جماعت میں سب سے زیادہ ہوشیار لڑکی تھی۔ میں نے آٹھویں میں وظیفہ حاصل کر لیا۔ میرا منگیتر مجھے یونہی زہر لگتا تھا۔ اگر وہ مجھے ننگے سر پھرتے دیکھ کر دوپٹہ سر پر کرنے کو کہتا تو میں کاندھوں پر ڈھلکا ہوا دوپٹہ اتار کر رکھ دیتی۔ جس بات سے وہ منع کرتا میں وہی بات کرتی۔ اسے بڑا غصہ آتا اور وہ کہتا:

"کوئی بات نہیں آنا تو تمہیں میرے ہی پاس ہے پھر تمہاری خبر لوں گا۔"

میں اسے منہ چڑا کر کہتی:

'میری جوتی آئے گی تمہارے پاس'

دراصل میں بڑی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ میں ایک لڑکی تھی۔ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن کچھ نہ کر سکتی تھی۔ بچپن کی منگنی بھی بھلا ٹوٹ سکتی ہے! ہمارے ماحول میں رہنے والی لڑکیاں زیور اور کپڑوں پر جان دیتی ہیں۔ جب دیکھو انہی چیزوں کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میری سہیلیاں مجھے کہتیں کہ میں بڑی خوش قسمت ہوں کیونکہ مجھے جہیز میں بیس تولے سونا ملے گا اور پچاس بیش قیمت جوڑے ملیں گے۔ وہ مجھے رشک بھری نگاہوں سے دیکھا کرتیں اور مجھے رونا آیا کرتا۔ مجھے بچپن ہی سے بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ میں زیور اور کپڑوں کے عوض اپنے انمول خواب فروخت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اپنی سہیلیوں کو حیرت سے دیکھا کرتی اور سوچا کرتی کہ میں ان سے مختلف کیوں ہوں؟ میں ان کی طرح ایک عام لڑکی کیوں نہیں ہوں؟ شاید میں بری لڑکی ہوں۔ پھر میں چپکے چپکے رویا کرتی —— آخر میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ میرے اس فیصلہ نے سارے خاندان کو چونکا دیا اور ہر گردن کو میری طرف موڑ دیا۔ میں اپنے فیصلے پر ڈٹ گئی۔ لڑکی تھی گھر سے باہر قدم نہ رکھ سکتی تھی۔ میں نے زہر کھا لینے کی دھمکی دی اور ہر طرح کا وار سہنے پر تل گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری شادی رک گئی۔ لیکن یہ بات ساری برادری میں مشہور ہو گئی کہ میرے کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں اور یہ بات میری خالہ اور اس کے لڑکے نے اڑائی تھی۔ ماسی ہم سے الگ ہو گئی اور اس کے لئے جو کچھ باتیں مجھے سننا

پڑیں وہ میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ایک بار پھر میری شادی کا سوال اٹھایا گیا۔

اب کے جہاں میری شادی کی بات چیت شروع ہوئی وہ کسی ریلوے افسر کا لڑکا تھا۔ میں پھر پریشان ہوگئی۔ اب اگر انکار کیا تو سخت شامت آئے گی۔ کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ مجھے اپنے ماں باپ پر سخت غصہ آتا جو مجھے سمجھنے کی کوشش تو کجا اس کا خیال بھی نہیں کر رہے تھے۔ ناچار میں نے ایک بار پھر مقابلے کی ٹھانی اور ابا جان کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں بی۔ اے بی ٹی کرنے سے پہلے شادی نہیں کروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے —— منصور پھر جو کچھ ہوا بڑی لمبی کہانی ہے۔ تمہیں کبھی زبانی سناؤں گی۔ بہرحال میرے انکار سے ہر بار یہی مطلب اخذ کیا جاتا کہ مجھے کسی سے لگاؤ ہے۔ حالانکہ میں ایسی باتوں سے بالکل دور تھی۔ میرے اچھے دوست! تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے کتنی مصیبتیں سہہ کر اپنے سنہرے خوابوں کے آبگینے کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچایا ہے۔ میں نے دو دفعہ خودکشی کی بھی کوشش کی لیکن یہ سوچ کر کہ اگر میں مرگئی تو میری ساری جدوجہد بیکار ثابت ہوگی اور زمانہ میرے نام پر شکست کی مہر لگا دے گا میں زندہ رہنے پر مجبور ہوگئی۔ تم نہیں جانتے منصور —— میرے سینے میں ہمالیہ کی چوٹیوں کا فراز ہے اور میرا دل ہمت و استقلال کی کان ہے۔ میں نے دنیاوی رسوم و قیود کی کبھی پروا نہیں کی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی زندگی کے بڑے کٹھن سال طویل جدوجہد میں گزارنے کے بعد اب میں کچھ تھکن سی محسوس کر رہی ہوں اور کسی ایسے دوست کا سہارا چاہتی ہوں

جو میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔ جس کے ہمراہ میں سارا یورپ گھوموں، اچھے اچھے لوگ
اور اچھے اچھے شہر دیکھوں۔ یونان کے کھنڈرات میں پہنچ کر ارستوفینز اور ہومر کو
یاد کروں، اطالیہ میں دنیا کے بہترین مجسموں کا مشاہدہ کروں اور ہسپانیہ میں ان لوگوں
کے نشان دیکھوں جنہوں نے وہاں نو سو سال تک حکومت کی، جو تلوار لے کر آئے اور
شراب کے خالی مٹکے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پھر میں اپنے دوست کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے
گنجان درختوں کے درمیان نازک اور سایہ دار پگڈنڈیوں کو عبور کروں۔ ہمارے اوپر
چناروں کی سرخ شگوفوں والی ٹہنیاں ہوں اور وادیاں ہمارے قدموں کی مشترکہ
چاپ سننے کو بے تاب ہوں۔ میں بہت جلد اپنے اس دوست کو پالوں گی اور کیا عجب
ہے کہ پا لیا ہو۔

اچھے منصور! اب میں تمہیں سردیوں میں ملوں گی۔ کسی بڑے ہی سہانے دن۔ کسی
بڑی ہی خوبصورت جگہ پر۔ شاید مری میں —— جہاں برف گر رہی ہو گی۔ میں چاہتی
ہوں کہ اگر تم نے میرے اوپر اپنی محبت کا سایہ کیا ہے تو مجھے اپنے دل کی گہرائیوں
میں چھپا لو تاکہ کوئی تمہیں میرے ساتھ نہ دیکھ لے اور مبادا تم بدنام ہو جاؤ، اور لوگ
تمہارے متعلق بھی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ مجھے تمہارے ناموس کا بھی خیال ہے۔
یہ لوگ بڑے بُرے ہوتے ہیں۔ ابھی ہم اچھے وقت اور اچھے ماحول کا انتظار کریں گے۔
تم بھی میرے خطوں کی اور میری محبت کی حفاظت کرنا۔ میں تمہارے خطوں کو ایسی
جگہ رکھتی ہوں جہاں ان پر کسی دوسرے کی نگاہ پڑنا غیر ممکن بات ہے۔ مجھے بتاؤ تم

میرے خطوں کو کہاں رکھتے ہو۔ اگر ہماری محبت کے سپید لباس پہ بدنامی کے چھینٹے پڑ گئے تو لوگ ہمارا تماشہ دیکھیں گے اور ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ تم بھی اپنی صحت کی حفاظت کرنا اور میں بھی اتنی مضبوط بن جاؤں گی کہ بڑے سے بڑا صدمہ بھی میرے ذہن کو منتشر نہ کر سکے گا۔ منصور! تم مجھے دھوکا نہ دے جانا۔ پھر مجھے اتنا رنج ہوگا کہ میں اپنے بھی سامنے نہ ہو سکوں گی۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ ایک لڑکی کی دوستی اور محبت آدمی کی سب سے بڑی فتح ہوتی ہے اور تم فتح مند ہو منصور ـــــ!

ہماری محبت آجکل کے عام لڑکے لڑکیوں کی محبت کی مانند وقت گذاری اور لذت پرستی کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ ہماری محبت کا مقصد عظمتوں اور سربلندیوں کے میناروں کو چھونا ہے۔ ہم پر شور ہوٹلوں اور گندے گلی کوچوں میں کبھی نہیں ملیں گے ہماری دوستی ان گھٹیا چیزوں سے بلند ہو گی۔ ہم ان ہنگاموں سے دور، ساحل سمندر پر، نیلے آسمان تلے بیٹھ کر اپنے دل کی باتیں کریں گے تم وقت کا انتظار کرو۔

دیکھو میں ایک ہی نشست میں تمہیں کس قدر طویل خط لکھ رہی ہوں۔ اب دن بھی چڑھ آیا ہے۔ ابھی میں نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ بادل پھر چھا رہے ہیں شاید بارش ہو۔ رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو تمہیں کل بتاؤں گی۔ آؤ آج ہم ان باتوں کا عہد کر لیں۔

۱۔ ہمیں خدا پر مکمل بھروسہ کرنا ہوگا۔

۲ - ہم ایک دوسرے کی عزتِ نفس اور وقار کا خیال رکھیں گے ۔

۳ - ہم مہینے میں صرف ایک بار ملیں گے اور ایک بار فون کریں گے ۔

۴ - اب ہم سردیوں میں ملیں گے اور شہر سے دور کسی نہر کے کنارے ۔

۵ - ہم اوپر کی باتوں پر سختی سے عمل کریں گے ۔

کلیم بھائی کو میرا سلام کہنا ۔ اب میرا ہاتھ درد کرنے لگا ہے ۔

تمہاری

لالہ رُخ

منصور کو لالہ سے آخری بار ملے ایک ماہ گزر چکا تھا۔

اگرچہ انہوں نے مہینے میں صرف ایک بار فون کرنے کا عہد کیا تھا لیکن ٹھیک چار بجے سہ پہر بلاناغہ گھنٹی ہوتی اور مجھے لالہ کی آواز "ہیلو" کہتی سنائی دیتی۔ یہی وقت منصور کے دفتر سے ٹی ہاؤس آنے کا ہوتا تھا۔ وہ سب سے پہلے مجھ سے منصور کے متعلق پوچھتی۔

"وہ کہاں ہیں؟ ٹی ہاؤس آ گئے کیا؟"

اگر منصور وہاں نہ ہوتا تو وہ مجھ سے اس کے بارے میں اتنی باتیں پوچھتی کہ میں عاجز آجاتا۔ وہ کل کس وقت آئے تھے؟ انہوں نے کس رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ ان کے بالوں میں تیل لگا تھا یا نہیں؟ کتنی دیر بیٹھے رہے؟ کتنے پیالے چائے پی؟

میرے متعلق کیا کیا باتیں ہوئیں؟ مجھے کتنا یاد کیا؟ اور کب واپس گئے وغیرہ وغیرہ
—— اور اگر عین اسی وقت منصور آجاتا تو وہ گھبرا سی جاتی اور اس کی آواز اکھڑ اکھڑ جاتی۔

'آ گئے ہیں؟ —— اچھا؟ —— انہیں مت بتائیے۔ ورنہ وہ کہیں گے لالہ کتنی بے صبر ہو رہی ہے —— بیٹھ گئے ہیں؟ چہرہ کیسا ہے؟ اداس تو نہیں؟ اداس ہے؟ —— کیوں نہ ہو؟ اتنے دنوں سے ہم ملے نہیں میں بھی اداس ہوں ——
میں یہ ٹھیک کر رہی ہوں ناں کلیم صاحب؟ میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہے۔ ہمیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیئے۔'

منصور میرے چہرے کے تاثرات سے فوراً بھانپ جاتا کہ میں کس سے ہمکلام ہوں مگر وہ بڑے اطمینان سے اپنے دوستوں کے درمیان اور یا کاؤنٹر کے پاس والی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ سیاہ پائپ نکال کر اس میں دبا دبا کر تمبا کو بھرتا اور سلگا کر مزے سے پینے لگتا۔ جب لالہ ٹیلی فون بند کر دیتی تو وہ مجھ سے بالکل نہ پوچھتا کہ میں کس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس وقت محبت بھرے خطوں میں ظاہر ہونے والا منصور غائب ہو جاتا اور اس کی جگہ پختہ چہرہ بنا کر خاموشی اور متانت سے پائپ پینے والا منصور لے لیتا۔ اس دوران میں ان کی خط و کتابت باقاعدہ جاری تھی۔ لالہ کا چھوٹا بھائی ہر دوسرے دن طویل محبت نامہ لے کر ٹی ہاؤس میں داخل

ہوتا اور پہلے خط کا جواب لے کر واپس چلا جاتا۔ کچھ رات گذرنے پر جب
ٹی ہاؤس میں اکا دکا گاہک دکھائی دینے لگتے تو میں اور منصور چائے منگوا کر
کاؤنٹر کے پاس والی میز کے گرد بیٹھ جاتے۔ میں سگریٹ سلگا لیتا اور منصور لالہ
کا تازہ خط نکال لیتا۔ وہ مجھے سارا خط شروع سے آخر تک پڑھ کر سناتا۔ کبھی
کبھی ایسا ہوتا کہ وہ پڑھتے پڑھتے کچھ فقرے ہضم کر جاتا اور میں اسے بالکل نہ
ٹوکتا۔ اس کے بعد وہ مجھے ٹی ہاؤس کے کیبن میں بیٹھ کر لکھا ہوا اپنا خط سناتا اور
مجھے محسوس ہوتا کہ میں منصور، نزہت، لالہ اور اس کی چھوٹی بہنیں رضیہ اور ثریا ایک
ہی خاندان کے افراد ہیں اور میں نے ٹی ہاؤس کا دھندا صرف اس لئے اختیار
کیا ہے کہ چائے کی میز پر بیٹھ کر ہم ایک دوسرے کو یاد کر سکیں۔ میں نے نزہت،
لالہ اور اس کی بہنوں میں سے کسی کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا مگر مجھے یوں لگتا گویا
ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں اور کئی بار مل چکے ہیں۔ منصور لالہ سے
جتنی بار بھی ملا تھا ٹی ہاؤس سے باہر لارنس یا عجائب گھر میں ملا تھا۔ ایک دو بار
اس نے مجھے ساتھ چلنے پر مجبور بھی کیا اور لالہ نے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ٹی
ہاؤس میں اس لئے نہ آتی تھی کہ منصور نے اسے منع کر رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ
اس کے دوستوں میں سے کسی کو اس کی محبت کا حال معلوم ہو۔ وہ اپنی محبت کی
بھنک کو صرف اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے لالہ سے فون پر ملاقات
بھی بند اس لئے کم کر دی تھی کہ اس کے دوست عجیب عجیب سوالات پوچھنے

لگے تھے۔ شام کو وہ اپنے دوستوں میں ضرور بیٹھتا مگر زیادہ وقت میری میز پر ہی گذارتا تھا۔ میں منصور کی اس محبت آج تک نہیں سمجھ سکا جس نے اسے تمام دوستوں سے بیگانہ کر دیا تھا اور اس کے دل میں تنہائی و یکسوئی کے مدھم چراغ روشن کر دیئے تھے۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ منصور کو محض ایک لڑکی کے لئے اپنے قریبی دوستوں سے یوں الگ تھلگ نہیں ہو جانا چاہیئے تھا۔ مرد کی دوستی عورت کی محبت سے کچھ کم حیثیت نہیں رکھتی۔ لالہ کے ساتھ ساتھ اسے اپنے دوستوں کے جذبات کا بھی احترام کرنا چاہیئے۔ پھر یہ سوچ کر کہ شائد منصور اپنے خیال میں راہ گئی پر ہو میں خاموش ہو رہتا۔

اسی مہینے کی آخری تاریخوں کا ذکر ہے کہ میں کاؤنٹر پر بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا اور ٹی ہاؤس میں کوئی بھی میز گاہکوں سے خالی نہ تھی۔ کافی رونق اور رہما ہمی تھی۔ میں بل پر بل کاٹ رہا تھا۔ ایک گاہک اٹھتا تھا تو دوسرا اس کی جگہ آن لیتا تھا۔ اتنے میں ایک بار ٹی ہاؤس کا دروازہ کھلا، پردہ ایک طرف ہٹا اور دو برقعہ پوش لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ لحظہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ آگے بڑھیں اور گیلری کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئیں اوپر کیبن میں جا کر بیٹھ گئیں۔ ہمارے ہاں شاید ہی کوئی ایسا دن آیا ہو جب گیلری کے کیبنوں میں چوڑیوں کی جھنکار نہ گونجی ہو۔ چنانچہ میں نے کوئی خاص دھیان نہ دیا اور بدستور اپنے کام میں مصروف رہا۔ بمشکل پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ ایک بیرا میرے

بالکل قریب آکر بولا۔

'ذرا اوپر آپ کو بلایا ہے'

پہلے تو مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ میں نے کہا کہ انہوں نے کسی اور کو بلایا ہوگا۔ لیکن جب بیرے نے کہا کہ لڑکیوں نے میرا نام لیا تھا تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ کون ہو سکتی ہیں؟ کہیں لالہ نہ ہو؟ مگر وہ مجھے فون پر اطلاع دے سکتی تھی۔ میں نے کاؤنٹر پر اپنے ایک دوست کو بٹھایا اور خود اوپر گیلری میں آگیا۔

کیبن نمبر ۳ کا سرخ پردہ چنا ہوا تھا اور اندر سے ہلکی ہلکی باتوں کی نقرئی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے پردہ اٹھایا۔ میز کی پرلی جانب کرسیوں پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے نقاب اٹھا رکھے تھے لیکن ان کے چہرے مجھ سے پردہ کر رہے تھے۔ ایک لڑکی نے جلدی سے کہا۔

'بھائی جان آداب ——'

میں فوراً آواز پہچان گیا۔ وہ لالہ تھی۔ میں نے ذرا مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور کہا۔

'خیریت تو ہے۔ آپ نے ٹی ہاؤس کو یہ عزت کیسے بخشی؟'

لالہ کے ہاتھوں میں کچھ کتابیں تھیں۔ انہیں میز پر رکھتے ہوئے اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

'جی ہاں —— وہ —— میں ذرا نزہت کے ساتھ آگئی

تھی۔ انار کلی سے اسے کچھ خریدنا تھا اور میں قریب سے گذری تو
آپ سے ملنے کو جی بہت چاہا ——— آپ ناراض تو نہیں
ہوئے؟'

'وہ کیوں؟' میں نے بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا لیا۔
'مجھے تو بلکہ از حد خوشی ہوئی ہے'

میں نے گھنٹی بجائی اور بیرے کو چائے اور کچھ پیسٹری لانے کو کہا۔ لالہ کی آواز
بالکل ایسی تھی جیسی فون پر آیا کرتی تھی۔ اس کی آواز اس کے چہرے سے بہت ملتی
جلتی تھی۔ اگر اس کی آواز میں تڑپ اور معصومیت تھی تو یہ دونوں اس کے چہرے
پر بھی تھیں۔ اس نے نزہت سے میرا تعارف کرایا۔

'تو یہ ہیں آپ کی سہیلی نزہت صاحبہ ———'

نزہت نے چہرہ جھکا لیا اور وہ شرما سی گئی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس کا حجاب اور
شرم مصنوعی معلوم ہوئی جیسے سٹیج پر عورت کا پارٹ ادا کرنے والا کوئی مرد شرما
رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی اور ہم چائے پینے لگے۔ لالہ نے پوچھا
'وہ کب آئیں گے؟'

'ان کا ابھی وقت نہیں ہوا'

'اگر وہ آئیں تو انہیں ہمارا مت بتائیں'

نزہت نے لالہ کی بات کاٹ کر کہا:

'کیوں نہ بتائیں؟ اب اگر آگئی ہو تو ڈرتی کیوں ہو؟'

'نہیں نزہت یہ ڈر کی بات نہیں ہے'

'تو پھر کیا ہے؟'

'بات اصل میں یہ ہے کہ ـــــ کہ پھر وہ کیا کہیں گے! انہوں نے تو مجھے یہاں آنے سے منع کر رکھا ہے۔ کلیم صاحب آپ ان سے کوئی ذکر نہ کریں۔ سچ میں صرف آپ سے ملنے آگئی تھی اور ابھی چلی جاؤں گی'۔

میں لالہ کے ان جذبات پر دل میں ہنس پڑا۔ حقیقت میں وہ منصور سے ملنا چاہتی تھی اور بہت حد تک اسی سے ملنے آئی تھی۔ اور اب اس کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے کریم لیف کی پلیٹ نزہت کی طرف بڑھا دی:

'آپ بھی کھائیے نا'

'جی کھا رہی ہوں'

میں نے محسوس کیا کہ نزہت الفاظ کا بڑا بناؤ سنگار کر کے بول رہی ہے اور اس کی آواز میں خود پیدا کیا ہوا لوچ ہے۔ ویسے بھی اس نے ہونٹوں پر سرخی کی تہ بڑے اہتمام سے جمائی ہوئی تھی اور اس کا گریبان کافی کھلا تھا۔ ٹیلی فون پر سنی ہوئی آواز کی رعایت سے جو تصویر میرے ذہن میں آئی تھی لالہ اس پر پوری اترتی تھی لیکن

نزہت اس سے بالکل مختلف تھی۔ لالہ کے چہرے پر اس کی باتوں ایسا بھولپن اور سادگی تھی۔ نزہت کی آواز میں لوچ تھا مگر اس کا چہرہ کھردرا اور بڑا پختہ تھا۔ لالہ اگر دبلی پتلی تھی تو نزہت کا جسم بھاری تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی طرف دیکھ کر بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ لالہ کی سہیلی نہیں بلکہ کوئی رشتے دار عورت ہے جو اپنے بچوں کو گھر سلا کر اس کے ساتھ ٹی ہاؤس چلی آئی ہے۔ حقیقت میں وہ لڑکی کم اور عورت زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے دو ایک بار اپنی کھلی آستینیں نیچے تک ڈھلکا کر بالوں کو سنوارتے ہوئے کچھ اس انداز سے منصور کے متعلق پوچھا جیسے وہ صرف اسی کے لئے پھولدار قمیص اور ریشمی غرارہ پہن کر آئی ہو۔ میں نے لالہ کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح گرم گرم چائے جلدی جلدی پی رہی تھی اور اس کے نچلے ہونٹ کے بائیں کنارے پر پیسٹری کا مکھن لگا تھا۔

'چائے آہستہ پئیں۔ حلق جل جائے گا۔'

اس نے ہنستے ہوئے پہلے نزہت کو اور پھر مجھے دیکھا۔

'یہ تو ٹھنڈی ہوتی ہی نہیں۔ میں کیا کروں۔ مجھے جانا بھی تو ہے۔'

چائے پینے کے بعد پندرہ بیس منٹ تک لالہ اور نزہت میرے پاس بیٹھی رہیں۔ لالہ نے مجھ سے کتنی ہی باتیں کیں اور نزہت خاموش رہی۔ لالہ کی باتوں سے نزہت کی خاموشی زیادہ پر معنی تھی۔ لالہ جتنی دیر باتیں کرتی رہی اس کی سادگی اور معصومیت زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور نزہت جتنی دیر خاموش رہی اس کی پُر اسرار شخصیت میں

کسی خطرناک بات کا اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی گہری گہری آنکھیں اور قدرے اندر کو بھنچا ہوا نچلا ہونٹ دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں سارے لاہور کو بارود سے ایک دم اڑا دینے کا کوئی خاکہ چھپائے ہوئے ہے اور صرف وقت کا انتظار کر رہی ہے۔

ہم چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

لالہ نے برقعہ درست کرتے ہوئے پردہ ذرا سرکا کہ کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔

'تو وہاں سے آپ فون کیا کرتے ہیں ــــ منصور بھی باتیں کرتے ہوئے اسی جگہ کھڑا ہوتا ہے'

میں ہنس پڑا۔

'جی ہاں وہیں ہوتا ہے'

لالہ بھی ہنس پڑی اور اس نے شرما کر نقاب الٹ لیا۔ نزہت بدستور خاموش رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تانگے میں بیٹھ کر چلی گئیں اور میں کچھ کام میں مصروف ہو گیا۔

شام کو منصور آیا تو میں نے اسے لالہ اور نزہت سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا۔

پہلے وہ حیران ہوا کہ وہ دونوں اکیلی کیسے آ گئیں۔ پھر اسے غصہ آیا کہ لالہ نے اپنی آمد کی اسے اطلاع کیوں نہ دی اور آخر میں اسے افسوس ہوا کہ وہ اس وقت موجود نہیں تھا۔ نزہت کے متعلق میں نے اپنے تاثرات کو قصداً منصور سے چھپائے

رکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کی بہت عزت کرتا ہے اور اسے میری باتوں کا بالکل یقین نہ آئے گا۔ ویسے بھی وہ میرے اپنے تاثرات تھے اور منصور کو ان سے کوئی خاص نسبت نہ تھی۔

دوسرے روز فون پر پہلے تو ان دونوں کی آپس میں ہلکی سی جھڑپ ہوئی اور پھر صلح ہو گئی۔ لالہ نے اسے بتایا کہ اگلے دن وہ اپنی دونوں بہنوں کے ہمراہ انارکلی میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے آ رہی ہے۔ اور واپسی پر ٹی ہاؤس بھی آئے گی۔ منصور نے کہا کہ وہ اس کا انتظار کرے گا۔ چار بجے کے قریب لالہ اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ ٹی ہاؤس میں داخل ہوئی۔ منصور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ ہال میں سے گذرتی ہوئی اوپر گیلری کے کیبن میں جا کر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی وہاں پہنچ گیا اور ہم چاروں منصور کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے چائے منگوانا چاہی لیکن لالہ نے کہا:

"وہ بھی آجائیں تو مل کر پئیں گے۔"

لالہ کی دونوں چھوٹی بہنیں شکل و صورت میں اس سے مختلف تھیں۔ دونوں کا قد لمبا اور ناک پتلے اور ستواں تھے۔ چھوٹی بہن ثریا تو بہت شرمیلی تھی اور جتنی دیر بیٹھی رہی اس نے بہت ہی کم لفظ بولے۔ رضیہ اس سے بڑی تھی اور اس کا باتیں کرنے کا انداز دیہاتی لڑکیوں ایسا بے تکلف اور بے ساختہ تھا۔ ایک بار وہ ہنسی تو مجھے یوں لگا جیسے میز پر سے چینی کی نازک پلیٹ نیچے گر پڑی ہو۔ دس پندرہ منٹ کے انتظار

کے بعد جب منصور نہ آیا تو میں نے چائے منگوائی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ لالہ ایکدم اداس ہو گئی ہے اور وہ بے دلی سے ہماری گفتگو میں شریک ہے۔ مجھے منصور پر بڑا غصّہ آرہا تھا۔ اگر اسے نہیں آنا تھا تو اس نے وعدہ کیوں کیا؟ چائے کے بعد میں نے منصور کے دفتر فون کیا۔ پتہ چلا کہ وہ دفتر سے جا چکا ہے۔ لالہ اور زیادہ اداس ہو گئی اور اس کے چہرے کا چلبلا پن اور باتوں کی شوخی ایک دم بجھ سی گئی۔ پورا ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد وہ تینوں با دلِ ناخواستہ واپس چلی گئیں اور مجھے ان کے یوں ناامید ہو کر لوٹنے کا از حد رنج ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد منصور اپنا بھدا سا پیٹ پھلائے آتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں اس سے بالکل نہ بولا۔ وہ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

'کاغذ کا ٹکڑا تو دیں'

کاغذ پر کسی کا ایڈریس لکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

'فون تو نہیں آیا کسی کا؟'

میں خاموش رہا۔ اس نے پھر پوچھا۔ میں پھر نہ بولا۔ کاغذ جیب میں ڈال کر اس نے بڑی حیرانی سے مجھے دیکھا۔

'آپ خاموش کیوں ہیں؟'

پھر میں خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ ناقابلِ برداشت حد تک لاپروا ہے اور اسے کسی کے جذبات کا پاس نہیں ہے اور وہ انتہائی غیر ذمہ دار اور بور ہے۔ جب میرے دل کا غبار نکل گیا تو ہم دونوں کاؤنٹر کے پاس والی میز پر بیٹھ گئے اور چائے

منگوالی۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ لالہ اس سے ناراض ہے اور وہ بہت پژمردہ تھی اور کہہ رہی تھی کہ اب وہ اسے نہ کبھی فون کرے گی اور نہ خط ہی لکھے گی۔ منصور ٹانگ پر ٹانگ رکھے میری باتیں سنتا رہا اور پائپ کا ہلکا ہلکا دھواں اڑاتے ہوئے زیرِ لب مسکراتا رہا۔ اگرچہ اس نے اپنی خالہ کو ساتھ لے کر ہسپتال جانے کا عذر پیش کیا مگر اس کے باوجود مجھے یقین سا ہو رہا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر لالہ کو تنگ کیا ہے اور اس سے انتقام لیا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے لالہ کی اداس شکل پھر رہی تھی اور منصور مسکرا رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسے خوب ماروں۔

دو دن گذر گئے اور لالہ نے نہ تو فون کیا اور نہ کوئی خط بھیجا۔

منصور بظاہر بڑا بے نیاز بنا تھا مگر اندر سے وہ بھی غمگین ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا لالہ بھی اداس ہو گی لیکن چونکہ ضدی لڑکی ہے یوں اپنی شکست تسلیم نہ کرے گی۔ مجھ سے منصور کی افسردگی بھی نہ دیکھی جاتی تھی۔ میں لالہ کے گھر اسے فون بھی نہیں کر سکتا تھا دو دن اور اسی بے لطفی میں گذر گئے۔ پانچویں روز میں چائے کے نئے سیٹ دیکھ کر انار کلی سے واپس آ رہا تھا کہ میری نگاہ لالہ کے چھوٹے بھائی پر پڑی۔ وہ بازار کی دکان سے باہر نکل رہا تھا۔ میں نے آواز دے کر اسے پاس بلا لیا۔ جیب سے نوٹ بک کا کاغذ پھاڑ کر میں نے لالہ کے نام جلدی جلدی تین چار لفظ لکھے اور اس کی جیب میں ڈال دیئے۔

'یہ گھر پہنچ کر باجی کو سب سے پہلے دینا'

وہ ہنسنے لگا اور ہنستا ہوا سائیکل پر سوار ہو کر چلا گیا۔ اس وقت صبح کے دس کا وقت ہوگا۔ ٹھیک دو بجے لالہ کا فون آیا۔

'ہیلو.......'

اس کی آواز کافی بدلی ہوئی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا وہ چار دن مسلسل زکام میں مبتلا رہی ہے.... یا روتی رہی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ منصور اپنے کیے پر بہت پشیمان ہے اور وہ اس قدر غمزدہ رہنے لگا ہے کہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اس پر لالہ کی آواز بوجھل ہوگئی اور وہ بولتے بولتے رُک گئی اور مجھے اس کے آہستہ سے ناک اوپر چڑھانے کی آواز سنائی دی۔ وہ یقیناً رو رہی تھی۔ بڑے افسردہ لہجے میں کہنے لگی۔

'کلیم صاحب آپ نہیں جانتے انہوں نے مجھے کس قدر دکھ پہنچایا ہے۔ میں بڑے مان سے اپنی بہنوں کو لے کر انہیں ملنے آئی تھی۔ وہ بے چاری کبھی ہوٹلوں میں نہیں گئیں —'

'چلئے اب جو ہو گیا اس پر مٹی ڈالیں اور میرے کہنے پر آپ صلح کرلیں'

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد لالہ کی بھیگی آواز پھر سنائی دی۔

'وہ اگر غمزدہ ہیں تو مجھے کہاں سکھ کی نیند آئی ہے۔ میں بھی اسی دن سے بیمار ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کھایا۔ اب میں بہت جلد مر جاؤنگی وہ آئیں تو انہیں کہہ دیجئے کہ لالہ کا جنازہ کل اٹھ رہا ہے......'

آدھ گھنٹے کے مسلسل دلاسوں کے بعد لالہ کا عارضی غصہ رفو چکر ہو گیا اور اس کی باتوں کی زندہ دلی اور کھوئی ہوئی شگفتگی آہستہ آہستہ واپس آگئی۔ پھر اس نے مجھ سے بار بار پوچھا کہ منصور زیادہ اداس تو نہیں تھا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک رہی تھی؟ اس نے لالہ کو یاد کیا تھا؟ ٹیلیفون بند کرنے سے ایک لمحہ پہلے اس نے کہا

"میں بھی بہت اداس تھی اور سوچتی تھی کہ یونہی خواہ مخواہ منصور سے جھگڑ پڑی۔ مجھ سے یہ بڑے چھوٹے صدمے برداشت نہیں ہوتے۔ اگر آپ آج پیغام نہ بھجواتے تو کل مجھے آپ کو ضرور فون کرنا تھا۔۔۔"

فون بند کرنے کے بعد میں کتنی ہی دیر لالہ کی متضاد صفات اور اس کی بچوں ایسی جذباتی طبیعت پر غور کرتا رہا اور دل ہی دل میں ہنستا رہا۔ دوسرے دن فون پر ان کی صلح ہو گئی اور اس خوشی میں لالہ نے ہمارے لئے انگور، چاکلیٹ اور سگریٹ کے دو ٹن بھیجے اور ہم نے بڑا خوبصورت دو پونڈ کا کیک بنا کر بھیجا۔

برسات کی ابھی پہلی ہی جھڑی لگی تھی۔ گرمی کا زور کم ہو جانے سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ انہی دنوں شہر کے اندر لالہ کے کسی قریبی رشتہ دار کے ہاں بیاہ کی شہنائیاں گونج اٹھیں۔ لالہ کا سارا کنبہ ایک روز پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ جس دن مہندی کی رسم ادا ہونا تھی لالہ نے منصور کو خط لکھ کر شام کے وقت اپنی کوٹھی میں بلایا۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ لالہ نزہت کے ہمراہ کوئی بہانہ کر کے بیاہ والے گھر سے کوٹھی میں آجائیں گی جہاں منصور پہلے ہی پہنچ چکا ہو گا۔ کوٹھی چونکہ خالی ہے وہ دونوں بڑے سکون سے چند خوبصورت لمحات ایک دوسرے کے پاس گذار سکیں گے۔ منصور نے مجھ سے ذکر کیا اور میری رائے مانگی۔ میں نے اسے صاف لفظوں میں اس طرح ملنے سے منع کر دیا کیونکہ میرے نزدیک لڑکے کا یوں آزادی سے لڑکی کے گھر چلے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

لیکن منصور نے کہا کہ چونکہ لالہ نے لکھا ہے اور کوٹھی بھی خالی ہو گئی اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ محض ڈرتا رہے اور لالہ سے نہ ملے۔ میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔ شام کو منصور لالہ سے ملنے پہلی بار ان کی کوٹھی کی جانب چل پڑا۔

لالہ کی کوٹھی کا نام گیٹ ہوم تھا۔ گیٹ ہوم اولڈ چرچ روڈ کے آخر پر واقع تھی۔ منصور کوٹھی سے ذرا ہٹ کر جامن کے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور لالہ کا انتظار کرنے لگا۔ سورج اولڈ چرچ روڈ کے مغربی درختوں کے عقب میں چھپ رہا تھا کہ لالہ اور نزہت کا تانگہ نمودار ہوا۔ تانگہ کوٹھی کے باہر پہنچ کر رک گیا۔ لالہ جلدی سے نیچے اتری اور سڑک میں کھڑی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ منصور درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"ہمیں دیر تو نہیں ہوئی؟ آپ کتنی دیر سے کھڑے ہیں؟ آپ ایک منٹ اور یہاں ٹھہریں۔ میں ذرا تسلی کر آؤں۔"

لالہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی اور منصور پتلون کی جیب میں ہاتھ دیئے کھڑا رہا۔ نزہت آگے بڑھ کر بولی:

"آپ پیدل آئے ہیں؟"

"جی نہیں بس مل گئی تھی۔"

وہ دونوں اندر چلی گئیں اور منصور باہر کھڑا انہیں باغ کی روش پر سے ہو کر برآمدے اور برآمدے سے کوٹھی کے ڈرائینگ روم میں جاتے دیکھتا رہا۔ گیٹ ہوم کی پیشانی

عام کوٹھیوں ایسی تھی۔ صرف یہاں درخت زیادہ تھے جن کی جھکی ہوئی ٹہنیاں کھپریل پر دو دکشنوں کو چھو رہی تھیں۔ برامدے کی محرابوں میں کانٹے دار گھاس کے گملے لٹک رہے تھے اور ستونوں سے قرمزی پھولوں والی بیلیں چمٹی ہوئی تھیں۔ دروازے پر نام کی بجائے کوٹھی کا نمبر لکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائینگ روم کا دروازہ کھلا اور لالہ باہر نکلی۔ وہ دوپٹہ بھی برقعے کے ساتھ ہی اندر چھوڑ آئی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چل کر وہ دروازے تک آئی اور ہاتھ کے اشارے سے منصور کو اندر بلا کر پھر ڈرائینگ روم کی طرف بھاگ گئی۔ منصور گیسٹ ہوم کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ باغ میں گھاس بڑھی ہوئی تھی اور بارش میں بھیگے ہوئے راستے پر بجری بچھی تھی۔ برآمدے میں تین چار آرام کرسیاں رکھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ تپائی پر گلدان میں نرگس کے پھول مرجھا رہے تھے۔ لالہ اور نزہت کے پیچھے پیچھے وہ سجے ہوئے ڈرائینگ روم سے ہو کر، بیڈ روم اور کچن سے ہوتا ہوا کوٹھی کی پشت پر ایک مختصر لیکن بڑے خوبصورت کمرے میں پہنچ گیا۔ یہ لالہ کا کمرہ تھا۔ لالہ پلنگ پر بیٹھ گئی اور نزہت اور منصور صوفے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

'یہ ہے جناب میرا کمرہ ـــــ آپ بے شک اطمینان سے بیٹھیں۔ یہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے گا۔'

منصور نے بڑے آرام سے ٹانگیں قالین پر پھیلا دیں اور پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ چھوٹے سے کمرے میں چیزوں کی بھرمار تھی۔ پلنگ پر

کچھ کتابیں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ سرہانے کی طرف میز پر ریڈیو، گلدان اور ٹیبل لیمپ کے علاوہ قلم دوات، پیڈ اور کنگھی اور برش بھی پڑا تھا۔ میز کے نیچے پھاڑے ہوئے کاغذوں کے بے شمار ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ سنگار میز پر ٹائیلٹ کے سامان کے ساتھ ہی باقرخانیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ آتشدان کے کارنس پر چار پھولدان، کچھ کتابیں اور نرگس اور کامنی کوشل کی دو تصویریں سج رہی تھیں۔ بند کھڑکی پر پردہ گرا ہوا تھا اور اس کی درزیں سے باہر جھکی ہوئی بیل کی کچھ شاخیں دکھائی دے رہی تھیں۔

"میرا کمرہ اچھا ہے ناں؟" لالہ نے منصور سے پوچھا:

"بہت اچھا ہے۔" منصور نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا:

نزہت نے جلدی جلدی بجلی کے ٹی پاٹ میں پانی گرم کر دیا۔ لالہ الماری میں سے جام اور بسکٹ نکال کر ان کے سینڈوچ تیار کرنے لگی۔ منصور نے میز پر پیالیاں چن دیں۔ جب چائے تیار ہو گئی تو وہ بڑے اطمینان سے میز کے قریب ہو کر بیٹھ گئے اور ہنسی مذاق کی دلچسپ باتوں کے درمیان چائے پینے اور بسکٹ کھانے لگے۔ منصور بہت خوش تھا اور وہ اپنے ہاتھ سے لالہ کو بسکٹ کھلا رہا تھا۔ لالہ کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔ ان دونوں کے لئے یہ لمحات زندگی کے خوبصورت ترین لمحات تھے۔ شاید نزہت بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ میرا خیال ہے وہ بھی اس وقت یقیناً بے حد مسرور تھی۔ اپنی سہیلی کو مسکراتے دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا اور نزہت تو لالہ کی سہیلی ہی نہیں غمخوار بھی تھی۔ لیکن کون جانے وہ اس وقت کیا سوچ رہی تھی اور اس

کے ذہن کے جوالا مکھی میں کن خیالات کا لاوا ابل رہا تھا۔

چائے کے بعد نزہت یہ کہہ کر پلنگ پر لیٹ گئی کہ وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہے اور منصور اور لالہ کیرم کھیلنے لگے۔ کیرم کے دو بورڈ کھیل کر وہ دونوں اٹھے اور باہر باغ میں آ گئے۔ شام غروب ہو گئی تھی اور درختوں کے نیچے برسات کی پہلی راتوں کا بھیگا بھیگا مرطوب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ گنجان شاخوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور گھاس پہ تازہ ستاروں کی دھیمی دھیمی ملائم چمک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے کوٹھی کے عقبی درختوں تلے ادھر ادھر چھوٹی چھوٹی روشوں پر ٹہلنے لگے۔ ان کے پاؤں تلے بجری چر چرا رہی تھی اور ہلکی ہوائیں کنارے کنارے گھاس کے لمبے لمبے خوشے ہل رہے تھے۔ ایک جگہ انہیں کسی طرف سے رات کی رانی کی میٹھی خوشبو محسوس ہوئی اور وہ وہیں ایک نیم شکستہ سبز بنچ پر بیٹھ گئے۔ لالہ کا ہاتھ گرم تھا اور اس کے بدن سے نرم نرم خوشگوار حرارت سی اٹھ رہی تھی۔ منصور نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ لالہ نے ایک جھرجھری سی لی اور اس کا سارا جسم کانپ سا گیا۔ منصور نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

'میں ـــــ میں خوش نصیب ہوں جو مجھے تم مل گئیں'

لالہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

'اور میں بھی منصور ـــــ میں بھی خوش نصیب ہوں'

منصور نے اسے اور قریب کر لیا۔

"میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا لالہ ——— ہمیشہ"
لالہ کی آواز کانپنے لگی۔ اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا
"مجھے چھوڑ نہ دینا منصور! میں نے بڑی مشکل سے تمہیں پایا
ہے پھر میں زندگی سے روٹھ جاؤں گی۔ پھر میں کیسے زندہ رہ
سکوں گی۔"
"کبھی نہیں لالہ ——— میں تمہیں اپنے سے کبھی جدا نہیں کرونگا
ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہے اور ہم جنم جنم تک ساتھ دیں گے"
منصور نے ٹھوڑی سے پکڑ کر آہستہ سے لالہ کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کے
ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ یہ محبت کا پہلا بوسہ تھا۔ یہ بہار کا پہلا پھول تھا
اور یہ صبح کی پہلی کرن تھی اور موسم کی پہلی برف اور بادلوں کی پہلی گرج تھی۔ بہار آ
گئی تھی اور ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ صبح ہو گئی تھی اور وادیوں کا اندھیرا رخصت
ہو رہا تھا اور بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج دور سے سنائی دے رہی تھی۔ کیا خبر گرجنے
والے بادل اپنے ساتھ کیا لائیں۔ ہو سکتا ہے وہ محض گرج گرج کر ہی گذر جائیں
اور ہو سکتا ہے وہ اپنے ساتھ دیہاتوں کے دیہات بہا کرلے جائیں ——— لالہ
کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہو رہی تھیں اور اس
کا جسم طوفان میں گھری ہوئی نازک بیل کی مانند لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ اور اس
ملاقات کے بعد لالہ نے منصور کو جو خط لکھا اسے منصور نے کئی بار پڑھا۔ وہ خط

یوں تھا۔

"میرے اچھے منصور!

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کل شام جاگتے میں ایک خواب دیکھا ہو۔ روشنیوں اور خوشبوؤں سے بھرپور —— رنگین اور پراسرار خواب —— میں تمام رات تمہاری شہد بھری آواز سنتی رہی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو دن اس قدر روشن تھا گویا بیک وقت مشرق اور مغرب سے دو سورج طلوع ہو رہے ہوں۔ مجھے تمہاری آنکھوں میں چمکنے والے ستاروں کا خیال آ گیا۔ ان ستاروں میں زمستانی راتوں کی خامشی اور آغازِ بہار کی دلکشی تھی۔ کل کی شام کتنی خوبصورت اور خوش نصیب شام تھی۔ کل میں نے اپنی زندگی کے مرغزاروں میں ان پھولوں کو سنہری دھوپ میں کھلتے اور مہکتے دیکھا جو اس سے پہلے کبھی نہ کھلے تھے، جو اس سے پیشتر کبھی نہ مہکے تھے —— کل کی شام واپس نہیں آ سکتی منصور! کل پہلی بار میں نے درختوں کے سبز اندھیرے میں گھاس پر چاندنی کی روپہلی دوشیزہ کو محوِ خواب دیکھا۔ کل پہلی بار مجھے یقین ہوا کہ میں تمہیں مدتوں سے جانتی ہوں اور ہم اس سے پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔ رات بھر تم میرے تصور میں مجھ سے ہمکلام رہے۔ تمام رات میرے ذہن کی قوتوں کو صرف تمہارا اور صرف تمہارا احساس رہا۔ زندگی میں پہلی بار تم مجھے پوری شدت سے یاد آئے۔ پچھلے پہر چار بجے کے قریب میری نیند ٹوٹ گئی۔ کھڑکی میں سے خنک ہوا اندر آ رہی تھی۔ باہر رات سیاہ چادر سنبھالے ہوئے

ہوئے چلی جا رہی تھی۔ اور ستارے مدھم پڑتے جا رہے تھے۔ صبح جاگنے والی تھی۔
اس سہانے سمے میں نے بستر پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور خدا سے دعا مانگی
کہ وہ ہم دونوں کو کبھی جدا نہ کرے اور زندگی بھر ساتھ ساتھ رکھے۔ میری امی جان
کہا کرتی ہیں کہ صبح صبح اگر دعا مانگتے وقت کوئی تارا ٹوٹ جائے تو وہ دعا ضرور
قبول ہوتی ہے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکی سے باہر آسمان پر دو تین تارے
ٹوٹے اور میں نے کئی بار خدا سے دعا مانگی۔ رات میں نے ایک سو ایک کے قریب
خواب دیکھے اور ہر خواب میں تم میرے ساتھ تھے۔ نزہت کہا کرتی تھی کہ نوجوان
لڑکے لڑکی کو تنہائی میں ملاقات کا موقع نہیں دینا چاہیئے۔ پھر ان کا ذہن برائی
کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن منصور! میں دعوے سے کہتی ہوں کہ اگر ہم ایک سال
تک بھی تنہائی میں رہیں تو یقین کرو ہمارے ذہنوں میں کوئی برائی بیدار نہ ہو سکے گی۔
اس لئے کہ ہماری محبت جنسی لذت پرستیوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ ہماری آنکھوں
میں حیا اور شرم ہے۔ اور ہمارے ضمیر زندہ ہیں۔ ہم کبھی جذبات کی رَو میں نہیں
بہہ سکتے۔ ہم جتنی شدت سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اسی شدت سے ہمیں
ایک دوسرے کے ناموس کا بھی خیال ہے۔

منصور! کل تم جو مجھے بار بار کہہ رہے تھے کہ میں امیر گھرانے کی لڑکی ہوں اور
میں تمہارے پاس نہ آسکوں گی یہ بالکل غلط ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے
باپ کے پاس کافی دولت ہے اور وہ میری شادی ایک امیر خاندان میں

کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن تم یقین کرو منصور مجھے اس شادی سے کوئی سروکار نہیں میری دولت تم ہو۔ تم اس خیال سے کبھی آزردہ نہ ہونا کہ تمہاری پیدائش ایک غریب گھرانے میں ہوئی۔ امیر گھرانے میں پیدا ہونے سے تمہارے دل میں یہ درد کبھی پیدا نہ ہوتا اور پھر شاید لالہ بھی تمہیں کبھی نہ ملتی۔ تم بے فکر رہو منصور! میں تمہاری ہوں اور صرف تمہاری خاطر زندہ ہوں۔ وقت آنے پر اگر مجھے اپنے باپ کی ساری دولت کو ٹھکرا کر بھی تمہارے پاس آنا پڑا تو میں تمہارے پاس آجاؤں گی۔ پھر ہم خود کمائیں گے اور ملک ملک خانہ بدوشوں کی مانند چکر لگاتے پھریں گے۔

واپسی پر کل جب میں تمہارے ساتھ سڑک پر چل رہی تھی تو کتنی تیزی سے چل رہی تھی؟ میرا جی چاہتا تھا کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر ایک دم بھاگنا شروع کر دوں اور ہم دونوں بھاگتے بھاگتے اتنی دور نکل جائیں کہ ہمیں کوئی آنکھ نہ دیکھ سکے، کوئی کان نہ سن سکے اور کوئی ذہن اپنے تصور میں نہ لا سکے، ہم جس ملک میں پہنچ جائیں وہاں پھول ہی پھول ہوں نغمے ہی نغمے اور گیت ہی گیت ہوں اور چاندنی رات اور نیلا آسمان اور حسن کا سیلاب عظیم ہو۔ منصور! میں تمہیں طویل خط لکھنا چاہتی تھی لیکن پہلی بار تمہارے سینے پر اپنا سر رکھنے کے بعد ذہن میں بجلی سی چمک گئی ہے اور زندگی کے اس طوفان میں مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا، کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میں تمہیں منگل کو اکیلے فون کروں گی۔ تم ضرور ٹی ہاؤس میں ہونا۔ منگل کو پورے گیارہ بجے۔ مجھے تمہارے خط کا شدت سے انتظار ہے۔ نزہت تمہیں اور کلیم صاحب کو سلام

کہہ رہی ہے۔ خدا جانے اس کے ذہن میں کیا ہے۔ میرا تو دل اس کی طرف سے بالکل صاف ہے۔ کلیم بھائی کو میرا سلام کہہ دینا۔

صرف تمہاری

لالہ رُخ"

لالہ کا یہ پہلا خط تھا جس میں وہ اپنے اصلی اور صحیح روپ میں منصور کے سامنے آئی۔ یہ مختصر سا خط اس کے باقی تمام طویل خطوط سے اہم اور معنی خیز تھا۔ اسی خط میں شروع سے لیکر .... آخر تک ایک عورت بول رہی تھی۔ ایسی عورت جس نے آج سے ایک ہزار سال پہلے بھی محبت کے جنگل کی خاطر مرمریں ایوانوں اور دیبا و کمخواب کے بستروں کو ٹھکرا دیا تھا اور آج سے ایک ہزار سال بعد بھی ٹھکرا دے گی۔ اس کے جواب میں منصور نے اُسے جو خط لکھا میں نے اُسے بھی ان تمام خطوط کے ساتھ سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور وہ یقیناً اس قابل ہے کہ میں اسے پورے کا پورا یہاں درج کر دوں۔ وہ خط یہ تھا۔

"میری بہت ہی اچھی لالہ!

آج میں بے حد خوش ہوں۔ آج چمکیلے سورج نے مجھ سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا ہے، اور میرا سارا جسم ستھرا ہو گیا ہے۔ کل شام تمہیں ملا اور صبح تمہارا خط مل گیا۔ میں اپنے آپ کو چھپائے چھپائے پھر رہا ہوں۔ مجھے خود پر کسی انتہائی

بیش قیمت شے کا گمان ہو رہا ہے۔ میں تمہیں خط لکھتے ہوئے تمہارے پُر مہک
جسم کو اپنے قریب محسوس کر رہا ہوں۔ تمہارا خیال میرے ذہن کا ہالہ کئے ہوئے ہے
میں ابھی تک تم سے باتیں کر رہا ہوں اور تمہارے بالوں کو چوم رہا ہوں۔ تم ابھی تک
میرے ساتھ بیٹھی ہو اور مجھے اپنی خوبصورت چمکیلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ میرے ہونٹوں
پر ابھی تک تمہارے پیار کا نشان سورج بن کر چمک رہا ہے۔ میرے کانوں میں ابھی تک
تمہاری باتوں کا شہد ٹپک رہا ہے اور میری انگلیاں اس وقت بھی تمہارے سیاہ بالوں
کے ابریشم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ میں ابھی تک شگوفوں سے لدی بھندی سیب کی
ان نازک ڈالیوں کو یاد کر رہا ہوں جو تمہارے چہرے کے ساتھ ہی مجھ پہ جھک آئی تھیں۔
میرے ہونٹ تمہاری پیشانی کی دھیمی دھیمی نرم و نازک حدت کو یاد کر رہے ہیں۔ میں اپنی
بند آنکھوں پہ تمہاری ابریشمی انگلیوں کے لطیف دباؤ کو محسوس کر رہا ہوں جس میں چنارون
کی خوشبو اور چشموں کی تازگی تھی۔ لالہ! کیا واقعی یوکلپٹس کے درختوں تلے نیم شکستہ بنچ
پر تم ہی تھیں یا چاند کی دیوی تھی جو قوسِ قزح کا دوپٹہ اوڑھ کر گھڑی دو گھڑی میرا جی بہلانے
میرے پاس آ گئی تھی؟ مجھے اس وقت اپنے کانوں، اپنی آنکھوں اور اپنے ہونٹوں پر
اعتبار نہیں آ رہا۔ میں نے انہی ہاتھوں سے تمہارے ریشمی رخساروں کو چھوا تھا اور
اب یہی ہاتھ اس سے منکر ہو رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ شفق کے رنگوں میں
ڈوبے ہوئے بادلوں کو کون چھو سکتا ہے۔ میرے ہونٹوں نے تمہارے پھول
پر لرزنے والی شبنم کو چوما تھا اور اب یہی ہونٹ کسی پرانے قطعے کے زنگ آلود

دروازے کی مانند بند ہیں ــــ چپ ہیں ــــ! جیسے کہہ رہے ہوں کہ پھولوں کی خوشبو کوئی کیسے چوم سکتا ہے؟ میرے کانوں نے تمہاری آواز کو پیانو کے سروں میں سے بیدار ہوتے سنا ہے اور اب وہی کان مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ جیسے خواب ہی خواب میں انہوں نے مجھے ہمالیہ کے پوشیدہ جھرنوں کی موسیقی سنائی ہو اور کہا ہو یہ لالہ کی آواز ہے اور اب عالمِ بیداری میں اس سے انکار کر رہے ہوں۔ تم ہی بتاؤ لالہ! پھر یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر ہو گیا؟

اس وقت میں تم سے دور ہوں اور مجھے یوں لگ رہا ہے گویا میں ابوالحسن ہوں اور ہارون الرشید کے عالیشان محلات سے نکال کر بغداد کی تاریک گلیوں میں پھینک دیا گیا ہوں۔ اگر اس وقت تم میرے پاس ہوتیں تو میں تمہیں دکھاتا کہ میرے دل کے کنول پر آج کس قدر نکھار اور تازگی ہے اور اس کی ہر پتی پر تمہارے پہلے پیار کے ان گنت نشان چمک رہے ہیں۔ میرے ذہن میں ابھی تک وہ منظر محفوظ ہے جب میں نے پہلی بار گیٹ۔ ہوم کے گنجان درختوں والے باغ میں تمہارے ہونٹوں کے شگوفے چومے تھے۔ جب میں نے تمہارا چہرہ اوپر اٹھایا تھا اور اس کے ساتھ ہی کئی چاند اوپر اٹھ آئے تھے۔ یہ سعادت اولڈ چرچ روڈ کی اس کوٹھی کے حصے میں آئی تھی کہ وہ اپنے درختوں کے سائے میں ہمارے پہلے پیار کے گیت سنے۔ میں اکثر اس کوٹھی کے سامنے سے ناواقفوں کی مانند گذر جایا کرتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میری محبت کی نقاب کشائی اسی کے ہاتھوں ہونے والی ہے۔ میں اُسے

سڑک کنارے پڑا ہوا پتھر سمجھا تھا اور یہ میرے تاج محل کا سنگِ بنیاد نکلا۔
صبح کی دھیمی روشنی میں، میں نے اپنی لالہ کے ہونٹوں پہ اپنی بیکراں محبت کی پہلی
مہر ثبت کی۔ یہ کوٹھی ہماری محبت کی شاہراہ کا وہ سایہ دار موڑ ہے جہاں سے
دھوپ میں چمکتی ہوئی سرسبز و شاداب وادیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ میرا سر یہاں
سے گذرتے ہوئے خود بخود جھک جایا کرے گا۔ یہ مجھے ان پھولوں کی یاد دلائیگا
جو سربفلک پہاڑوں کے اوپر صندل اور چنار کے جنگلوں میں کھلتے ہیں، جن کے سیروں
پر سنہری کرنوں کے تاج ہوتے ہیں اور جن کے حیا آلود چہرے نیلی گھاس میں چھپے ہوتے
ہیں۔ ہمارے بغیر اس کوٹھی کا کوئی وجود نہیں۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد پورا کر دیا
ہے۔ مجھے اس عام قسم کی کوٹھی کے مقدر کی عظمت پر رشک آ رہا ہے۔
میں نے اپنی نوعمر محبت کے اس دور میں کل شام پہلی مرتبہ تمہاری سیاہ آنکھوں
اور ہونٹوں پر حیا، معصومیت، شگفتگی اور زندگی کی تڑپ کا لطیف آہنگ اور امتزاج
دیکھا۔ کل کی ملاقات نے میرے اعصاب میں ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے
کی طاقت بھر دی ہے۔ میں اس تلوار کی طرح عریاں اور تازہ دم ہوں جو ابھی نیام
سے نکلی ہو۔
یہ تم کل کیا کشمیری کشمیری کی رٹ لگا رہی تھیں۔ ذات پات کے بندھن تو تاریخی
بات ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر کیا خبر ہمارے آبا و اجداد توت کے جنگلوں سے لکڑیاں
چرایا کرتے ہوں اور وہاں سے بھاگ کر پنجاب آ گئے ہوں۔ مجھے اگر ان سے کوئی شکایت

ہے تو صرف اتنی کہ اتنی خوبصورت سرزمین چھوڑ کر وہ یہاں کیا لینے آئے تھے۔

میری اچھی لالہ! ساری رات تمہارا بھولا بھالا چہرہ مجھ پر جھکا رہا اور یہ پہلی رات تھی جو میں نے سنہرے بادلوں کے سائے میں لیٹ کر گذار دی۔ رات بھر میں تمہاری باتیں، تمہاری آنکھیں اور پیارے ہونٹ یاد کرتا رہا اور نہ جانے کتنے ہی خواب دیکھے۔ رنگدار، چمکیلے اور مہکتے ہوئے خواب ـــــ ہر خواب میں تم میرے ساتھ تھیں اور ہم کبھی سمندر میں نہا رہے تھے، کبھی کنارے کی گیلی ریت پر ناریل کے جھنڈ تلے لیٹے تھے، کبھی کیبن کے باہر چائے پی رہے تھے اور کبھی شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر دوڑ رہے تھے اور کبھی گرتی برف میں خطرناک پہاڑی چڑھائیاں عبور کر رہے تھے۔ ہمارا ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں، ہمارے کندھے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ ہمارے قدم ایک ساتھ اٹھ رہے تھے اور ہمارے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ تمام رات میں تمہارے ساتھ ہنستا، کھیلتا، جاگتا، بھاگتا، نہاتا اور قہقہے لگاتا رہا اور پھر دن چڑھ آیا اور روشنی ہی روشنی ہو گئی اور میں نے دیکھا کہ تمہاری پیاری آنکھیں مجھ پر جھکی ہوئی تھیں اور تم کہہ رہی تھیں۔

"میرا دل بہت دھڑک رہا ہے منصور ـــــ ..."

اور میں نے تمہارے دل پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اپنا چہرہ تمہارے بالوں میں چھپا لیا۔ گمنام جزیرہ کے زمردیں ساحلوں سے تمہیں آواز دی۔

"لالہ! میرے پھول کہاں ہیں؟"

اور تم نے خواب ایسی آواز میں جواب دیا۔

'میرے دل میں ——'

اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں جس جگہ پیڈ رکھ کر تمہیں خط لکھ رہا ہوں وہاں کل سورج نے اپنا سر رکھا ہوا تھا۔ مجھے تمہارے بالوں کی ایک لٹ کا خیال آ رہا ہے جو ذرا ذرا سنہری تھی۔ تم بھی ذرا ذرا سنہری ہو —— کل شام اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ زندگی کا مقصد کیا ہے تو میں اسے بتاتا کہ میری زندگی کا مقصد میری گود میں پڑا ہے۔ اس وقت مجھے یقین آیا تھا کہ چاند مشرقی افق کی بجائے میرے پہلو سے بھی طلوع ہو سکتا ہے۔

کل شام تمہاری آنکھوں پر لمبی پلکوں کا سایہ انگور کی نازک بیل کے دھندلے سائے کی یاد دلا رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے دیوار کے ساتھ وہ قمیص لٹک رہی ہے جو میں نے کل پہنی ہوئی تھی اور جس نے کل تمہارے رخساروں کو چھوا تھا۔ اب یہ قمیص ہمیشہ خوشبودار رہے گی۔

صبح سویرے جب میں نے مدھم ہوتے ستاروں کے الوداعی گیت سنے اور آسمان پر صبح کاذب کی نیلگوں جھلکیاں دیکھیں تو منہ اندھیرے کی ان اچھوتی تازہ ہواؤں میں مجھے سب سے پہلے تمہارا خیال آیا۔ میرے ذہن میں جو سب سے پہلا پھول مسکرایا اس کی پتیوں پر تمہاری یاد کی شبنم ٹپک رہی تھی۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے دل میں بھی صبح ہو رہی ہے۔ میرے سینے میں بھی کوئی سورج

طلوع ہو رہا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تمہارے متعلق سوچنے لگا۔ پھر میں
اٹھا اور سیر کے لئے باہر نکل گیا۔ کھیتوں پر سردیوں کی صبح ایسی ہلکی ہلکی دھند چھا رہی
تھی۔ میرے ساتھ زمین کی ہر شے خوش تھی۔ نیم خوابیدہ نازک پگ ڈنڈیوں نے
بڑھ کر میرے پاؤں چومے اور درختوں کی ٹہنیوں نے اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر میرا استقبال
کیا۔ میرا جی ہر درخت کے ساتھ بے اختیار لپٹ جانے کو چاہتا تھا اور سچ مچ
میں نے آگے بڑھ کر ایک درخت کے تنے کو چوم لیا اور میرے ہونٹوں پر مٹی لگ
گئی۔ اس وقت میرے دل کے تمام بادبان کھلے تھے اور وہ پرسکون نیلے سمندروں
میں ہسپانوی ساحلوں کی جانب بڑھ رہے تھے، ہائے امیں! تمہیں الحمرا کی شہزادیوں
کے روپ میں دیکھ رہا ہوں اور مجھے غرناطہ کے سیب اور تونس کے گلاب کے زرد
پھولوں کا خیال آ رہا ہے۔

O! TUNIS ! MY HAPPY HOME
A LAND EVER DEAR TO ME
WHEN SHALL I COME TO YOU?

یہ کوئی شعر نہیں ہیں۔ میں نے یونہی بنا ڈالے ہیں۔ اس وقت میں ایسے شعروں
کے کئی دیوان لکھ سکتا ہوں۔ یہ شعر غلط ہیں لیکن ان میں میرے دل کی تڑپ اور زندگی
کی تشنگی کا عکس ہے۔ لالہ! ہم سپین بھی جائیں گے۔ ضرور جائیں گے۔ پچھلے
دنوں میرا ایک دوست لندن جاتے ہوئے دو روز کے لئے جبرالٹر رکا تھا۔

اس نے خط میں لکھا تھا کہ سپین اس وقت مفلسی کے انتہائی مقام سے گذر رہا ہے۔ شراب پانی سے سستی ہے اور روٹی سونے سے بھی زیادہ مہنگی ہے۔ ہاں لالہ! آج مشرق کے ہر ملک کی یہی حالت ہے۔ کچھ بھی ہو ہم ہسپانیہ ضرور جائیں گے۔ ہم ہر سفر میں ساتھ ساتھ رہیں گے۔ ہمارا ساتھ روشنی اور آفتاب کا ساتھ ہے۔ ہمارا ملاپ جسم اور روح کا ملاپ ہے۔ ہمارا وجود ایک دوسرے کے دم سے قائم ہے۔ ہم میں سے ایک کی موت دوسرے کی بھی موت ہوگی۔ آج واقعی میں بہت مسرور ہوں لالہ!

آج میں تمہیں ہر لمحہ یاد کر رہا ہوں۔ آج میں نے ایک پل کے لئے بھی تمہیں نہیں بھلایا۔ آج کے رنگین البم میں کوئی ورق سادہ نہیں گیا۔ میں اس وقت بھی تمہیں یاد کر رہا ہوں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے گویا میں سردیوں کی سنہری دھوپ میں گھاس پر بیٹھا خوش رنگ سنگترے چھیل رہا ہوں۔ تمہارے خیال کے ساتھ ہی جیسے کوئی غیبی ہاتھ نرگس کے خوشبودار پھولوں کا گچھا میرے منہ کے بالکل پاس لے آتا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر سبز پتیوں والے چینی پیالے کا شبہ ہو رہا ہے جو سنہری چائے سے لبریز ہو اور جس میں سے مہکیلی بھاپ اٹھ رہی ہو اور جس کے پاس ہی چیری کے شگوفے رکھے ہوں۔ آج تو میں کسی چشمے میں تیرنے والا پھول ہوں، کسی جھیل پر جھکا ہوا ناریل کا درخت ہوں۔ اور بانس کے جھنڈوں سے جھانکتا ہوا چاند ہوں اور کسی بچے کی پلکوں پر کانپتی ہوئی مسکراہٹ

ہوں اور تمہارے کانوں میں لٹکتا آویزہ ہوں ــــــ آج میں بہت کچھ ہوں ــــــ! اب تم آہستہ سے میرے قریب آؤ تاکہ میں تمہاری آنکھوں پر رخصتی کے پھول رکھ سکوں۔

ہمیشہ تمہارا

منصور

میرے پاس لالہ اور منصور کے سارے خط پڑے ہیں۔

ان خطوں میں بجھی بجھی اداس شاموں، چمکیلے سنہری دنوں اور خیال انگیز چاندنی راتوں کے خواب دفن ہیں۔ یہ ان بہاروں کے مزار ہیں جو درختوں اور رشتوں کو روتا چھوڑ کر رخصت ہو گئیں۔ یہ اس خزاں کے پھول ہیں جو زرد پتے اڑاتی وادیوں میں آئی اور وہیں کی ہو کر رہ گئی اور یہ اس چتا کے شعلے ہیں جو دو محبت کرنے والے دلوں کی جواں مرگ امنگوں پر تیار کی گئی ——— کبھی کبھی میں ان خطوں کو کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے بوسیدہ قلعوں کے زنگ آلود دروازے کھول دیے ہوں۔ میں شہنشاہوں کو حسینانِ حرم کے جھرمٹ میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ خواب گاہوں کی طرف جاتے دیکھتا ہوں۔ میں جنگ سے واپس آتے فاتح سپاہیوں

کو پھولوں کی بارش میں بازاروں سے گذرتے دیکھتا ہوں۔ مجھے اندھیری غلام گردشوں میں محبت کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں اور میں مرمریں بارہ دریوں میں سیم تن شہزادیوں کو پھولوں کی سیج پر محوِ خواب اور نیم خوابیدہ باندیوں کو بے خیالی میں شاہی چمر ہلاتے دیکھتا ہوں۔ ان خطوں کے ساتھ میرے پیارے دوستوں اور خوبصورت دنوں کی یادیں وابستہ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تمام کے تمام یہاں نقل کر دوں۔ کیونکہ یہ ان لوگوں کی افسردہ یادگاریں ہیں جن کی داستان میں اس ناول میں بیان کر رہا ہوں۔ لیکن شاید کتاب کی محدود ضخامت ان کی متحمل نہ ہو سکے۔ پھر بھی میں اپنے کھوئے ہوئے دوستوں کے احترام میں ان کی محبتوں کے کفن سرکاتے ہوئے چند ایک خطوط یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر کبھی یہ کتاب ان کی نظروں سے گذری تو وہ جہاں کہیں ہوں گے مجھے بھی یاد کر لیں گے اور انہیں ان بھولے بسرے دنوں کا خیال آئیگا جب ان کا ایک دوست ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر بیٹھا ان کے فون کا انتظار کیا کرتا تھا اور آج بھی کر رہا ہے۔

اب میں لالہ اور منصور کے کچھ خطوط درج کرتا ہوں، کچھ کتیبے پڑھکر سناتا ہوں۔

اچھے منصور!

تم سے ملے بغیر اور تمہاری آواز سنے بغیر کل کا دن یوں گذر گیا جیسے سڑک سے کوئی جنازہ گذر گیا ہو۔ جیسے نگاہوں کے سامنے سے پھیکے پھیکے مرجھائے ہوئے رنگ گذر رہے ہوں۔ میں نے کل کے دن کو کپڑوں پر جمی ہوئی گرد کی مانند جھٹک دیا ہے۔ کل اتوار تھی ناں؟ — ہمارے گھر میں سارا دن ہنگامہ سا بپا رہا۔ میرے بڑے بہنوئی اور دو تین قریبی رشتہ داروں کی دعوت تھی اور یہ لوگ اپنے سارے لاؤ لشکر سمیت ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ جیسا کہ عموماً ہر اتوار کو ہوتا ہے میں تمہیں ان سب کے ہوتے ہوئے فون نہ کر سکی۔ میرے نزدیک اس دن کی جس نے مجھے منصور کی خوبصورت باتیں سننے سے محروم رکھا کوئی وقعت

نہیں ہے۔ آج پیر وار ہے اور میں تمہیں صبح سویرے خط لکھ رہی ہوں۔ جب رات خوش رنگ خوابوں کے بستر پر بسر ہوئی ہو تو صبح کتنی دلکش دکھائی دیتی ہے! ———

تمام رات میں تمہارے ہمراہ خواب کے مرغزاروں میں گھومتی رہی۔ ابھی ابھی سورج کی پہلی کرن نے مجھے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا ہے۔ سارے کمرے میں ملائم روشنی کا سنہری غبار سا پھیل گیا ہے۔ بائیں باغ کے درختوں میں پرندوں کے گیت جاگ اٹھے ہیں۔ شبنمی گھاس پر ہلکی ہلکی دھند چمکنے لگی ہے اور میں اپنے کمرے میں کھڑکی والی میز پر بیٹھی تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ میرا جی اس وقت لارنس کی سیر کو چاہ رہا ہے۔ لیکن گھر والے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ گھر والے!

مجھے شملہ، سولن اور کشمیر میں گزارے ہوئے دن یاد آتے ہیں تو میں رو دیتی ہوں میری ماموں زاد بہن کلثوم گلمرگ میں دفن ہے۔ خوبصورت اور زندگی سے بھرپور کلثوم ——— جو گلمرگ کی ایک شام کو اچانک مر گئی اور جسے کہستانی رات کی پُر اسرار خاموشی میں دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہم پہلگام آ گئے۔ وہ دن کتنے اچھے تھے!

پھر ہم دو ماہ کے لئے سولن گئے۔ راستہ کس قدر دلفریب تھا۔ جب گاڑی پہاڑی راستوں پر گھومتی ہوئی دائرہ سا بنا دیتی تو ایک ایک کر کے سارے ڈبے نگاہوں کے سامنے سے گذرنے لگتے۔ ایک ڈبے میں ہمیں ایک آدمی بیٹھا گھور رہا تھا۔ میں، رضیہ اور ثریا شور مچا رہی تھیں۔ جب گاڑی موڑ مڑتی تو میں کھڑکی سے باہر سر نکال کر باگلوں کی طرح راستہ دیکھتی۔ ہر طرف پھول تھے، سبزہ تھا اور آزادی

تھی۔ ڈھلوانوں پر کھڑیا مٹی کے چھوٹے چھوٹے مکان بنے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی عورت
چرخہ کات رہی تھی اور کہیں کوئی لڑکی پتھر پر بیٹھی بکریاں چرا رہی تھی۔ ہم اپنے بڑے
بھائی جان کے ساتھ "لال کوٹھی" میں مقیم تھے۔ یہ جگہ سولن میں سب سے بلند مقام پر ہے
ہماری کوٹھی سے بہت نیچے جا کر ایک چشمہ تھا۔ میں روزانہ اس چشمے پر صبح سویرے
نہانے جایا کرتی۔ تولیہ کندھے پر ڈال کر میں پیچدار راستوں پر سے اترتی ہوئی بالکل
اکیلی چشمے پر پہنچ جاتی اور بلا خوف و خطر نہانا شروع کر دیتی۔ پانی پتھروں سے سر
پٹختا، رکتا، پھسلتا، بہے جاتا اور میں کتنی کتنی دیر پانی میں لیٹی رہتی۔ میرے بھائی کلہاڑے
لے کر جنگلوں میں نکل جاتے اور لکڑہاروں کی طرح لکڑیاں کاٹتے، ان کے چھوٹے
چھوٹے گٹھے بناتے اور پھر انہیں کندھوں پہ لاد کر گھر کا رخ کرتے۔ راستے میں بھٹے
توڑ توڑ کر جمع کرتے جاتے۔ گھر آتے تو گٹھوں کو زمین پہ پھینک کر بھٹوں کو بھون بھون
کر خوب مزے سے کھاتے۔ وہ دن کتنے اچھے تھے! کاش تم اُن دنوں مجھے مل
جاتے۔ میں تمہیں ایک انوکھے روپ میں ملتی۔ جب میں اداس اور آزردہ رہنے
والی لالہ نہیں تھی۔ اگر تم ان دنوں سولن آتے تو تمہیں ایک کھلنڈری، صحت مند اور
سرخوش لڑکی نے ملنا تھا جو مردوں سے نفرت کرتی تھی اور ان کی طرف دیکھ کر حقارت
سے منہ پھیر لیا کرتی تھی۔ تب تم کہاں تھے منصور؟ تم مجھے وہاں کیوں نہ مل گئے؟
میں تو کئی دفعہ اکیلی ہی لمبی لمبی سیروں کو نکل جایا کرتی تھی۔ اور یونہی موڑ کے پتھروں
پر تمہارے انتظار میں بیٹھ جایا کرتی تھی۔ تم کیوں نہ آئے منصور؟ تمہارے انتظار

نے مجھے نڈھال کر دیا۔ تم نے آنے میں بڑی دیر کر دی۔ اب اگر میں چاہوں بھی تو اس آزاد اور صحت مند لالہ کو واپس نہیں بلا سکتی۔ اس لالہ کو گھر کے جھگڑوں اور رشتہ داروں کی باتوں نے وقت سے بہت پہلے مار دیا۔ ان دنوں زندگی چراگاہوں میں سرسرانے والی ہواؤں کی طرح تھی۔ آزاد اور بے فکر ——!

جب ہم سولن سے واپس آئے تھے تو جو کپڑے میں یہاں چھوڑ گئی تھی مجھے پورے نہیں آتے تھے۔ میرا چہرہ سیب ایسا سرخ ہو رہا تھا۔ سب مجھے یہی کہتے تھے کہ تمہیں کہیں نظر نہ لگ جائے لالہ ماتھے پر تھوڑی سیاہی لگا لو ——

کاش وہ دن پھر آ جائیں! کاش وقت کا سمندر ان دنوں کے موتیوں کو اگل دے۔ منصور! کبھی کبھی میں ایکا ایکی اداس ہو جاتی ہوں۔ بغیر کسی وجہ کے اداس ہو جاتی ہوں۔ پھر میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ میں دیکھتی ہوں۔ بعض اوقات تم کس قدر خوش ہوتے ہو۔ کتنا ہنستے ہو، گاتے ہو، ناچتے ہو، پھر تم مجھے بے حد اچھے لگتے ہو۔ لیکن میں اب بہت کم خوش رہتی ہوں ہم لڑکیاں خواہ کسی ماحول میں کیوں نہ ہوں بڑی مجبور ہوتی ہیں۔ خدا مجھے لڑکا بناتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

کل میں نے رضیہ کے ساتھ مل کر خوب بیڈمنٹن کھیلی۔ کھیلتے کھیلتے جب میرے بال کھل گئے، سانس پھول گیا اور پسینے میں تر بتر ہو گئی تو گھاس پر گر پڑی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ مجھے بیڈمنٹن سے زیادہ اسے کھیل کر بدن پر طاری ہو جانے والی تھکن پسند ہے

منصور! تم نے بہت اچھا کیا جو ایم اے ـــ مکمل کر لیا۔ اب تمہارا مستقبل یقیناً شاندار ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے انتظار کے بازو کبھی نہ تھکیں اور ہم بہت جلد اپنے ستاروں سے زیادہ چمکیلے اور برف سے زیادہ پاکیزہ خوابوں کو پورا ہوتا دیکھ سکیں۔ ہم قوسِ قزح کے جھولے میں بیٹھ کر ان بلندیوں پر پہنچ جائیں کہ دنیا کی ساری محبتیں ہم پر رشک کریں۔ یقیناً ہم عام لوگوں سے ہٹ کر زندگی بسر کریں گے۔ ہم ساحلِ سمندر پر جہاں ناریل کے درخت ہوں گے ٹھنڈی ریت پر بیٹھ کر زندگی، حسن اور روشنی کے گیت گائیں گے۔ آسمان نکھر کر گہرا نیلا ہو جائیگا، سمندر کی لہریں دُور دُور سے ہمارے قدم چومنے آئیں گی۔ پھر ہمارے ملبوسات دلہنوں کی مانند سج دھج کر پالکی میں بیٹھ کر گذریں گے اور ہماری زندگی کائنات کی عبادت ہو گی ہم چشموں کے کنارے محبت کے قدموں پر سر رکھ کر بہاروں کی دلکش موسیقی سے لطف اندوز ہوں گے اور درختوں کی شاخیں ہمارے احترام میں اپنے سر جھکا دیں گی۔ اچھے منصور! میں تمہارے خط پڑھتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس طشت میں سے لفظوں کے پھول چن کر اپنے بالوں میں گوندھ لوں اور کبھی الگ نہ کروں۔

کیا ہمارے خواب کبھی تعبیر کا جامہ پہن سکیں گے؟

میں سوچتی ہوں اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر کیا ہوگا؟ پھر؟ ـــ مجھے ان لوگوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ مجھے بدنامی سے بڑا خوف آتا ہے منصور! تم وعدہ کرو کہ میری محبت کا ذکر کسی سے نہ کرو گے اور اسے ہمیشہ اپنے دل میں چھپا کر رکھو گے۔ اگر یہ باتیں عام

ہو گئیں تو ہماری محبت کی اس کلی کو جس نے ابھی آنکھ ہی کھولی ہے اور جو ابھی نیم بیداری کے عالم میں ہے مسل دیا جائیگا۔ میں بدنام ہو کر تمہارے پاس نہیں آنا چاہتی منصور! اور پھر اس کا بھی کیا اعتبار کہ میں بدنامی کے بعد تمہارے پاس ضرور آ جاؤں گی۔ اس ملک میں ان گنت محبتیں ایسی ہیں جو قہقہوں سے تخلیق پاتی ہیں اور آنسوؤں میں بہہ جاتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت ہماری امیدوں کا گلا گھونٹ دے، اور ہماری دلھنوں کا سہاگ لوٹ لے —— محبت تو شبنم کے موتیوں سے بھی زیادہ نازک اور زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ یہ جب دل کے پھول پر گرتی ہے تو وہ اسے بڑے پیار سے اپنی پتیوں میں جذب کر لیتا ہے اور یہ ایک چاندنی رات کے مرمریں سکوت میں ہمارے دلوں پر ایک ساتھ گری تھی اور ہمیں اسے اپنے اندر جذب کر لینا چاہیے پیارے منصور! مجھے بدنامی سے خوف آتا ہے۔ اگر ہمارے خوابوں کا طلسم ٹوٹ گیا اور ہماری بہاروں کو کسی کی نظر کھا گئی تو پھر کیا ہو گا؟ کئی دفعہ جب میں سوچتی ہوں کہ ہماری محبت کا انجام کیا ہو گا تو چونک اٹھتی ہوں۔ پھر مجھے چاروں طرف خوفناک آندھیوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے سنہری سپنوں میں گم رہیں اور میرا باپ مجھے کسی دوسرے سے وابستہ کر دے اور میں دیوانوں کی طرح منہ ہی دیکھتی رہ جاؤں —— لیکن نہیں۔ میں ناسمجھ نہیں ہوں۔ میں اپنے بُرے بھلے کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ میں رجعت پسند عناصر کے آگے کبھی اپنا سر نہیں جھکاؤں گی۔ میں راشد الخیری کے ناولوں کی ہیروئن نہیں ہوں۔ میں تو قدامت شکن،

انقلاب پرور اور تغیر پسند لڑکی ہوں۔ میں بھری محفل میں اپنی محبت کا نقاب الٹ دوں گی۔ لیکن اگر تم بدل گئے منصور تو؟ مرد بڑا اوارفتہ مزاج ہوتا ہے۔ وہ اکثر وعدہ کر کے بھول جاتا ہے۔ وہ اکثر باتیں بھلا دیتا ہے۔ لیکن میرے اچھے منصور! میں تمہاری باتوں پر بڑی سادگی سے ایمان لے آتی ہوں۔

رات پچھلے پہر میری نیند پھر ٹوٹ گئی۔ میں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹی تمہاری محبت کی شہنائیاں سنتی رہی۔ کس قدر سحر انگیز چاندنی تھی! رات کے اس نیلگوں اور خواب آور سایوں میں میں کتنی ہی دیر تک تمہیں یاد کرتی رہی۔ اگر اس وقت تم چپکے سے میرے پاس آجاتے تو اپنی محبت کی سرفرازی اور سربلندی دیکھ کر حیران رہ جاتے یقین کرنا، لالہ تم سے کبھی بے وفائی نہیں کرے گی۔ وہ تمہیں کبھی دھوکا نہیں دے گی۔ میں تو اپنے دشمن کو بھی دھوکا نہیں دے سکتی۔ اگر میں نے لوگوں کو دھوکے دیئے ہوتے تو آج میرا ضمیر مردہ ہوتا۔ میں جسمانی تکلیف برداشت کر سکتی ہوں لیکن اپنی روح کو کبھی آلودہ نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے دنیا میں جن چیزوں سے سخت ڈر لگتا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ موت

۲۔ ابا جان

۳۔ دھوکہ دہی

۴۔ کسی کا دل توڑنا

۵۔ اندھیرا کمرہ

میرے نزدیک کسی کا دل توڑ دینے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی گناہ نہیں ہے۔
انسان کو اپنے ضمیر کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ اگر ضمیر زندہ ہے تو انسان تنہا ترین جزیروں میں بھی خوش رہ سکتا ہے۔ سچ میرا تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ کسی شاداب پہاڑ کے دامن میں مکان ہو ——— جنگلی گلاب کی بیلوں سے ڈھکا ہوا چھوٹا سا پتھریلا مکان ——— الگ اور تنہا مقام پر ——— رات کا وقت ہو اور باد و باراں کا طوفان زوروں پر ہو ہم گرم کمرے میں آتشدان کے پاس بیٹھے ہوں اور شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں کہہ رہے ہوں۔ مجھے طوفانی راتیں بے حد پسند ہیں۔ ان سے مجھے ذرا ڈر نہیں لگتا۔ بادل زور زور سے گرجیں، بجلی چمکے، موسلا دھار بارش ہو، درخت جڑوں سے اکھڑ اکھڑ کر گر رہے ہوں تو میں خوشی سے ناچنے لگتی ہوں۔ مجھے دنیا کی ہر دقت سے محبت ہے۔ میں جبلّی طور پہ دقت پسند ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے مشکل سے مشکل کام کروں۔ سیدھی راہوں کو چھوڑ کر ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلوں، الجھنوں میں الجھی رہوں، نت نئے مسائل حل کرتی رہوں، من مانی کروں۔ پتہ نہیں کیا کیا کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ منصور اگر میرے والدین تم سے میری شادی پہ رضامند نہ ہوئے تو میں کسی اور جگہ بھی شادی نہیں کروں گی۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ وہ ایسا ہرگز نہ کریں گے۔ میرے ابا جان سمجھدار اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے والے شخص ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری شادی ضرور ہو گی لیکن بڑی مشکلات کا سامنا کر کے بعد ———!

شادی کے بعد دو سال تک ہم خوب سیر کریں گے۔ ملک ملک گھومیں گے۔

بن کر پھریں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں زیور کی بجائے روپیہ ساتھ لاؤں گی۔ اتنا روپیہ کہ
ہم سارا یورپ گھوم سکیں۔ چھپے منصور! مجھے یہ دھیان آیا ہے کہیں اس وقت تک
تم بدل نہ جاؤ۔ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم کبھی نہیں بدلو گے؟ لیکن منصور
ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ لالہ بڑی ضدی لڑکی ہے۔ وہ ہمیشہ ناکامی کی صورت میں
اپنے آپ کو اذیت پہنچا کر تسکین حاصل کیا کرتی ہے۔ اگر کبھی مجھے اس بات کا احساس
ہوا کہ تم مجھ سے اکتا گئے ہو اور میں تمہیں اچھی نہیں لگتی تو میں تم سے اس طرح علیحدہ ہو
جاؤں گی کہ تمہیں محسوس تک نہیں ہوگا۔ تمہیں یوں بھول جانے کی کوشش کرونگی
جیسے تم میری زندگی میں کبھی داخل نہیں ہوئے تھے۔ جیسے تمہارا کبھی وجود بھی نہیں تھا
میری اس وقت کی اذیت طلبی کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ پھر میں بالکل اکیلی اور
چپ ہو جاؤں گی۔ میں کسی سے نہیں ملوں گی۔ ہاں میں کبھی کبھی اس منصور کو ضرور یاد
کر لیا کروں گی جو شروع شروع میں مجھ سے فون پہ باتیں کیا کرتا تھا لیکن منصور کی یاد
کو میں زندگی کا روگ نہیں بناؤں گی۔ میں اس کی یاد کو اس طرح قبول کروں گی کہ وہ
میری افسردگیوں میں اضافے کی بجائے اسے تھپک کر سلائے گی۔ ناامیدی
کے اس درد کو میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ دوں گی اور کبھی کسی بات کو یاد کر کے نہ
روؤں گی۔ منصور! میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت کیا کروں گی۔ مگر تم سے
علیحدہ ضرور ہو جاؤں گی۔ میں خودکشی نہیں کروں گی۔ میں مروں گی نہیں۔ میں ابھی مرنا
نہیں چاہتی۔ میں کبھی مرنا نہیں چاہتی۔ موت اگرچہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے

لیکن میں اس کے نام سے گھبرا اٹھتی ہوں۔ جیسے شعلے کی لو نے میری آنکھوں کو چھو لیا ہو۔ اگر تم مجھے یقین دلا دو کہ تمہارے پاس آ کر موت سے بچ جاؤں گی اور تم مجھے مرنے نہیں دو گے تو میں تم سے ضرور شادی کر لوں گی۔ اگر میں مر گئی تو اللہ میاں سے خفا ہو جاؤں گی۔ مجھے قبر سے سخت خوف آتا ہے۔ میں تو کھڑکیوں اور روشندانوں والے کمروں میں بمشکل بیٹھ سکتی ہوں اور میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر میں قبر میں کیسے رہ سکوں گی وہاں تو کوئی کھڑکی کوئی روشندان نہیں ہوتا۔ وہ تو چاروں طرف سے بند ہوتی ہے۔ میرا تو وہاں دم گھٹ جائے گا۔ میں تو اس کے اندر جاتے ہی مر جاؤں گی۔ یہ بڑی مشکل بات ہے۔ مجھے اس کے خیال ہی سے رونا آ رہا ہے۔ اگر موت سے چھٹکارا کسی طرح بھی ممکن نہیں تو میں اللہ میاں سے دعا کروں گی کہ جب میری عمر دو سو سال کی ہو جائے تو پھر بے شک موت کا پیغام آ جائے۔

اچھا چھوڑو انہیں۔ میں بھی صبح صبح کیسی غیر خوشگوار باتیں لے بیٹھی ہوں۔ پرسوں مذاق میں جو میں نے تمہیں فون پہ کہہ دیا تھا کہ تم کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا تو تم خواہ مخواہ ناراض ہو گئے تھے۔ ویسے میں نے تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہا تھا۔ تم جو محبت کی آسمانی سلطنت کے سفیر ہو تمہیں کسی ایک دوشیزہ سے بیاہ کرنا چاہیئے جس کی مثال اس دنیا میں نہ ہو۔ جس کا حسن لافانی اور لاثانی ہو۔ جو چاند کی کرنوں سے بنائی گئی ہو اور اس کے ساتھ جب تم سوئٹزرلینڈ کی وادیوں میں گھومنے نکلو تو وہاں کا حسن بھی ٹھٹھک کر رہ جائے۔ دراصل اسی رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا

بڑا اداس کر دینے والا خواب ——— میں نے دیکھا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔
جس لڑکی سے تمہاری شادی ہو رہی ہے وہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اتنی خوبصورت کہ اس کی قربت نے تمہیں بھی حسین بنا دیا ہے۔ وہ لڑکی مہمانوں کے ہجوم میں بڑی شرمائی سی بیٹھی ہے۔ میری نگاہیں تمہیں ڈھونڈتی ہیں لیکن تم کہیں نظر نہیں آتے۔ میں یہ سارا کچھ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہی ہوں۔ پھر میں تمہیں ٹیلی فون کرتی ہوں۔ کلیم بھائی بھی وہاں موجود نہیں ہوتے۔ مجھے پتہ چلتا ہے کہ تم اب مجھے نہیں مل سکتے۔ کیونکہ جب ایک شخص دولہا بن جائے تو وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا کرتا۔
میں بڑی مایوس ہو کر ٹیلی فون بند کر دیتی ہوں۔ لیکن میں روتی وغیرہ نہیں۔ میں اپنے دل کو اپنا حوصلہ بلند رکھنے کی تلقین کرتی ہوں۔ اور پھر اچانک میں نزہت کے ہاں پہنچ جاتی ہوں۔ ہم دونوں باتیں کر رہی ہوتی ہیں کہ ایک دم باجوں اور شہنائیوں کی آواز آتی ہے۔ ہم کھڑکی کی طرف دوڑتی ہیں اور دیکھتی ہیں کہ تم دولہا بنے براتیوں کے ہجوم میں گذر رہے ہوتے ہو۔ میں اور نزہت تمہیں اچھی طرح دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کہتیں۔ بالکل خاموش رہتی ہیں۔ نزہت کے مکان کے نیچے کھڑے ہو کر تم تصویریں اتروا تے ہو۔ اچانک تمہاری نگاہیں اوپر اٹھتی ہیں اور تمہیں کھڑکی میں لالہ نظر آتی ہے۔ مگر وہاں لالہ نہیں بلکہ دو جھیلیں ہوتی ہیں جن میں طوفان آیا ہوتا ہے اور کناروں کے سخت اکھڑ اکھڑ کر ان میں گر رہے ہوتے ہیں۔ تم جلدی سے نظریں ہٹا لیتے ہو اور اپنے دوستوں کے ساتھ آگے، دلہن کے گھر کی طرف چل پڑتے ہو۔ میں خود کو درست

کرتی ہوں اور ہنستے ہوئے نزہت سے کہتی ہوں۔

"میں خود ہی تو اسے کہا کرتی تھی کہ کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ دیکھ لو اس نے میرا کہا مان لیا ناں؟"

لیکن جیسے نزہت کی نگاہیں مجھے جھٹلا رہی ہوں اور کہہ رہی ہوں، "تم خود کو فریب دے رہی ہو۔ ذرا آئینے میں اپنا چہرہ تو دیکھو۔ جیسے کوئی ہارا ہوا جواری ہوتا ہے"

——— اور بس اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور میری پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

منصور! میں دو تین دنوں سے بہت غمگین ہوں۔ میں فون پہ تمہارے سامنے ہنس دیتی ہوں مگر میرا دل بڑا افسردہ ہوتا ہے۔ کسی وقت تو یہ پژمردگی مجھے عجیب عجیب ویران کھنڈرات میں لے جاتی ہے۔ ہوا کے جھونکے غم انگیز نوحے پڑھتے گذر جاتے ہیں۔ پھر میں اپنے ہی گھر میں ہر شے کو اجنبی اجنبی نگاہوں سے دیکھتی ہوں اور محسوس ہوتا ہے کہ میں اس گھر میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ کئی دفعہ میرا جی چاہتا ہے کہ ایسے اداس لمحات میں تمہاری گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا کر بچوں کی طرح ہچکیاں لے لے کر روؤں۔ تم بڑے پیار سے میرے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر پوچھو۔

"لالہ! تم کیوں رو رہی ہو"

اور میں تمہیں کہوں۔

"منصور! یہاں میرا دل بالکل نہیں لگتا۔ مجھے یہاں سے لے

چلو۔ یہاں کے لوگ اچھے نہیں ہیں۔ یہاں دیواریں ہی دیواریں

ہیں۔ مجھے پہاڑوں پر لے چلو۔ نہیں تو میں یونہی روتی رہوں۔۔۔

دوسرے روز ہم اپنا سامان باندھ کر گاڑی میں سوار ہو جائیں اور کسی نامعلوم سمت کو نکل جائیں۔ منصور! مجھے سفر سے عشق ہے۔ میں خانہ بدوشوں کی طرح ہمیشہ سفر میں رہنا چاہتی ہوں۔ جب کبھی ہم دریا پر سیر کو جائیں اور پل پر سے گاڑی گذرے تو مسافروں کو دیکھتی ہوں نہ جانے یہ لوگ کہاں کہاں جا رہے ہیں ـــ کاش میں بھی اسی طرح سفر کر رہی ہوتی۔ آج سے چھ سات سال پہلے جب ہم کشمیر میں تھے تو میں ہری بھری وادیوں میں اکیلے ہی بھاگتی پھرا کرتی تھی۔ پودوں کو روندتی ہوئی، پھولوں کو مسلتی اور بل کھاتی پگڈنڈیوں پر سے ہوتی ہوئی میں بہت بلندیوں پر پہنچ جایا کرتی تھی۔ اور شام کو تھک کر ایک جھرنے کے پاس کسی اونچے سے پتھر پر بیٹھ جایا کرتی تھی اور غروب آفتاب کے دلکش منظر کو دیکھا کرتی تھی۔ منصور! پہاڑوں پر سورج اس شان و شوکت سے غروب ہوتا ہے گویا پھر سے طلوع ہو رہا ہو۔ میرا جی شفق کے نارنجی رنگوں کو چھونے کے لئے بے تاب ہو جایا کرتا تھا۔ بارہ تیرہ سال کی لڑکی تھی۔ بعض اوقات گھر کے خیال سے ڈر بھی لگتا تھا۔ شام ہو رہی ہے۔ بھیا خفا نہ ہو جائیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سیر پر مجبور کیا کرتے لیکن میں ہمیشہ تنہا سیر کیا کرتی تھی اور تتلیوں کے تعاقب میں دور نکل جایا

کرتی تھی۔ شرمائی ہوئی کلیوں، شگفتہ پھولوں اور خوابیدہ شگوفوں کو دیکھ کر میرا دل
خوشی سے بھر آتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ بڑے اونچے پہاڑ پر چڑھ کر جب
میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو بیکراں میدان اور دور نیچے ناتراشیدہ چٹانوں
کے نشان سے نظر آئے۔ میں ڈر کر سہم گئی۔ مجھے یوں لگا گویا کہ اب کبھی واپس نہ جا
سکوں گی۔ مگر اسی جگہ مجھے نیلے نیلے پتھروں کے درمیان ایک بہت ہی خوبصورت
سنہری پھول دکھائی دیا اور میرا سارا خوف دور ہو گیا۔ میں روزانہ اس پھول سے ملنے
آتی۔ وہاں ایک نوجوان چرواہن میری سہیلی بن گئی۔ میں اس کا نام بھول گئی ہوں۔ بڑی
گوری چٹی اور معصوم سی لڑکی تھی۔ جب وہ ایک گاگر سر پہ اور ایک کمر میں رکھ کر
بڑے اطمینان سے تین میل کی چڑھائی طے کر جاتی تو میں حیران رہ جاتی۔ پھر میں سوچتی
کاش میں بھی اسی طرح ایک چرواہن ہوتی اور ان اونچے اونچے پہاڑوں پر رہا کرتی۔
جب وہاں سے واپس لاہور —— اس گرد اور شور کے شہر میں آنے لگے تو
میں نے جھک جھک کر ان وادیوں، پہاڑوں، سنہرے پھولوں اور عظیم درختوں کو
الوداع کہا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں جلد انہیں ملنے پھر آؤں گی۔ لیکن میں
پھر وہاں نہ جا سکی اور کیا خبر اب کبھی نہ جا سکوں۔ ان شہروں میں رہ کر میں ضرورت
سے زیادہ حساس ہو گئی ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پہ میں اداس ہو جاتی ہوں۔ اس
گھریلو جدوجہد نے میرا بہت نقصان کیا ہے۔ میری صحت کی خرابی کا باعث صرف
یہی لوگ ہیں جن میں سے کسی کو میں بھائیجان اور کسی کو اباجان کہتی ہوں۔ میں اپنا خو

ان کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

اچھے منصور! تم جب کبھی مجھے کہتے ہو کہ میں تمہیں بہت اچھی لگتی ہوں تو میں بھی تمہیں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن شاید کبھی نہ کہہ سکوں۔ الفاظ میرے ہونٹوں پر آ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں میں ان لفظوں کو عریاں کر کے انہیں بے نام نہیں کروں گی۔ یہ ہمیشہ میرے دل کے اندر رہیں گے۔ مجھے ان کے ناموس کا بہت پاس ہے۔ میں یہ الفاظ اس وقت تمہارے قدموں پر رکھ دوں گی جب ہم ایک ہو جائیں گے اور ——— ابھی تمہیں ڈر ڈر کر نہیں ملنا چاہتی منصور! محبت خوف سے سمٹ جایا کرتی ہے اور اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ میں تمہیں اب ایسی جگہ ملوں گی جہاں ہم ہر قسم کے خوف سے آزاد ہوں گے۔ رات کو جب میں تمہارے متعلق سوچتی ہوئی سوتی ہوں نا! تو آسمان پر بے شمار ستاروں کی چمکیلی پلکیں خوشی سے چمک رہی ہوتی ہیں لیکن صبح کو جب تمہارا خیال اپنے ساتھ لے کر اٹھتی ہوں تو آسمان گھرے گھرے بادلوں میں چھپا ہوتا ہے اور مجھے خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ آغاز و انجام کی تصویریں سامنے آ جاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے ایک دن تم نے کہا تھا۔

"لالہ! میں تم سے شادی کروں گا ———"

اور مجھے اس ایک جملے کے عقب میں دو زندگیاں، دو خاندان، دو مستقبل گھسیٹتے دکھائی دیئے تھے۔ اچھے منصور! ہم نے زمین کی پستیوں کو چھوڑ کر آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز شروع کر دی ہے۔ اب ہم پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔

ہمارا قرب اب ہمارا قرب ہے۔ کائنات اپنا ضابطہ بدل سکتی ہے۔ سورج طلوع وغروب کے اصول چھوڑ سکتا ہے۔ فطرت منجمد ہو کر صورِ محشر پھونک سکتی ہے مگر ہمارے قدموں کی مشترکہ چاپ کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔ محبت انسان کو محبت کے لئے کرنی چاہیئے۔ دو دل جب خدا کی باگ چھوڑ کر بلندیوں کو چومنے آگے بڑھتے ہیں تو وہ قابلِ ستائش اور مبارکباد کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے دلوں میں محبت کے پھول ہوتے ہیں ہوس کی دلدل نہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے کا سانچہ عجب ہے۔ جونہی یہ لوگ دو محبت کرنے والے سایوں کو ایک دوسرے کے قریب سرکتے دیکھتے ہیں تو ان کا ایک ناول مکمل ہو جاتا ہے۔ تم نہیں جانتے منصور، میں کبھی کسی بات سے نہیں ڈرا کرتی۔ جن باتوں سے مجھے ڈرنا چاہیئے میں ان کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتی۔ مجھے ہر رسمی شے سے نفرت ہے۔ میں تقلید کی قائل نہیں۔ مجھے ایک جیسے صبح و شام سے چڑ ہے۔ میں ان لوگوں کی آبادی پر اس ویرانے کو ترجیح دوں گی جہاں مجھ پر احکامات کی کمندیں پھینکنے والا کوئی نہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے گھر کے حالات بڑے عجیب سے ہیں۔ میں نے پہلے اپنے بچپن کے منگیتر اور پھر ایک دوسری جگہ شادی سے انکار کر کے حالات کو اس درجہ مشکل ضرور بنا لیا ہے کہ ایک بار پھر انکار کرنے کے لئے مجھے سوچنا پڑے گا۔ ایک لڑکی اپنے گھر میں صرف ایک ہی بار ایسا کر سکتی ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو میں ذرا سی خاموشی اور ناجائز شرم کی دیوار کو اپنے درمیان حائل کر کے اپنا مستقبل کبھی خراب نہ کروں گی۔ میں آسانی سے بھیانک

کبھی نہ پھینکوں گی۔ ابھی ہمیں کچھ دیر تک خواب کے مرغزاروں میں تتلیوں کے پروں سے بنی ہوئی بہاروں کے سایوں میں ایک دوسرے سے ملنا ہے اور جب ہم ایک ہو جائیں گے اور تم ہمارے گھر بھی آ جایا کرو گے تو ہم دونوں سورج کی کرنوں میں نہایا کریں گے اور چاندنی کے خواب انگیز نیلے راستوں پر لمبی لمبی سیریں کیا کریں گے۔ ہماری محبت آسمانی محبت ہوگی۔ جسے یہ لوگ نہیں سمجھ سکیں گے۔ ان کو معلوم ہی نہیں کہ محبت کیسے کی جاتی ہے۔ یعنی محبت کرنے کے بعد محبت کی زندگی کیسے گذاری جاتی ہے۔ خدا ان لوگوں پر رحم کرے۔ آمین!

دیکھو منصور آج میں کس قدر جذباتی ہو رہی ہوں۔ تم مجھ سے ایک بار پھر وعدہ کرو کہ جب میں جذباتی ہو جایا کروں تو تم حقیقت پسند بن جایا کرو گے۔ اور جب تم جذباتی بن جاؤ گے تو میں حقیقت پسند ہو جایا کروں گی۔ مگر جب زمانہ ہمارا اپنا ہوگا۔ ہماری اپنی دنیا ہوگی تو پھر ہم دونوں جذباتی بن کر اپنے جیون کی کلیوں کو ساون کی بھیگی چاندنی میں کھلنے کا موقع دیں گے۔

صرف تمہاری

لالہ رُخ

میری لالہ! میرے ٹھنڈے اور میٹھے چشمے!!

میں تھوڑی دیر ہوئی گھر آیا ہوں۔ ابھی سورج پوری طرح غروب نہیں ہوا۔ ابھی اس کی ملگجی روشنی شفق پر باقی ہے۔ میں سب دوستوں سے الگ ہو کر تمہیں انتہائی یکسوئی سے خط لکھنے گھر آگیا ہوں۔ افسوس کہ میرا تمباکو ختم ہو گیا ہے۔ ایرن مور کا آخری فلیک پی رہا ہوں اور تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ تم نے جب صبح فون کیا تھا اور کہا تھا کہ تم پھر فون کرو گی تو میں سمجھا تھا شائد تمہارا مطلب شام سے ہے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ تم تھوڑی دیر بعد فون کرو گی تو میں دفتر جانے کی بجائے ٹی ہاؤس ضرور ٹھہر جاتا۔ چار بجے کلیم صاحب نے دفتر فون کر کے مجھے بتایا کہ تم مجھ سے ناراض ہو اور تم فون نہیں کرو گی۔ ساڑھے چار بجے میں ٹی ہاؤس آ کر کلیم صاحب کے پاس

چپ چاپ بیٹھ گیا۔ چائے منگوائی لیکن پینے کو جی نہ چاہا۔ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی میرے کان کھڑے ہو جاتے اور کلیم صاحب مجھے دیکھ کر ہنس پڑتے اور کہتے

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔

پھر میرا ایک قریبی دوست آگیا اور ساتھ ہی تمہارا فون بھی آگیا۔ ریسیور کلیم صاحب نے اٹھایا۔ میں ایسے لمحات میں کلیم صاحب کی طرف دیکھا کرتا ہوں۔ میں ان کا چہرہ دیکھ کر فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ تم فون کر رہی ہو۔ اس وقت ان کے چہرے پر بڑی مجوب سی مسکراہٹ پھیلی ہوتی ہے۔ پھر میں نے تم سے باتیں کیں اور افسوس کہ وہ باتیں نہ کر سکا جنہیں میرا دل کرنا چاہتا تھا۔

لالہ! کیا میں یہ باتیں تم سے کبھی نہ کر سکوں گا؟ مجھے عام طور پر یہ باتیں اس وقت یاد آتی ہیں جب تم جا چکی ہوتی ہو اور تم نے فون بند کر دیا ہوتا ہے۔ لالہ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے اس وقت ملو جب تم جا چکی ہو اور تم نے فون بند کر دیا ہو؟

تم اتنے سارے تکئے لے کر کیوں سوتی ہو؟ تم عورت ہو یا تکیہ کلام؟ میرے خیال میں تم فطرت کا تکیہ کلام ہو جسے فطرت پھولوں اور چاندنی راتوں کا ذکر کرتے ہوئے بار بار دہراتی ہے۔ تم محبت، حسن اور وفا ہو۔ تم کئی بار اس دنیا میں آئی ہو اور تم بار بار اس دنیا میں دہرائی گئی ہو۔ لالہ! میری پریشانیوں کے ساتھ ساتھ تم بھی پریشان نہ ہو جایا کرو۔ میری پریشانی آٹے کے خالی کنستر کی پریشانی ہوتی ہے۔ تم انگور کی بیل کے سائے میں اپنے خواب پریشان نہ کیا کرو۔ یہاں تم ہو وہاں

انگور کی بیلیں ہیں اور قرمزی انگوروں کے گچھے ہیں اور جہاں میں ہوں وہاں خالی
کنستر بجتے ہیں۔ تمہارے کمرے میں ہر آواز گیت بن کر داخل ہوتی ہے اور میرے
کمرے سے ہر گیت فریاد بن کر نکلتا ہے۔ میری باتوں کا برا مت منانا۔ میں تمہیں
سچی باتیں لکھ رہا ہوں۔ اس لئے کہ میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں پھر
کبھی تمہیں اپنی ان راتوں کی داستانیں سناؤں گا جو میں نے روشنیوں اور خوشبوؤں
میں گھر کر بسر کیں اور جو روٹی اور موم بتی کے بغیر ہی گذر گئیں۔ آج میں تمہیں اپنے
بچپن کی ہلکی سی جھلک دکھانا چاہتا ہوں۔ اپنے کسی خط میں تم نے مجھے اپنی ابتدائی
زندگی کی باتیں سنائی تھیں۔ آج میری ابتدائی زندگی کی باتیں بھی سنو اور دیکھو کہ
اس ملک میں اونچ اور نیچ کا فرق آسمان اور زمین، مشرق اور مغرب کے فرق کو
شرمندہ کر رہا ہے۔

میں نے مشرقی پنجاب کے ایک نیم تجارتی شہر میں جنم لیا۔ میرے آباؤ اجداد
انیسویں صدی میں کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آ گئے تھے۔ میرا نانا پشمینے کا معمولی
دھندا کرتا تھا اور سال میں چھ مہینے کلکتے میں بسر کرتا تھا۔ اسے میری نانی سے بہت محبت
تھی بلکہ ان کی شادی محبت کے ایک طویل سلسلے کے بعد بڑی مشکل سے ہوئی
تھی۔ میری نانی عام کشمیری عورتوں ایسی تھی۔ وہ کشمیر میں بانہال کے کسی قریبی گاؤں
میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ کشمیری زبان میں شعر کہا کرتی تھی اور ہمارے گھر میں اس کے ہاتھ
کے لکھے ہوئے سینکڑوں شعر ابھی تک محفوظ تھے جو فسادات میں ضائع ہو گئے۔ شادی

کے بعد میرے نانا نے عیاشی شروع کر دی۔ کاروبار سے غافل ہو گئے۔ جو تھوڑی
ت پونجی تھی شراب اور طوائفوں کی نذر ہو گئی۔ آپ نے قرض لینا شروع کر دیا۔
ب قرض بہت چڑھ گیا تو تقاضے شروع ہو گئے۔ آپ نے طیش میں آ کر کسی قرض خواہ
ے چاقو گھونپ دیا اور جیل چلے گئے اور وہیں موت نے آ لیا۔ نانی بھی ان کے غم
ں زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی۔ میری امی جوان ہوئی تو اسے رشتہ داروں میں ہی ایک
یسے نوجوان سے بیاہ دیا گیا جس کے سر پر پہلوانی کا بھوت سوار تھا اور جو اپنے
پ کی کمائی پر گزارا کر رہا تھا۔ دادا جان سارا دن مارکیٹ میں گرم کشمیری شالوں
ں دلالی کرتے اور میرا باپ اکھاڑے میں کشتیاں لڑتا، ڈنٹر پیلتا، بادام پیتا، دودھ
ں انڈے اور سونے کے ورق ملا کر چڑھا جاتا اور سیروں کے حساب سے چھونوں
ھی ہضم کر جاتا۔ اس کے بعد لمبی تان کر محض اس لئے لیٹ جاتا کہ خوراک ہضم ہو جائے
ب دادا جان کا کام بھی ڈاؤن ہو گیا تو میرے باپ نے کشتیاں لڑنا شروع کر دیں۔
یک مشہور دنگل میں کسی پہلوان سے کشتی لڑتے ہوئے بازو کی ہڈی تڑوا بیٹھے اور عمر بھر
لئے کشتی لڑنے سے محروم ہو گئے۔ اب کاروبار کی فکر دامن گیر ہوئی۔ بڑے نازو نعم
ے پلے تھے۔ ہنر کوئی آتا نہیں تھا۔ کرتے تو کیا کرتے۔ خوراک کم سے کم تر ہوتی گئی
ر پلا ہوا بدن گھٹنے لگا۔ وہ خود سنایا کرتے ہیں کہ

'ان دنوں کنوئیں پر نہاتے ہوئے میں اپنے خوبصورت
بدن کو یاد کر کے رویا کرتا تھا۔'

انہی دنوں میں ان کے گھر پیدا ہوا۔ میری پیدائش پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ شہر کے تمام پہلوانوں کی دعوت کی گئی۔ قوالیاں ہوئیں اور میرے باپ نے جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو انہوں نے مجھے بھی پہلوانی کے داؤ پیچ سکھلانے شروع کر دیئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرا باپ منہ اندھیرے مجھے اٹھا کر انگلی سے پکڑ کر اکھاڑے لے جاتا۔ وہاں سب سے پہلے وہ میرے بدن پر تیل کی مالش کرتا۔ پھر اکھاڑے کی ٹھنڈی ٹھنڈی گیلی مٹی ملتا اور اس کے بعد مجھے کبھی دھکا دے کر گرا دیتا اور کبھی اٹھا کر پھر گرا دیتا۔ میں بالکل بچہ تھا۔ چنانچہ معمولی سے داؤ پر ہی مٹی پر گر پڑتا تھا۔ اگر کسی وقت میں ٹانگ اڑا کر ذرا زور سے دھکا لگاتا تو میرا باپ خوشی کا ایک نعرہ لگاتا اور "میرے شیر" کہہ کر مجھے سر پہ اٹھا لیتا۔ جب بہت کثرت ہو چکتی تو وہ مجھے قریبی تالاب پر نہانے لے جاتا۔ وہ بہت اچھا تیراک تھا۔ سب سے پہلے اسی نے مجھے تیرنا سکھایا تھا۔ وہ مجھے پانی کی سطح پر چھوڑ دیتا اور خود پرے ہٹ جاتا۔ جب میں غوطے کھانے لگتا تو جلدی سے مجھے سنبھال لیتا۔ مجھے خوب یاد ہے میں اکھاڑے کی طرف آتے ہوئے آسمان پر بھڑک بھڑک کر چمکنے والے ستاروں کو پاگلوں کی طرح منہ اٹھا کر دیکھا کرتا تھا اور واپسی پر سورج کو اتنی روشنی کے ساتھ طلوع ہوتے دیکھ کر مبہوت ہو جایا کرتا تھا۔ میرے پہلوان باپ نے کبھی اس طرف توجہ نہ دی تھی۔

اب میں اسکول جانے لگا تھا۔ میرا باپ میرے اسکول جانے کے خلاف

تھا۔ لیکن میری ماں نے اس کی سخت مخالفت کی اور مجھے زبردستی اسکول بٹھلا دیا۔ اگر میری ماں زندہ نہ ہوتی تو میں کبھی نہ پڑھ لکھ سکتا۔ پھر تم مجھے کبھی نہ ملتیں۔ پھر کسی لالہ اور کلیم سے ملاقات نہ ہوتی۔ پھر جانے میرے دوست کون ہوتے! میرا باپ بڑا سخت گیر تھا اور میری ذرا سی غلطی پر مجھے چوروں کی طرح مارا کرتا تھا۔ اسی لئے میرے دل میں اس کی خاطر کبھی محبت پیدا نہ ہو سکی۔ میرا دادا بوڑھا ہونے کے باوجود طاقتور تھا۔ دونوں مل کر مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو پیٹا کرتے تھے۔ انہوں نے ہمارے لئے ایک قسم کی چابک بنوا کر رکھ چھوڑی تھی جو ہر وقت دیوار پر لٹکی رہتی تھی۔

اسی طرح ہنستے، کھیلتے، روتے میرا بچپن —— اچھا اور برا بچپن گذر گیا اور میں نے دسویں جماعت پاس کر لی۔ اچھی لالہ! یہ ہے میرے بچپن کی ایک جھلک میرا خیال ہے تم ضرور بور ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ اس میں تمہارے انٹرسٹ کی کوئی بات نہ تھی۔ لو اب میں تمہاری باتیں کرتا ہوں۔

کل رات گیارہ بجے کے بعد میں یونہی گھومتے گھومتے لارنس باغ میں آ گیا۔ چاندنی میں پتلی پتلی روشیں چمک رہی تھیں اور درختوں کے نیچے سائے گہرے گہرے اور خاموش تھے۔ کہیں گلاب کی مہک تھی تو کہیں رات کی رانی خوشبو دے رہی تھی۔ اس چمکیلے سکوت میں بے زبان سی اداسی رچی ہوئی تھی۔ اس وقت تم مجھے بہت یاد آئیں۔ اگر تم بھی میرے ہمراہ ہوتیں تو ہم سفیدے کے چھریرے درختوں تلے بنچ پر بیٹھ کر چاندنی کے اداس گیت سنتے۔ میں تمہارے لمبے بال اپنے شانوں پر بکھیر دیتا

انہیں اپنی انگلیوں سے سہلاتا اور تمہارا پھول ایسا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ تمہاری آنکھوں اور تمہاری پیشانی اور تمہارے ہونٹوں پر رکھ دیتا اور مجھے محسوس ہوتا جیسے میں کنول کی نرم نرم پتیوں کو چوم رہا ہوں پھر میری آنکھوں میں لذّت کا خمار سُلگ اٹھتا اور وہ خود بخود بند ہو جاتیں اور تم اپنا سر میرے سینے سے لگا دیتیں۔ ہم خاموش ہو جاتے۔ چاندنی بھی خموش ہوتی اور درخت بھی چپ ہوتے، اور خموشی کے ان دردناک لمحوں میں میری آنکھوں میں خود بخود آنسو بھر آتے اور تم حیران سی ہو کر مجھے پوچھتیں۔

'یہ آنسو کیوں منصور؟'

اور میں تمہیں سرگوشی میں کہتا:

'محبت جب روتی ہے تو وہ خدا سے ہمکلام ہوتی ہے'

اور چاند یوکلپٹس کی جھکی جھکی ٹہنیوں میں سے ہمیں جھانکتا اور وقت کا رتھ رُک جاتا اور چاندنی کا نور دھیما اور مدھم پڑنے لگتا ــــــ!

میں تمہیں کچھ پھول بھیج رہا ہوں۔ یہ اگرچہ باسی ہیں لیکن میرے نزدیک ان میں تازہ پھولوں کی نسبت زیادہ حسن اور زیادہ دلکشی ہے۔ میں تمہیں کبھی جدا نہیں ہونے دوں گا لالہ! تم میری زندگی کا شیریں چشمہ ہو اور تم سے بچھڑ کر میں پیاسی موت کبھی قبول نہ کروں گا۔

اب میں خط لکھنا بند کرتا ہوں۔ میں بستر پر لیٹ کر تمہارے اداس اور دلکش

چہرے کی تلاش میں چاندنی کے نور کو عبور کرتا ہوا ان جگمگاتی فضاؤں میں پہنچ جاؤں گا جہاں تاروں کو روشنی عطا ہوتی ہے۔ تم مجھے ملنے وہاں آؤ گی لالہ؟ میں چاند غروب ہونے اور شبنم گرنے تک تمہارا انتظار کروں گا۔ ضرور آنا میری اچھی لالہ!

دیکھو آج میں نے تمہیں کتنا پر محبت خط لکھا ہے۔ آج میرے دل میں تمہاری محبت پہلے سے زیادہ بیدار اور روشن ہے۔ آج میرے پہاڑوں پر اس آبشار کی آواز زیادہ صاف اور قریب سنائی دے رہی ہے۔ آج اس جھرنے کے سارے گیت جاگ اٹھے ہیں اور آج اس مندر کے سارے دیئے لو دے رہے ہیں جیسے میرے دل میں کوئی نیا دریچہ کھل گیا ہو اور روشنی و نور کا سیلاب بہہ نکلا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر روز میرے دل میں کوئی نہ کوئی نیا دریچہ کھل جاتا ہے اور تمہاری محبت کا سورج پہلے سے کہیں زیادہ آب و تاب اور حشمت کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ روشنی میری وادیوں پر سدا چمکتی رہے۔

صرف تمہارا

منصور

میرے منصور!

تمہاری محبت کی نازک بیل نے میرے سارے بدن کو اپنے پھولوں سے ڈھانپ لیا ہے۔ اس میں روز بروز نئے نئے شگوفے اور نئی نئی پتیاں نکل رہی ہیں۔ میری محبت کے آسمان پہ ہزاروں چمکیلے ستاروں کا اضافہ ہو گیا ہے لیکن آج فون پر تمہارا خوفناک خواب سن کر جیسے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ کیا سچ مچ تم نے ایسا خواب دیکھا تھا؟ تم ایسے خواب بالکل نہ دیکھا کرو۔ جب تم ایسا خواب دیکھو تو... فوراً اپنی نیند توڑ دیا کرو۔ منصور! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ۔۔۔! ہم دونوں زندہ رہیں گے۔ ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی ہماری محبت نے تو پہلی بہار ہی دیکھی ہے۔ ابھی ہمارے مرنے کے دن نہیں ہیں۔ ابھی

ہم نے دنیا کا ایک بھی حصّہ نہیں دیکھا۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ پھر بھلا ہم کیونکر مر سکتے ہیں؟ —— منصور! میری محبت! تمہیں بسترِ مرگ پر نہیں دیکھ سکتی میں پہلے ہی بہت غمزدہ ہوں۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو پھر میں کبھی زندہ نہ رہ سکوں گی۔ منصور! میرے اچھے منصور!! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم زندہ رہو گے۔ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گے۔ تمہیں مجھ سے پکا وعدہ کرنا ہوگا۔ ورنہ میں خفا ہو جاؤں گی اور تم سے کبھی نہ بولوں گی۔

ہم دو معصوم دوستوں کی طرح ہیں منصور! ہماری روحیں پاک ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ محبت ایک بلند اور مقدس جذبہ ہے جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن اس دور میں جس محبت کے گیت گائے جاتے ہیں وہ انسان کو تاریک پستیوں کی جانب لے جا رہی ہے۔ منصور! میری باتوں کا برا مت ماننا۔ ایک لڑکی جب محبت کرتی ہے تو اس کے پیشِ نظر کوئی گھٹیا اور ادنیٰ قسم کا مقصد نہیں ہوتا۔ یہ مرد ہی ہے جو اسے طرح طرح سے ورغلاتا ہے اور آخرکار اسے جنسی خواہشات کے اندھیرے غاروں میں بند کر دیتا ہے۔ تم یقین کرو میں ایسی باتوں کے تصور ہی سے کانپ اٹھتی ہوں۔ یہ راتوں کو چھپ چھپ کر اپنی نفسانی خواہشات کے آتشدان گرم کرنا کس قدر بے حیائی کی بات ہے۔ کیا اس طرح انسان اپنی نگاہوں میں گر نہیں جاتا ہے؟ میں بدن کے فطری تقاضوں کو برا نہیں سمجھتی اور نہ ان کی طرف سے آنکھ بند کرتی ہوں۔ میں تو صرف صحتمند اور عام قدرتی

اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہتی ہوں۔ جب ان خواہشات کی تکمیل کے لئے شادی کا ضابطہ موجود ہے تو پھر اس بے راہ روی اور بے ہودگی کا مقصد؟ وہ لمحات کتنے مقدس ہوتے ہیں جب ایک شادی شدہ لڑکی اپنے خاوند کے پاس بیٹھی ہوتی ہے۔ ان کے سروں پر نیلا آسمان ہوتا ہے ان کے دلوں میں اطمینان اور سکون کی روشنی ہوتی ہے۔ ایسے سنہرے لمحوں میں قدرت اپنے حسین ترین گیت گاتی ہے۔ کاش لوگ محبت ایسی لطیف چیز کو پہچان سکیں۔ محبت خدائی عطیہ ہے۔ وہ قربانی اور خوشحالی کا دوسرا نام ہے۔ میں بھی تم سے ایسی ہی محبت کرتی ہوں۔ میں تمہارے قریب آ جاتی ہوں۔ بہت قریب آ جاتی ہوں لیکن اصلی چیز قرب نہیں بلکہ اس وقت کے خیالات اور دل و دماغ کی حالت ہوتی ہے۔ جانتے ہو میں اس وقت کیا سوچ رہی ہوتی ہوں؟

—— جیسے میں ساری دنیا سے بھاگ کر آئی ہوں۔ اس دنیا سے۔ جہاں میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ جہاں دن کو ہزاروں لوگوں کے مجمع میں اسوہ حسنہ پر تقریریں کی جاتی ہیں اور رات کو چھپ چھپ کر نوخیز جوانیوں سے کھیلا جاتا ہے۔ جہاں ظالم، بے رحم اور ذلیل لوگ بستے ہیں۔ میں ان سب سے بھاگ کر اپنے مہربان ساتھی کی آغوش میں آ گئی ہوں۔ اور یہاں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہاں میں پناہ میں ہوں اور یہی وہ جگہ ہے جہاں میرے ذہن کو سکون نصیب ہوگا۔ یہی وہ ٹھنڈی چھاؤں ہے جہاں میری تھکی ماندہ روح کو آرام ملے گا۔ یہاں میں اپنی ساری تکان بھول جاؤں گی اور پھر سے تازہ دم ہو کر اپنی منزل کی طرف چل پڑوں گی

اور میں سمجھتی ہوں کہ تم بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہو گے۔ میں جو تمہیں اپنے قریب
آنے سے منع نہیں کرتی تو محض اس لئے کہ مجھے تمہاری خوشنودی کا ہر لمحہ خیال رہتا
ہے۔ مجھے تم پر بھی اعتماد ہے اور اپنے آپ پر ——— ہم اچھائی اور برائی میں
تمیز کر سکتے ہیں۔ جو اندھیرے میں ہو وہی ٹھوکر کھاتا ہے اور ہم تو تیز روشنی میں ہیں۔
ہمیں ایسی تیز روشنی میں۔ اور روشنی نہ کبھی مرتی ہے اور نہ بوڑھی ہوتی ہے۔

اچھے منصور! مجھے کہستانی مناظر، رنگ برنگ تتلیوں، شفق رنگ آبشاروں
اور چاندنی راتوں سے بے پناہ پیار ہے۔ ہائے وہ گھڑی کس قدر خوبصورت ہوگی جب
ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے پاس آجائیں گے اور اکٹھے دنیا کی سیاحت
کو نکلیں گے۔ پھر میں تمہاری ہوں گی۔ ہر طرح سے تمہاری ——— تم ہی وہ پہلے شخص ہو گے
جو میرے دل کے ان معبدوں میں قدم رکھو گے جہاں آج تک میرا خیال بھی نہیں
پہنچ سکا۔ پھر ہم وادیوں کو گھاٹیوں کو طے کرتے اور سمندروں کو عبور کرتے ان
جزیروں میں پہنچ جائیں گے جہاں سورج کی پہلی کرنیں اترتی ہیں۔ جہاں چاند کا نورانی لباس
تیار ہوتا ہے اور جہاں سے پھولوں کو رنگ اور مہک عطا ہوتی ہے۔ ہم کب وہاں
جائیں گے۔ میرا تو اس ماحول میں دم گھٹنے لگا ہے۔ جہاں ایسے لوگ بستے ہیں۔
جن کے سامنے زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ جو گرتے پڑتے زندگی کے دن
پورے کر رہے ہیں۔ جو کبھی کماتے ہیں اور کبھی نہیں کماتے۔ جو کبھی کھاتے ہیں اور کبھی
نہیں کھاتے۔ لیکن برساتی کیڑوں کی طرح دھڑا دھڑ بچے پیدا کرتے ہیں۔ جو کنبہ

اڑاتے ہیں، نان کباب بیچتے ہیں۔ عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ کیا زندگی بس اسی
کا نام ہے؟ تم نے کئی شہر دیکھے ہیں منصور اور میں ایک مختصر سے ماحول میں زندہ
ہوں۔ میرے پیشِ نظر ہمیشہ ایک مقصد رہا ہے۔ یہ مقصد میرے مختصر ماحول سے
کہیں زیادہ جامع اور وسیع ہے لیکن اس مقصد کی اہمیت کو کبھی محسوس نہیں کیا گیا۔
آج سے کچھ وقت پہلے جب میں نے کہا کہ ہمیں شہروں سے دور بھاگ جانا چاہیئے۔
ہمیں دیواروں اور پردوں سے آزاد ہو کر پہاڑوں کی کھلی اور تازہ ہوا میں رہنا چاہیئے
اور ہمیں ندیوں کا پانی پینا چاہیئے اور درختوں سے توڑ کر پھل کھانے چاہئیں۔ ہمیں اپنے
دل و دماغ پاک کرنے چاہئیں اور ہم کو محبت کرنے کا کھلم کھلا حق ہونا چاہیئے اور
ہمیں اپنے شخصی وقار کو برقرار رکھنا چاہیئے ـــــ تو لوگوں نے مجھے پاگل کہا اور
میرے اردگرد اونچی دیواریں کھڑی کر دیں اور کھڑکیوں پہ کچھ اور پردے ڈال دیئے۔
میں نے شعور کے احساس کے ساتھ ہی زندگی کو کسی اور ہی زاویے سے دیکھا تھا۔
یہ زاویۂ نگاہ لوگوں کے لئے بالکل اجنبی تھا اور اسی دن سے میری گھر کے ہر فرد سے
ٹکر شروع ہو گئی۔ گھر والے میرے نظریات کو جھٹلاتے رہے اور میں ان کے خیالات
کا مذاق اڑاتی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ تو میں اپنے نظریات کو منوا سکی اور نہ گھر والوں کے
خیالات بدل سکی اور یوں ایک درمیانی راہگذر پہ آ گئی۔ میں بے بس ہو گئی۔ میرے
راستوں پہ دھند سی چھا گئی اور میں چلتی رہی ـــــ چلتی رہی، ویران کھنڈرات میں
نکل آئی اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انہی کھنڈروں میں گھومتے ہوئے مجھے تم مل گئے

منصور! میں آج سے پہلے بھی تمہاری ہی تھی اور آج کے بعد بھی تمہاری ہی رہوں گی۔
تم میری طرف سے کبھی پریشان نہ ہونا۔ مجھے کبھی پُراسرار لڑکی مت سمجھنا۔ میں بالکل
سیدھی سادی لڑکی ہوں۔ تم مجھے غور سے اور بڑے اہتمام سے دیکھنے کی کوشش
کرو گے تو الجھ جاؤ گے۔ سیدھی نظروں سے دیکھو گے تو میں صاف تمہارے سامنے آ
جاؤں گی۔ میں تمہیں کبھی اداس اور پریشان نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں وقت آنے پر تمہارے
لیے سبھی کچھ کر گذروں گی۔ میرے دل کو سمجھنے کی کوشش کرو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ میرا
دل تمہیں کسی اور بدن میں نہیں ملیگا۔ تم حسین سے حسین تر صورت پاؤ گے، بہتر
سے بہتر دماغ حاصل کر سکو گے لیکن مجھ ایسا دل تمہیں کہیں نہ مل سکے گا۔ میرا یہ دعوے
ہے اور تم اس پر خطِ تنسیخ کا آنچل نہیں ڈال سکتے۔
اچھے منصور! خط لکھتے وقت تم جس قدر میرے قریب آجاتے ہو نا پاس بیٹھ
کر نہیں ہوتے۔ میں اپنے خطوں میں دل کی دھڑکنوں کے ساتھ تم سے ہمکلام ہوتی
ہوں۔ تمہارے قریب بیٹھ کر مجھے اپنے دل کی باتیں کہتے ہوئے حجاب آتا ہے۔ جھجک
سی محسوس ہوتی ہے۔ میں اس ملے تمہیں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن نہ جانے کیوں
نہیں کہہ سکتی۔ شاید میں یہ باتیں تمہیں اس وقت کہوں جب ہمارے اوپر نیلے آسمان
کا تاروں بھرا آنچل اپنا سایہ کیے ہو اور سامنے کہستانی جنگلوں کے عقب سے چاند
آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا ہو۔ ہمارے نیچے لمبی گھاس کا مخملیں بستر ہوگا اور سیب کے
شگوفوں کی نیم گرم مہک چاروں طرف پھیلی ہوگی، اور دُور دُور تک کوئی دیوانہیں

ہوگی۔ وہ لمحے کس قدر سحر آفریں ہوں گے؟ پھر میں کتنی آزادی سے باتیں کرونگی۔ پھر مجھے کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔ وقت میرے آگے بے بس ہوگا اور وہ کبھی میرے خوبصورت لمحات کا مذاق نہیں اُڑا سکے گا۔ میرے لئے اس وقت کا تصوّر ہی زندگی بخش ہے۔

آج تم مجھے بہت یاد آ رہے ہو۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں اور میں گرم شال سے اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹے تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ تم سے ملنے کے بعد مجھے سردیوں کی خنک راتوں کا بہت انتظار تھا۔ میں ان راتوں کی شیدائی ہوں۔ مجھے یہ راتیں پاگل سا بنا دیتی ہیں۔ منصور! ہماری محبت کے شہر میں سردیوں کا یہ پہلا موسم ہے۔ میں اس موسم میں کوٹھی کے دوسرے منزل والے کمرے میں سوتی ہوں۔ میرے قریب کی کھڑکی اس وقت کھلی ہے۔ آج چاندرات نہیں ہے۔ باہر چاروں طرف گھرا اندھیرا ہے۔ باغ میں درختوں کے جھنڈ تاریک دھبے دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے اندھیرے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ اندھیرے میں گھر کر انسان ہمیشہ ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ آسمان پر پھیکے پھیکے ستارے چمکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میز پر ریڈیو آنکھیں بند کئے سو رہا ہے۔ اس وقت کائنات کی ہر شے چپ چاپ سو گئی ہے۔ یہی وہ لمحے ہیں منصور! جب دلوں کے درد بیدار ہوتے ہیں، اور سوگوار محبت اپنی پلکیں کھولتی ہے، اور چشموں کی روانی تیز ہو جاتی ہے اور آبشاروں کا شور زیادہ صاف سنائی دینے لگتا ہے۔ میں اس وقت تمہیں بڑی شدت سے

یاد کر رہی ہوں۔ منصور! اگر میں تم سے جدا ہو گئی تو یقین کرنا چاند بے نور ہو کر کسی تاریک وادی میں گر پڑے گا ستاروں کے فانوس ایک ایک کر کے گل ہو جائیں گے۔ پھر چاند کبھی نہ چمکے گا۔ پھر بہار کبھی نہ آئے گی اور پھول کبھی نہ کھلیں گے۔ میں نے اپنی تمام صفات کو تمہاری ذات میں گم کر دیا ہے۔ اب یا تو تمہیں پاؤں گی اور یا مر جاؤں گی۔ میں تمہیں کھو دینے کے صدمے کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ صدمہ میرے دل پہ نہیں میری لاش پر سے گذرے گا۔

منصور! میرے کردار کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے کہ اگر کوئی مجھے دکھ پہنچائے۔ میرے خلوص اور میری وفا کا مذاق اڑائے تو میں اس کا بدلہ خود سے لیا کرتی ہوں۔ میں اپنے تئیں بہت بڑی سزائیں دیا کرتی ہوں۔ میں نے خوشی کے موقعوں پر بھی اپنے آپ کو سوگوار رکھا ہے اور بڑی سے بڑی اذیت کو دعوت دے کر اس سے تسکین حاصل کی ہے۔ میں پھر اپنی سب سے بڑی دشمن بن جاتی ہوں۔ میں اکثر بہت آزردہ ہو جاتی ہوں۔ اس روز بھی میں تمہارے سامنے ہنستے ہنستے چائے پر ایک دم اداس ہو گئی تھی اور تم بار بار میرا دل بہلاتے تھے۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرا دل ایک دم بہت نیچے گر گیا ہو۔ کسی تاریک اور گہری گھاٹی میں —— ! تم آزاد ہو منصور، جو چاہو کر سکتے ہو۔ اپنا غم بھی بھلا سکتے ہو۔ اپنی خوشی کا اظہار بھی کھلم کھلا کر سکتے ہو لیکن میرے لئے یہ باتیں بہت مشکل ہیں۔ بعض اوقات میرا دل سیر کرنے کو چاہ رہا ہوتا ہے۔ مگر نہیں جا سکتی۔ کئی بار میرا جی چاہتا ہے کہ گھر جانے

کی بجائے شام تک تمہارے پاس بیٹھی رہوں لیکن ایسا کبھی نہیں کر سکی۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکا۔ یہ مجبوریاں میرے دل و دماغ پر بُرے انداز میں اپنا اثر ڈال رہی ہیں میں اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ اب جبکہ میں اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکتی ہوں، تو کیوں نہ اپنی عقل کی روشنی میں چلوں۔ بس میں اسی لئے اداس ہو جاتی ہوں کہ میں جو چاہتی ہوں نہیں کر سکتی۔ میں ان کوٹھیوں کی چار دیواری میں قیدیوں کی سی زندگی نہیں گذار سکتی۔ میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ انہی پرانی بنیادوں پر ایک نیا اور جدید تر محل تعمیر کر دوں۔ ذہنی اعتبار سے مجھ میں اور میرے گھر والوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور اس ذہنی ٹکراؤ سے ہر بات پر انتشار اور بے اطمینانی کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔

منصور کیا سچ مچ تم مجھے ہمیشہ اسی طرح پیار کرو گے؟ میری غمگین صورت تمہیں ہمیشہ دلکش نظر آئے گی؟ تم بدل تو نہیں جاؤ گے؟ میں کبھی کبھی تم سے بدگمان سی ہو جاتی ہوں۔ مجھے وہم سا ہو جاتا ہے کہ تم مجھے ضرور بھول جاؤ گے۔ تمہارا ذہن بدل جائے گا۔ تمہارا دل بدل جائے گا۔ تمہاری نظریں بدل جائیں گی۔ پھر میں تمہیں اچھی نہیں لگوں گی۔ منصور! اس سے پیشتر کہ ایسا وقت، ایسی منحوس گھڑی آئے تم مجھے صاف صاف بتا دینا۔ اپنے وعدوں سے مجبور ہو کر مجھ سے ظاہر داری کی محبت نہ کرنا۔ میں تمہیں بڑی خوشی سے معاف کر دوں گی اور ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تمہاری زندگی سے نکل کر تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جاؤں گی۔

باہر رات ——— سردیوں کی تاروں بھری ٹھنڈی رات، ہولے ہولے گذر رہی ہے۔

میں تمہیں یاد کر رہی ہوں۔ میں اپنے اوپر والے کمرہ میں اکیلی ہوں۔ آج شام تک میں بہت غمزدہ اور مضطرب تھی مگر اب میرا دل بڑے سکون کی حالت میں ہے، جس طرح بادلوں کے گذر جانے پر آسمان ہوتا ہے۔ میں نے پریشانیوں کو چائے کی باسی پتیوں کی طرح اپنے ذہن کی پیالی سے نکال باہر پھینکا ہے۔ اب میں کچھ دیر بعد ٹیبل لیمپ بجھا کر بستر میں لیٹ جاؤں گی اور تمہارے خواب دیکھوں گی۔ اچھے منصور! میں تمہیں بہت ہی اچھا سمجھتی ہوں۔ میری زندگی میں تمہارے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ منصور! میں ان چھچھوری لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو جگہ جگہ محبت کرتی پھرتی ہیں۔ میرے سب کچھ تم ہو اور میری ہر خوشی تم میں پوشیدہ ہے۔ میں تمہاری ہر بات پر ایمان لا رہی ہوں۔ اس لئے کہ تم بہادر اور شریف النفس انسان ہو۔ میں تمہیں اس سے بھی بڑھ کر سمجھتی ہوں اور اس کے باوجود اگر میں تمہاری باتوں کا اعتبار نہ کروں تو یہ میری محبت کی توہین ہو گی۔ منصور! میری محبت بہت آگے نکل آئی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں رقیب سے بھی پیار ہو جاتا ہے۔ میں تمہاری خاطر ہر قربانی کر سکتی ہوں۔

منصور! میرے دل پر بڑے زخم ہیں۔ اس لئے اگر میں تمہیں کبھی یاد آ جاؤں تو بڑی محبت سے یاد کیا کرو۔ میں تمہیں ہر کام چھوڑ کر یاد کرتی ہوں۔ اب میرا دل

پھر اداس ہو گیا ہے۔ اب میں اور نہیں لکھ سکتی۔ اب میں سونے کی کوشش کرونگی

مجھے نیند نہیں آ رہی۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے جیسے ابھی کھڑکی میں سے کوئی چور

اندر کود پڑے گا جس کے چہرے پر نقاب ہو گا اور دونوں ہاتھوں میں پستول ہوں گے

——ہائے میرے اللہ!

اب میں لحاف کو چاروں طرف سے لپیٹ کر تمہیں یاد کروں گی۔ میں لیمپ

نہیں بجھاؤں گی۔ میرے ہاتھ کی تینوں انگلیاں نیلی روشنائی سے بھر گئی ہیں اور

میز پر بھی نیلے دھبے پڑ گئے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے منصور!——خدا کرے صبح

جلدی ہو جائے۔

صرف تمہاری

لالہ رُخ

میری روشنی! میری لالہ!!

رات تمہیں خط نہ لکھ سکنے کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں ٹی ہاؤس سے بڑے موڈ میں گیا تھا۔ میرا خیال تھا میں تمہیں اتنا خوبصورت خط لکھوں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گی۔ سارا راستہ میرے ذہن میں خوبصورت فقروں کے جگنو چمکتے رہے۔ جس وقت میں اپنے کمرے میں پہنچا وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے دیا سلائی جلا کر لیمپ جلایا۔ ایک لحظہ روشن رہ کر وہ بجھ گیا۔ میں نے دوبارہ جلایا وہ پھر بجھ گیا۔ اُسے اٹھا کر ہلایا تو معلوم ہوا تیل ختم ہو گیا ہے۔ کنستر دیکھا وہ بھی خالی تھا۔ میں وہیں کھڑکی کی سل پر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں چپ چاپ بہت سی باتیں سوچنے لگا۔ مجھے تاریکی میں پا کر مجھے بجھے سے خیالوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اوپر آسمان پر بے شمار تارے

چمک رہے تھے اور ساتھ والے مکان کے روشندانوں میں سے بجلی کی تیز روشنی کے ساتھ ریڈیو کی ہلکی ہلکی تانیں بھی باہر نکل رہی تھیں۔ اس گھر میں روشنی، موسیقی اور زندگی سبھی کچھ تھا اور میرا کمرہ پرانی قبر کی مانند تھا۔ ویران اور خاموش ——— میں کتنی ہی دیر اپنے کمرے کی اداسی اور ویرانی کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ بہت کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد وہیں چارپائی پر لیٹ گیا۔

یہ خط میں تمہیں دفتر میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ یہ خط تمہارے رنگین خطوط کے مقابلے میں بیا ہی چوس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر الفاظ نہیں دھبے ہیں ——— محض دھبے! تمہارے بغیر میں نے یہ دن بڑی اداسی میں بسر کیے ہیں۔ میرے اندر شعلے سے تڑپ رہے ہیں۔ مجھے رہ رہ کر اپنی گذشتہ تاریک رات کا خیال آرہا ہے۔ میرے پاس اتنی بھی روشنی کیوں نہیں تھی کہ میں اپنی لالہ کو خط لکھ سکتا۔ لوگ تو فانوس جلا کر سوتے ہیں، اور روشنی میں خراٹے لیتے ہیں۔ میں تمہیں اس خط میں بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن بجھے ہوئے لیمپ نے میرا دل بھی بجھا دیا ہے۔ مٹی کا تیل اور محبت!

میں اس وقت مارکس کے فلسفہ اقتصادیات پر غور کر رہا ہوں۔ میں لیمپ اور تیل کے چکر میں ہوں۔ کہاں کی چاندنی اور کہاں کے یوکلپٹس!

تمہارا بجھا ہوا لیمپ

منصور

پیاری لالہ!

جس وقت تم زہرت کے گھر بیٹھیں مجھے پیار بھرا خط لکھ رہی تھیں میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کافی ہاؤس میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ میرا یہ دوست ناول نویس ہے اور آجکل ایک فلمی کہانی لکھ رہا ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ فلمی کہانی لکھنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ہیرا منڈی میں چرس بیچنے کا خفیہ دھندا اختیار کرے۔ اس سے پہلے وہ مجھے اپنے تازہ ناول کی کہانی سنا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ

"اس میں امیری اور غریبی کی خوفناک ٹکر دکھائی گئی ہے۔ شروع یوں کیا ہے کہ ایک امیر گھرانہ ہے۔ رات کا عالم ہے۔ فطرت تسبیح پڑھ رہی ہے۔ ستارے رکوع میں ہیں اور چاند مسواک کر رہا

ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ '

اگر ناول اسی طرح لکھا جاتا ہے تو یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ میرا خیال ہے ہم بھی ایک ایک ناول لکھنا شروع کر دیں۔

اچھی لالہ! اس سے پہلا خط میں نے واقعی بڑی بے دلی سے لکھا تھا اور مجبوراً لکھا تھا۔ سچ ذہن شاں شاں کر رہا تھا۔ اس خط میں تلافی کی کوشش کروں گا کل رات میں نے بڑا معرکہ آرا خواب دیکھا۔ دراصل کل رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میں ستارے گنتا رہا تھا اور پچاس تک گننے کے بعد سو گیا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک لمبے چوڑے رتھ پر سوار ہوں۔ رتھ بڑی تیزی سے بھاگا جا رہا ہے آگے بالکل سپید گھوڑے جتے ہیں جن کی گردنیں بلند ہیں، گردن کے بال اڑ رہے ہیں اور نتھنوں سے بھاپ سی نکل رہی ہے۔ رتھ برق رفتاری کے ساتھ پتھروں گھاٹیوں اور میدانوں میں سے گزر رہا ہے۔ گھوڑے بے قابو ہوئے جا رہے ہیں اور میں انہیں بڑی مشکل سے قابو میں کئے ہوئے ہوں۔ ہوا اس قدر تیز ہے کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میرے پاس ہی رتھ میں کوئی اور بھی سوار ہے جس کے لمبے سیاہ بال ہوا کی لہروں پر لہرا رہے ہیں۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ صرف اتنا ہی احساس ہے کہ میرا ساتھ برق رفتار گھوڑوں کی ایک لگام تھامے ہوئے ہے۔ ہمارے اردگرد آندھیاں سی چل رہی ہیں۔ زمین سے اٹھتے ہوئے بگولے آسمان کو چھو رہے ہیں۔ کانوں میں کچھ عجب قسم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ان میں

سمندر کی کف اڑاتی، بپھرتی موجوں کا شور، اکھڑ کر گرتے ہوئے درختوں کے دھماکے اور چٹانوں کے ٹوٹنے کا شور ہے۔ ہم کبھی کبھی بلند آواز میں ایک دوسرے کو پکار لیتے ہیں مگر ہمیں الفاظ بالکل سنائی نہیں دیتے۔ ہمارا رتھ نہ جانے کتنے صحراؤں اور تاریک ویرانوں سے گذر کر جب سرسبز میدانوں میں پہنچتا ہے تو آسمان سے نیلی اور سبز روشنی کی آبشار سی ہم پر گرتی ہے اور گھوڑے ایک دم رک جاتے ہیں۔ ہم چونک کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور میری آنکھ کھل جاتی ہے اور پچھلے پہر کا زرد چاند کھڑکی سے باہر کھجور کے درخت میں اٹکا ہوتا ہے۔ خواب کے ٹوٹ جانے کا مجھے اس قدر افسوس ہوا کہ میں نے جھوٹ موٹ پھر آنکھیں بند کر لیں اور چہرہ تکئے کے نیچے چھپا کر ایک بار پھر وہاں جانے کی کوشش کی جہاں میرے شاہی رتھ کے سپید براق گھوڑوں نے زور سے ہنہنا کر اپنا سفر ختم کیا تھا اور ان کے نتھنوں سے نکلی جھاگ کے گالے بن کر گری تھی اور جہاں آسمان سے زمین تک نیلی روشنی کا غیر مرئی ستون بن گیا تھا۔ مگر میں وہاں دوبارہ نہ جا سکا ــــــ میں پھر ان گھوڑوں اور روشنی کے ستون کو نہ دیکھ سکا۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ رتھ پر تم ہی میرے ساتھ سوار تھیں۔ کیونکہ سونے سے پہلے میں صرف تمہارے متعلق سوچ رہا تھا اور تمہارے تصور میں ہی میں نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دن کو رخصت کیا تھا۔ کاش میں تمہیں دیکھ سکتا۔ کاش ہمارا رتھ اس میدان میں کبھی نہ پہنچتا جس نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا

اور وہ کشتی کبھی نمودار نہ ہوتی جس نے ہمارے خواب کی مشعل بجھا دی ہیں صبح سے اسی دکھ میں سوا رہوں اور زندگی کے تاریک ویرانے تنہا عبور کر رہا ہوں۔ کل جس وقت تم نے فون کیا میں کلیم صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے کہ تمہارا فون آگیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کاؤنٹر پر کسی نے نرگس کے پھولوں سے بھرا ہوا گلدان رکھ دیا ہو۔ میں تم سے باتیں کر رہا تھا اور نرگس کی دھیمی دھیمی شیریں مہک میرے چہرے کو چھو کر گذر رہی تھی۔ تم سے باتیں کرتے ہوئے میں نے ہمیشہ نرگس کی مہک محسوس کی ہے اور پھولوں پر جھک کر تم سے باتیں کی ہیں۔ آج میں بہت جذباتی ہو رہا ہوں۔ آج میں اپنے دل کی انجیل غلاف سے نکال کر تمہارے آگے کھول رہا ہوں۔ خدا کے لئے میری باتوں پر اعتبار کرنا۔ میں یہ خط تمہیں دفتر سے واپس آکر ٹی ہاؤس میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ سچ مجھے تمہاری طرح خوبصورت خط لکھنے بالکل نہیں آتے۔ میں تو بڑا بے ربط لکھتا ہوں۔ ابھی اگر گاجروں کے فوائد گنوا رہا ہوں تو دوسرے لمحے مونالیزا کی مسکراہٹ کا ذکر چھیڑ دیتا ہوں۔ تم نے میرے پیار کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا ہے وہ قطعاً بے بنیاد ہیں اور ان میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری لڑکی ہو جسے میں دل اور دماغ سے چاہتا ہوں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کا انتظار کر رہے تھے اور ہمیں ایک نہ ایک دن ضرور ملنا تھا۔

تم نے یہ بتا کر کہ کوٹھی کی مرمت کے باعث تمہیں ایک آدھ ماہ کے لئے شہر

کے اندر پرانے گھر میں جانا پڑیگا مجھے بڑی بری خبر سنائی ہے۔ پھر میں تمہاری پیاری آواز
کیسے سن سکوں گا؟ بہرحال اگر یہ صورت ناگزیر ہے تو میں اسے بڑے تحمل سے
برداشت کروں گا۔ اگرچہ میرے لئے یہ گھڑیاں قیامت کی ہونگی تاہم میں انہیں
خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔ اگر ہمارا ہر سانس ایک دوسرے کی یاد میں
ڈوب کر باہر نکلتا ہے اور دل کی دھڑکن پر ایک دوسرے کو یاد کرتے ہیں تو پھر
جدائی ہمارے پیار کو دھندلا نہیں سکتی۔ بلکہ اور درخشاں کر دے گی۔

نیک دل لالہ! پچھلی باتوں پہ تمہیں پشیمان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے
نزدیک تمہارا دل انتہائی سادہ اور شریف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں ان لوگوں
نے بہت جلد بدنام کر دیا جن کے ساتھ تم نے کالج کے زمانہ میں دو منٹ بھی ہنس
کر بات کی تھی۔ یہ لوگ اگرچہ آج بھی تمہارے متعلق عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں
لیکن میں نے ان کی باتوں پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ میرے پاس ایسے لوگوں کی باتوں
پر غور کرنے کے لئے کوئی وقت نہیں ہے۔ تمہاری سادہ لوحی اور نیک نفسی پہ
میرا یقین اس حد تک کامل ہے کہ اگر مجھے تم بھی کہو کہ لالہ ایک ناقابلِ اعتبار لڑکی
ہے تو میں یہی سمجھوں گا کہ تمہیں لالہ سے دشمنی ہے اور تم اس سے انتقام لے رہی
ہو۔ میں جب محبت کرتا ہوں تو میرا چہرہ سورج کی طرف ہوتا ہے اور پشت ان لوگوں
کی طرف جو محض بدنام کرنا جانتے ہیں۔ ان کا راہوار زندگی الٹا ہے اور ان کے چشموں
کا پانی گندا ہے اور ان کے درختوں پر کڑوے پھل لگتے ہیں۔

میں حیران ہوں کہ تم جو لبنان کی پہاڑیوں پر گرنے والی برف ہو ان دھوپ میں پھلسنے والے کھنڈرات میں کیسے نکل آئیں؟ وہ کونسی راہ گذر تھی اور وہ راستہ کدھر کو جاتا تھا جہاں سے گذرتے ہوئے تمہیں اس قسم کے لوگ مل گئے؟ ان لوگوں کی باتوں پر اعتبار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں بیوقوف ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم ان لوگوں کی باتوں پر آزردہ ہونے کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہو۔ اس لئے تم اداس نہ ہوا کرو اور اپنی خوبصورت آنکھوں میں غم کی قندیلیں فروزاں نہ کیا کرو۔ کاش میں اس وقت تمہارے پاس ہوتا اور تمہاری پلکوں پر گری ہوئی شبنم کو اپنے ہونٹوں سے اٹھا لیتا اور تمہارا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہتا:

'لالہ! ہم ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ جس طرح ہمالیہ کی چوٹیوں پر گرنے والی برف کبھی نہیں پگھلتی اسی طرح ہمارا پیار بھی کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میری طرف دیکھو! میری آنکھوں میں تمہاری محبت کے شگوفے پھول بن رہے ہیں اور پھول خوشبو دے رہے ہیں......'

مگر تم مجھ سے دور ہو —— ہزاروں، لاکھوں میل دور ہو۔ تمہارا اور میرا فاصلہ ایک سڑک کا نہیں —— ایک خاندان اور ایک کلچر کا فاصلہ ہے۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ تم جہاں بھی رہو مجھے اپنے قریب سمجھو اور ہماری محبت کے سنہرے پن میں زنگ نہ آنے دو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ میری باتوں کا یقین کر لیا کرو۔ میں تمہارے

سامنے ہمیشہ اپنا دل کھول کر بات کرتا ہوں۔ میں زندگی کے کسی بھی دور میں تمہیں دھوکا
نہ دوں گا۔ اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہو گیا کہ ہم اس دنیا میں نہ مل سکے اور ہم
نے ایک دوسرے کو کھو دیا تو میں اسے تمہارا قصور نہیں ——— اپنی بدقسمتی
خیال کروں گا۔ میں بڑی خاموشی سے یہ شہر چھوڑ کر کسی اور شہر میں جا کر کوئی کام
شروع کر دوں گا اور کسی کے سامنے تمہارا نام نہ لوں گا۔ کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے
دوں گا کہ کبھی ہم نے چاندنی راتوں میں محبت کی قسمیں کھا کھا کر عہد و پیمان باندھے
تھے۔ اور کبھی ہم بھی ایک دوسرے کو پیار بھرے خط لکھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ تم
سے بھی تمہاری محبت کا تذکرہ نہ کروں گا۔ تم سے بھی تمہاری محبت چھپاؤں گا۔ اس
لئے کہ مجھے لالہ کی عزت اپنی محبت سے بڑھ کر عزیز ہے۔ میں تمہاری دوستی اور
محبت کی قدر کرتا ہوں۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ ہم کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر ہمیشہ کے
لئے روٹھ جائیں۔ غلط فہمیاں آستینوں کے سانپ ہوتی ہیں۔ ہمیں انہیں دودھ نہیں
پلانا چاہیئے۔ ہمیں اگر پاس آ کر بچھڑ ہی جانا ہے تو بہتر ہے کہ ہم کبھی پاس نہ آئیں۔ ہماری
ملاقات بہار کی پہلی صبح کو چنار کے درختوں تلے ہوئی ہے۔ ہماری محبت کی پہلی
شبنم ان پھولوں پہ گری ہے جن کی خوشبو آج تک کسی دوسرے تک نہیں پہنچی۔
ہم اس موسم میں پہاڑوں پر ملے ہیں جب پہلی برف کی سپید تتلیاں گر رہی تھیں
اور ہمارے پیار کا پھول اس گمنام جھیل میں کھلا ہے جو سیب کے شگوفوں
اور انگور کی بیلوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ہم نے ان راستوں کو اپنی منزل

بنایا ہے جو نرگس کے کھیتوں سے ہو کر گذرتے ہیں اور کہیں ختم نہیں ہوتے۔ جن کی گرد کہکشاں سے بڑھ کر چمکیلی ایوننگ ان پیرس سے زیادہ خوشبودار ہے۔ آؤ ہم ہاتھ میں ہاتھ دیئے ان راستوں پر دوڑتے چلے جائیں اور جب تھک جائیں تو کسی کنج میں لیٹ کر ایک خواب دیکھیں ——— خواب جو زندگی سے زیادہ رواں دواں اور تعبیر سے زیادہ پُر حقیقت ہو! میں نے بچپن میں ایک کشمیری کہاوت سنی تھی کہ چنار کی چھاؤں میں ملنے والے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ ——— خدا کرے یہ کہاوت سچی ہو۔

آج پھر تمہیں لکھتے لکھتے بہے جا رہا ہوں۔ اسی لئے میں تمہیں کہا کرتا ہوں کہ مجھ سے لمبے خط نہیں لکھے جاتے۔ ایک خاص حد سے گزر کر خط مجھے لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اب مجھ سے آگے نہیں لکھا جاتا۔ خط بند کرتا ہوں۔ باقی شائد رات کو لکھوں۔

ایک بجے رات ———!

اس وقت رات کا پورا ایک بجا ہے۔ میں اور کلیم سینما دیکھنے چلے گئے تھے۔ ابھی آ کے کپڑے بدلے ہیں اور صبح والے خط کو مکمل کرنے بیٹھ گیا ہوں۔ میں یہ خط ایرن مور کی دھیمی دھیمی مہک میں لکھ رہا ہوں۔ اس وقت میرا دل تمہاری یاد سے لبریز ہو رہا ہے۔ رات چمکیلی اور تاروں بھری ہے۔ سردی زیادہ ہو گئی ہے۔ لیکن میرا کمرہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے گرم ہے۔ میرے آس پاس گہری

خاموشی ہے۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں کی خاموشی —— میں اس سناٹے میں تمہاری محبت کی صدائے پرداز سن رہا ہوں اور تم سے دل کی زبان میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہوں۔ ہمیں ملے غالباً ایک مہینہ گذر گیا ہے۔ نزہت سے بھی پھر ملاقات نہیں ہو سکی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اب ہم تینوں اکٹھے ملیں۔ وہ دن کتنا حسین ہو گا! اور ہاں —— تم نے فون پر اس روز یہ بات پھر کیوں دہرائی کہ میں کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کر لوں؟ میری محبت تاش کے پتے نہیں ہے کہ میں اسے ہر ایرے غیرے میں بانٹتا پھروں۔ میں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ میری جھولی میں جتنے پھول تھے میں نے تمہارے قدموں پر ڈھیر کر دیئے ہیں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم نے انہیں اٹھا کر سر کے بالوں میں سجا لیا ہے۔ میں یہ تر و تازہ پھول ہمیشہ تمہارے سیاہ بالوں میں مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان پھولوں کو تمہاری محبت کا لمس مرجھانے سے بچائے رکھے گا۔ میں جب تمہیں فون پر کہتا ہوں نا کہ "لالہ میری طرف دیکھو" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے اور قریب آ جاؤ۔ اتنا قریب کہ ہمارے سانس ایک دوسرے میں مل جائیں اور ہماری دھڑکنیں ہم آہنگ ہو جائیں۔ میں تمہارے سیاہ بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنا چاہتا ہوں۔ اور اپنی آنکھوں میں محبت کے پھول دیکھنا چاہتا ہوں اور تمہاری آنکھوں پر ہونٹ رکھ کر ان جنگلوں میں نکل جانا چاہتا ہوں جہاں سر شام لیچی اور صندل کی مہک سے گرانبار ہوائیں چلتی ہیں اور جہاں رات کو ان دیکھے خنگو فے اپنی پلکیں جھپکا کر جاگ اٹھتے ہیں اور گرتی

شبنم کی سرگوشیاں سنتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ کسی خاموش رات کے سناٹے میں، تمہارے کمرے کے باہر باغ میں آکر اوس میں بھیگے ہوئے گھاس پر کھڑا ہو جاؤں۔ تمہاری خوابگاہ سے آتی ہوئی مدھم روشنی میرے پاس گھاس پر بچھ رہی ہو۔ چاند آم اور جامن کے درختوں میں الجھ گیا ہو اور فضا میں یوکلپٹس کے گیلے درختوں کی مہک بس رہی ہو۔ تمہاری کھڑکی پر جھکی ہوئی انگور کی بیل گہری نیند میں ہو۔ میں گلاب کے کچھ سرخ پھول توڑ کر دبے دبے قدم اٹھاتا تمہارے کمرے کی طرف بڑھوں۔ پردہ پرے ہٹا کر تمہارے پلنگ کے پاس آؤں اور دیکھوں کہ تم گہری نیند میں سو رہی ہو اور تمہاری ابریشمی پلکیں بند ہیں۔ تمہارا لباس سپید ہے اور یوں لگ رہا ہے جیسے روشنی کے غبار میں سپید پھولوں کا ڈھیر سانس لے رہا ہو۔ تمہارے سانس لینے سے تمہارا سینہ آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہو رہا ہو۔ میرے ہاتھ میں گلاب کی پتیوں پر سے شبنم کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ میں ان پھولوں کو چوم کر تمہارے پاؤں کی جانب بستر پر رکھ دوں، جھک کر تمہارے چادر سے باہر نکلے ہوئے شگفتہ پاؤں کو بوسہ دوں اور تمہاری خواب گاہ سے دبے پاؤں نکل کر دروازہ بند کر دوں اور نیلی چاندنی میں چمکتے ہوئے باغ سے گزر کر واپس اپنی تنگ و تاریک گلیوں میں گم ہو جاؤں۔ اور جب دن کی روشنی نمودار ہو تو رات کے واقعے پر مجھے کسی رنگین خواب کا گمان ہو، جیسے میں نے قوسِ قزح کو اپنے اندھیرے کمرے میں دیکھ لیا ہو، جیسے میں نے یونہی کھڑے کھڑے ایڑیاں اٹھائی ہوں اور ستاروں

کو چھو لیا ہو۔

اچھی لالہ! میں سب کچھ محض چاہتا ہی ہوں، سوچتا ہی ہوں۔ یہ ہو گا کیا؟ وہ صرف خدا جانتا ہے۔ میں نے تمہاری محبت کے چشمے کو پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ کر پایا ہے۔ یہ چشمہ خاردار جھاڑیوں اور کانٹے دار تاروں میں الجھا ہوا تھا۔ آب جبکہ طویل اور دشوار گذار پہاڑی راستے عبور کرنے کے بعد میں اس چشمے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو میں اسے کسی قیمت پر بھی کھو دینا گوارا نہیں کر سکتا۔ اب میری باقی زندگی اسی شیریں چشمے پر عظیم درختوں اور پھولدار بیلوں کے درمیان گذرے گی۔ میرے ذہن میں تمہارے بغیر بسر ہونے والی زندگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔ میں ان اجنبی لوگوں میں تصویر کا ایک ہی رخ لئے پھر رہا ہوں۔ میں سوچ ہی نہیں سکتا کہ تم سے جدا ہو کر میں کیا کروں گا اور کچھ کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ میں لق و دق صحراؤں میں بھٹکتے ہوئے اچانک ایک شاداب نخلستان کے کنارے نکل آیا ہوں۔ میں یہاں سے کیسے واپس جا سکتا ہوں؟ کہاں واپس جا سکتا ہوں؟ تمہارا اچانک مل جانا میری زندگی کا انتہائی خوشگوار حادثہ ہے اور مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ موسیٰ کو اچانک پیغمبری کیسے مل گئی تھی۔ میں دھندلے دھندلے بھیگے بادلوں کا خواب دیکھ رہا تھا اور میں نے تیز سنہری دھوپ میں آنکھ کھولی ہے۔ تم ہی میری دھوپ اور نیلا آسمان ہو!

اچھی لالہ! میں تمہیں کبھی کھونا نہیں چاہتا۔ مگر کبھی کبھی میرے دل میں نہ معلوم

ساخوف جاگ اٹھتا ہے اور مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے سونے سے منڈھا ہوا کوئی چمکیلا ہاتھ تمہیں مجھ سے چھین رہا ہے۔ جیسے ہمارے درمیان سونے کی دیوار حائل ہے جو دیوارِ چین سے زیادہ لمبی اور ابوالہول سے زیادہ پرانی ہے۔ پھر میں اپنے آپ ہی خاموش سا ہو جاتا ہوں اور کبھی تمہاری کھڑکی پر جھکی ہوئی انگور کی بیل کے متعلق اور کبھی اپنے گھر کے آنگن میں اُگے ہوئے پھیکے گھاس کے متعلق سوچنے لگتا ہوں۔ خدا جانے کیا پاؤں! خدا جانے کیا ملے!

صرف تمہارا

منصور،

اچھے منصور!

آج میں بڑی افسردہ خاطر ہو کر تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ آج ہم کوٹھی چھوڑ کر شہر کے گنجان ترین علاقے میں اپنے پرانے گھر آ گئے ہیں۔ یہ مکان بہت بڑا ہے۔ میں نے اپنے لئے دوسری منزل میں کمرہ منتخب کیا ہے۔ اتنی دیر بعد اس پرانے گھر میں آئی ہوں۔ ہر شے اجنبی اجنبی نگاہوں سے مجھے تک رہی ہے۔ اگرچہ ہمیں ایک دو ماہ کے لئے یہاں رہنا ہے۔ مگر میرا آج ہی دم گھٹنے لگا ہے۔ میرا کمرہ کافی ہوادار اور روشن ہے لیکن اس کی کھڑکی پر انگور کی بیل نہیں ہے۔ اس وقت میں تمہیں اس کھڑکی کے پاس بیٹھی خط لکھ رہی ہوں۔ باہر تیز چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ آسمان پر چیلیں منڈلا رہی ہیں۔ مکانوں کی اکثر چھتیں خالی خالی سی ہیں۔ بڑی

اداس فضا ہے۔ یہاں کوئی درخت نہیں، کوئی پھول نہیں، اب کس کی چھاؤں میں بیٹھ کر تمہیں خط لکھا کروں گی۔ چاروں طرف ہمسائے ہی ہمسائے ہیں۔ ساتھ والے مکان سے لڑائی جھگڑے کی آواز آرہی ہے۔ شاید بہو اور ساس میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ ساس کہہ رہی ہے۔

"جب میں بہو تھی تو ساس اچھی نہ ملی۔ اب میں ساس بنی ہوں تو بہو جھگڑالو ملی ہے۔"

کسی اور مکان سے بہن بھائی کے چلّانے کی آوازیں آرہی ہیں۔ بڑا بھائی چھوٹی بہن پر رعب ڈال رہا ہے اور بہن رو رہی ہے۔ ایک طرف موٹی سی عورت چولہے کے پاس بیٹھی بڑے آرام سے روٹیاں پکا رہی ہے۔ اس نے دس بارہ چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنے اردگرد جمع کر رکھی ہیں۔ بچیوں کے ہاتھوں میں سپارے ہیں۔ موٹی عورت کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ کسی وقت وہ چھڑی اٹھا کر کسی بچّی کے سر پہ دے مارتی ہے۔ سامنے والے مکان کے صحن میں ایک عورت اپنے نصف درجن بچّوں کو روٹی کھلا رہی ہے۔ میں ان کو دیکھ کر سوچ رہی ہوں کہ یہ کیسی زندگی ہے؟ یہاں زندگی گذارنے کا انداز کس قدر انوکھا اور مختلف ہے۔ یہ اصل زندگی ہے یا اس کی نقل اتاری جا رہی ہے۔ یہاں زندگی گذرتی ہے یا اس کا محض مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہ لوگ کتنے مطمئن اور پرسکون دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کتنے انہماک سے چھوٹی چھوٹی باتوں کو سلجھانے میں عمر لگا دیتے ہیں۔ میں ہمسایوں سے راہ و رسم بڑھانے کے حق میں نہیں ہوں۔

سامنے مکان کی چھت پر ایک لڑکی کھڑی ہے۔ اچھی قبول صورت لڑکی ہے وہ
مجھے دیکھ رہی ہے لیکن میرا جی کسی سے بات کرنے کو نہیں چاہتا۔

آج کل ہمارے گھر والوں کو بھی نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ ہر ایک کا مزاج چڑچڑا
ہو رہا ہے۔ ہر شخص دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ رات کتنے عرصے بعد پہلی
بار گھر میں میرے بیاہ کا ذکر چھڑا۔ ابّا جان —— ضدی اور خود سر ابا جان کہہ رہے
تھے کہ وہ ہم تینوں بہنوں کی شادی کر دیں گے۔ ادھر نزہت کے گھر بھی اس کی شادی
کا چرچا ہو گیا ہے۔ توبہ! ان گھر والوں کو بس اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں اس لئے
نہیں گھبراتی کہ یہ لوگ میری مرضی کے خلاف شادی کر دیں گے۔ تم اس کی فکر نہ کرو یہ میری
مرضی کے خلاف کچھ نہ کریں گے۔ میں محض اس وجہ سے اداس ہوں کہ اب یہ ماحول میرے
لئے دن بدن تلخ ہو رہا ہے۔ اگر انہوں نے میرے وقار کو ملحوظ خاطر نہ رکھا اور میری
عزت نہ کی اور مجھ سے پیار کرنا چھوڑ دیا تو میں یہاں کبھی نہ رہوں گی۔ خوشی اور غم بہت
حد تک ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور ماحول انسانوں سے بنتا ہے۔ اگر انسان اچھے
ہوں گے تو ماحول بھی خوشگوار ہوگا اور یقیناً ہر طرف مسرت ہوگی۔ اور اگر انسان ہی
اچھے نہ ہوتے تو ماحول کیا خاک اچھا ہوگا؟

میں نے سارے گھر والوں سے لڑائی کر لی ہے۔ مجھے ان سب سے نفرت ہے۔
یہ قالینوں اور صوفوں پر بیٹھ کر کھوکھلے قہقہے لگانے والے کسی کی آنکھوں میں رکے ہوئے
آنسوؤں کے درد کو نہیں پہچان سکتے۔ میں جتنی دیر اس گھر میں رہوں گی بڑی خاموش

زندگی گذاروں گی۔ سارا وقت میں اپنے اوپر والے کمرے میں رہوں گی۔ ان نوں
کی تم بھی ڈائری لکھنا اور میں بھی لکھوں گی۔۔۔۔ اچھے منصور! جب میں انتہائی
غمگین ہو جاؤں تو پھر تم مجھے بے حد یاد آتے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہارے
بازوؤں میں چھپ کر اتنا روؤں، اتنا روؤں کہ میرا سارا غم بہہ جائے اور میری
ساری اداسی دور ہو جائے۔ میں اس وقت بھی اداس ہوں اور مجھے تمہارا خیال آ رہا
ہے۔ میں ایسے عالم میں ہوں جہاں ہر سمت اداسیوں کے کھنڈرات سلسلہ در سلسلہ
پھیلتے چلے گئے ہیں۔ جہاں کوئی آواز نہیں، کوئی گیت نہیں، کوئی زندگی نہیں، بس
اداس خموشی مسلط ہے۔ وادیوں کے پرندے گنگ ہیں اور چشموں کی آواز ڈوب گئی
ہے اور میں سر جھکائے تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔

منصور! میں تمہیں کبھی پریشان اور دکھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں تمہاری خوشی اور
آسودگی کے لئے ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے قبول کروں گی اور چاہے میرے گھر
والے مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں میں تمہارے سوا کبھی کسی دوسرے کو اپنا شریکِ حیات
نہ بناؤں گی۔ منصور۔۔۔ اگر تمہاری زندگی میں کنیز کا غم نہ ہوتا وہ تمہیں یوں مجبور اور
بے سہارا نہ چھوڑ گئی ہوتی تو ہو سکتا تھا کسی وقت مجھے اپنی محبت کو کچل کر والدین کے
آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا خیال آ جاتا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں غمزدہ دیکھنا
نہیں چاہتی۔ تم یقین کرو منصور! میرا دل تمہیں پریشان دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ اگر
محبت کی کوئی قدر مقرر ہوتی تو میں تمہیں بتاتی کہ میں تمہیں کتنی شدت سے چاہتی ہوں

جب میں تمہیں اپنی زندگی سے نکال دیتی ہوں تو مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

منصور! ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ ہمارے ذہن ایک ہیں، دل ایک ہیں، نظریے ایک ہیں اور پسند ایک ہے۔ اس دن مجھے تمہاری کاپی میں فیض کی چار نظموں کو نقل کیا ہوا دیکھ کر بے انتہا تعجب ہوا تھا یقین کرنا منصور! آج سے چار سال پیشتر میں نے بھی یہی نظمیں پسند کرنے کے بعد اپنی کاپی میں نقل کی تھیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے منصور! ہم دونوں یقیناً ایک دوسرے کے لئے تھے۔ جب ہی تو ہم ایک دوسرے کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتے رہے اور بڑی ہمت شکن تلاش کے بعد ایک دوسرے کو ملے۔ میں تمہیں اسی شدت سے چاہتی رہوں گی ہمیشہ چاہتی رہوں گی۔ میری محبت کبھی نہیں بدل سکتی۔ اس میں کبھی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن منصور! کیا تم بھی مجھے اسی طرح چاہتے رہو گے نا؟ تم کہا کرتے ہو کہ میں وحشیوں کی طرح محبت کیا کرتا ہوں۔ میرا پیار وحشی ہے اور میری روح کا ذرہ ذرہ خوشی سے رقص کرنے لگتا ہے۔ مجھے وہ شخص ہمیشہ سے پسند ہیں جو بہادر ہوں، طاقتور ہوں، غیور رہوں اور وحشیوں کی طرح پیار کریں۔ یعنی جب کسی کو چاہیں تو زندگی کے آخری لمحوں تک چاہتے رہیں۔ مجھے بزدل مردوں سے سخت نفرت ہے۔ جس مرد کی محبت میں طوفانوں کی تندی اور آگ کے شعلوں ایسی تڑپ نہ ہو وہ عورت کا دل نہیں جیت سکتا۔

منصور! میں تمہیں ہمیشہ اسی طرح بہادر اور وحشی دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سمندروں... طوفانی سمندروں میں کود پڑو۔ سنگلاخ چٹانوں کے سینے چاک

گرد دمگر مجھے ترک کرنے کا خیال کبھی اپنے دل میں نہ لاؤ منصور! مجھے طاقت سے بھرپور چیزیں بے حد پسند ہیں۔ جیسے یہ موٹر سائیکل ——— جی چاہتا ہے کہ اس پر بیٹھ جاؤں اور اتنی تیز چلاؤں کہ ہوا سے باتیں کرنے لگوں۔ سرکش گھوڑوں کی سواری کے لئے میرا دل ہمیشہ مچلتا ہے۔ ایسے گھوڑے جن کی گردنیں ہمیشہ تنی رہتی ہیں اور رجو آنکھ کا اشارہ پاکر طوفان کی طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے ضدی، وحشی اور سرکش چیزیں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ ضدی اور وحشی لوگ بڑے ذہین ہوتے ہیں اور منصور! جب میں تمہارے پاس ہوتی ہوں ناں تو مجھے دنیا کی ہر شے ہیچ دکھائی دیتی ہے۔

لیکن منصور! اگر کوئی ایسی بات ہوگئی کہ میرے گھر والوں نے زبردستی میری کسی اور جگہ شادی کردی یا میرے انکار کی صورت میں انہوں نے مجھے صدمہ پہنچایا تو پھر میں خاموشی سے مر جاؤں گی، اور میرے لئے اس موت سے بڑھ کر اور کوئی شے اتنی سعادت مند نہیں ہے جسے میں تمہاری خاطر قبول کروں۔ میں جانتی ہوں۔ مرنا بہت مشکل ہے اور مرتے وقت نہ جانے میری یہ خواہش کس قدر شدید نہ ہوگی کہ تمہاری گود میں سر رکھ کر جان دوں سو دیکھو اپنی موت کے خیال سے میری آنکھوں میں کتنے آنسو آ گئے ہیں۔ مجھے اپنی موت کو یاد کر کے بڑا رونا آیا کرتا ہے۔ مجھے اپنی زندگی بے حد عزیز ہے۔ میں نے ابھی خوشی کا وقت ہی کیا دیکھا ہے؟ پھر یونہی روتے روتے کیسے مر جاؤں؟ لیکن منصور! میں اگر تمہارے لئے مر گئی تو کیا تمہیں بھی صدمہ ہوگا؟ اگر ہوگا تو پھر میں موت قبول نہیں کروں گی۔ میرے بعد تمہیں اتنی محبت کرنے والی لڑکی کہاں

ملے گی؟ کیسے ملے گی؟ میں ضرور زندہ رہوں گی اور گھر والوں کا بڑی سختی سے مقابلہ کروں گی۔ پھر جو ہو سو ہو۔ میں کیوں بزدل لڑکیوں کی طرح آنسو بہاؤں اور چپ چاپ مر جاؤں؟ محبت انسان کو بزدل نہیں بہادر بنایا کرتی ہے۔ اور منصور میں تمہیں چھوڑ دینے اور تم سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے اپنی ساری زندگی تمہارے قدموں پر رکھ دی ہے۔ میرا سب کچھ تم ہی ہو۔ اور جب میں یہ خیال کرتی ہوں کہ تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ہو جاؤ گے تو میں پاگل سی ہو جاتی ہوں۔ اور چونکہ رونے پر ہی میرا اختیار ہے اس لئے رو دیتی ہوں۔ منصور! تم میرے لئے کیا ہو؟ یہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ لیکن منصور اگر کبھی تمہارا دل لالہ سے اکتا جائے تو تم لالہ کا خیال نہ کرنا بلکہ اپنے دل کی خوشنودی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے چھوڑ دینا۔ منصور! میں کچھ تمہیں نہیں لکھ سکتی جو میں لکھنا چاہتی ہوں۔ میرا ذہن اس وقت عجیب عالم میں ہے۔ اگر تم مجھے چھوڑنا چاہو گے تو بے شک چھوڑ دینا۔ مگر تمہیں نہیں معلوم کہ پھر میرا کیا حال ہو گا۔ میں گر پڑوں گی منصور! اور ایسا گروں گی کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکوں گی۔

میرے پیارے دوست! تمہارے الفاظ، تمہاری سوچ اور تمہارے عزائم میرے لئے زینے کی حیثیت رکھتے ہیں اسی لئے میں ان پر فوراً عمل کرتی ہوں۔ کیونکہ یہی وہ زینہ ہے جس پر چڑھ کر میں بلندیوں کو چوم سکتی ہوں اور تمہاری محبت اسی زینے کے دو بازو ہیں۔ ہمیں انہیں ہر طرح سے مضبوط رکھنا ہو گا

اگر ہم دونوں میں سے کسی کے پاؤں میں بھی لغزش آگئی تو منصور! میں ضرور جہنم
کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گر پڑوں گی۔ پھر ہم بہت جلد بدنام ہو جائیں گے۔
خدا کے لئے تم مجھے وہ تمام باتیں بتا دو جن پر عمل کر کے میں بدنامی کے اژدہا
سے بچ سکتی ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ان باتوں پر ضرور عمل کروں گی خواہ
مجھے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ ہمارے پیار کے شعلے چپ
چاپ، خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب لپکتے رہیں گے۔ ایسے شعلے جن میں
شبنم کی ٹھنڈک اور پھولوں کی ملائمت مہک رہی ہوگی۔ اگر بدنامی کا سیلاب
ہم کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے بے تاب ہوگا۔ تو ہم کبھی اتنے بے چین نہیں ہوں گے
ہم دور رہ کر بھی ایک دوسرے کے قریب رہ سکتے ہیں۔ یہ شعلے اسی طرح لپکتے
رہیں گے اور ان کی تیزی، تڑپ اور حرارت کو کبھی کوئی ختم نہ کر سکے گا۔ پھر ہماری
محبت کو کوئی بدنام نہ کر سکے گا۔ ہماری محبت جو گل کے سینے میں مہک بن کر پوشیدہ
ہے اسے کوئی پریشان نہ کر سکے گا۔ ہمارا یہ عروسی خواب کبھی نہیں دھندلائے گا۔
ہماری محبت گلاب کے شگوفوں ایسی نازک اور تر و تازہ ہے اور اسے خزاں
کے بے رحم ہاتھ کبھی نہ چھو سکیں گے۔ اب ہم احتیاط سے کام لیں گے اور زیادہ
جذباتی نہیں بنیں گے۔ مگر منصور! تم مجھے مہینے میں ایک خط تو ضرور لکھو گے نا؟ تمہارے
خط مجھے بڑی تسکین دیا کرتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر میں ستاروں کی دنیا میں پہنچ جاتی
ہوں۔ تمہارے قلم میں میرے لئے خوابوں کی دنیا پوشیدہ ہوتی ہے۔ کاغذ پر جھکی

ہوتی تمہاری نظریں اور الفاظ میں ڈوبے ہوئے سانس مجھے تمہارے بالکل پاس لا کھڑا کرتے ہیں۔ رات میں نے تمہارے سارے خطوط پڑھ ڈالے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سارے خط کسی حسین ترین کہانی کے ٹکڑے ہیں جو چاندنی اور نغمات کی دنیا سے آئے ہیں۔ پھر میں تمہیں شدت سے یاد کرتی رہی اور میرے پیار کے شعلے خاموشی سے تمہاری جانب لپکتے رہے۔ تمہاری محبت نے میرے دل کو جو درد عطا کیا ہے میں اس کی نگہداشت کروں گی۔ میرا دل پہاڑ پر گرنے والی برف کی مانند پاکیزہ ہے جس کے اوپر تمہاری محبت کا روشن ستارہ چمک رہا ہے۔ میں اپنے دل کو اسی طرح پاکیزہ اور نیک رکھوں گی تاکہ تمہاری محبت کا ستارہ اسی طرح چمکتا رہے۔

ہر روز رات کو میں پچھلے پہر محض چاندنی کا نظارہ کرنے کے لئے بیدار ہو جایا کرتی ہوں لیکن رات جبکہ میرا دل تمہاری یاد میں بے چین تھا چاندنی کتنی پھیکی اور پژمردہ تھی! میں اس تغیر پر حیران رہ گئی۔ نہ جانے بادل کہاں چلے گئے ہیں، بادل کب آئیں گے منصور؟

تمہاری اپنی
لالہ رُخ

میرے پہاڑوں کی روشنی! میری لالہ!!

اپنی کوٹھی میں واپس آنا مبارک ہو۔ کل کی ملاقات کتنی خوبصورت تھی! کل ہم کتنے ہی دنوں کے بعد ملے تھے۔ کل کا دن ایک شیریں خواب کی مانند گذر گیا ہے۔ میں تو ابھی تک کل کے دن میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہاری گردن کا تِل چومتے ہوئے کہا تھا کہ وقت ہمارے اوپر سے گذر رہا ہے اور ہم اس کی زد سے محفوظ ہیں۔ گویا کسی پل کے نیچے بیٹھے ہوں۔ میں ابھی تک اسی پل کے نیچے بیٹھا ہوں اور میرے ہونٹ تمہاری گردن کے تِل پر ہیں اور میرے ذہن میں ایسی مہک ہے جو چاندنی راتوں میں کھلنے والے کنول کی پتیوں سے اٹھا کرتی ہے۔
تمہارا ذہن اتنا کاروباری کیسے بن گیا ہے لالہ؟ کل تم میرا بار بار منہ چومنا گن کیوں رہی

نہیں، پاگل لڑکی! ابھی کسی نے ستارے بھی گنے ہیں! کل تمہارے ہونٹوں کو چومتے ہوئے
میں کئی بار ان جنگلوں میں نکل گیا جہاں پہنچ کر بہار رک جاتی ہے اور چشمے گیت گا گا کر
بہتے ہیں اور کلیاں آنکھیں کھولتے ہی پھول بن جاتی ہیں۔ جہاں سورج کا مسکن ہے
اور جہاں اندھیری راتوں کو چاند نرگس کے زرد بستر پہ آرام کرتا ہے۔ کاش میں نکہت و نور
کی اس سرزمین سے کبھی واپس نہ آتا۔ تمہاری ابریشمی گردن کی ملائم حدت سے میری محبت
کا چہرہ لال ہو گیا تھا اور اس کی رگوں میں بہار کا تازہ خون گردش کرنے لگا تھا۔ میں
ابھی تک تمہارے شبنمی ہونٹوں کو چوم رہا ہوں اور تمہارا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔
کل جب میں تم سے ملنے آیا تو میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ لیکن تمہارے
خیال میں یوں چلا جا رہا تھا جیسے اس بازار کی آدھی دوکانیں میری ہوں۔

اچھی لالہ! گھر میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں پہ اپنے دل کا سکون
برباد نہ کیا کرو۔ آخر کرنا تو تمہیں وہی ہے جسے تمہارا دل چاہے گا تو پھر خواہ مخواہ پریشان
ہونے سے فائدہ؟ پریشان تو وہ ہوتا ہے جو یا تو بے وقوف ہو اور یا جس کے
ضمیر میں کوئی کانٹا کھٹک رہا ہو۔ تم تو عقلمند ہو اور تمہارا ضمیر بھی صاف ہے۔
تمہیں تو ایسی باتوں سے بلند ہونا چاہیئے۔ دیکھو ـــــ موتیے کے پھولوں کو دیکھو!
پہاڑوں پر نگاہ ڈالو، سمندر میں چپ چاپ کھڑی چٹانوں کو دیکھو! کبھی ان کے سکون
میں بھی فرق آیا ہے؟ روشن ضمیر انسان کبھی پریشان نہیں ہوتا اور جب وہ پریشان
ہوتا ہے تو اس کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے ایک عالم پریشان ہو جاتا ہے۔ پھر

لڑائی جھگڑے، یہ جھوٹی عزتوں اور جھوٹے وقار کی جھک جھک، یہ مالی پریشانیاں ــــــ یہ سب گذرتے بادلوں کے سائے ہیں۔ ایک طرف سے آتے ہیں اور دوسری طرف کو نکل جاتے ہیں۔ جس دَور میں سے آج کل میں گذر رہا ہوں بڑا منتشر کرنے والا دَور ہے۔ مگر میں نے اپنے ذہنی سکون کو کبھی تلف ہونے نہیں دیا۔

پس تم بھی دھوپ میں مسکراؤ اور سائے میں مہک دو۔ دنیا کے جھگڑے جائیں جہنم میں۔ جب تم گھر سے جھگڑ کر آئی تھیں تو اس وقت اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اگر تم باہر باغ میں آکر درختوں کا مشاہدہ کرتیں تو تمہیں محسوس ہوتا کہ ان کا سکون کس قدر زندگی خیز ہے۔ درخت واقعی عظیم ہیں لالہ! وہ ہمیں ضبط و تحمل سے موسموں کے اثرات قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور اسی میں زندگی کی نشوونما کا راز پنہاں ہے۔

آج میں جن حالات میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ یہ میری زندگی میں زہر گھول رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں زندگی کے اس تاریک پہلو سے بھی روشناس کرا دوں تاکہ تم دیکھ سکو کہ ایک طرف اگر بازار جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں تو دوسری جانب گلیاں سنسان ہیں اور اندھیروں کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ پھر سوچتا ہوں کہ خواہ مخواہ تمہارے شگفتہ موڈ پر افسردگی کی راکھ کیوں بکھیروں۔ یہی بہتر ہے کہ تم ان سنگین حقائق سے دور رہو۔

آؤ شاداب مرغزاروں اور چاندنی راتوں کا ذکر کریں۔ تاج محل کی بیبر ٹیوں

پر بیٹھ کر چمڑے کے مال گودام کا نقشہ تیار کرنا بڑی احمقانہ بات ہے۔ میرے نزدیک اس سے بڑھ کر تاج محل کی توہین نہیں ہو سکتی۔ تاہم کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ خدا نے اگر میرے سینے میں یہ شعلہ روشن کرنا ہی تھا تو وہ ماحول کیوں چھین لیا جو اس کی تہذیب و تدوین کے لئے ضروری تھا؟ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک آدمی کو اڑنے کی طاقت عطا کرنے کے بعد اُسے مجبور کیا جائے کہ وہ صرف زمین پر چلے۔ میں تمہیں سگریٹ پیش کر دوں اور اسے سلگانے کے تمام ذرائع تم سے چھین لوں، اور پھر ایک طرف ہٹ کر تمہاری بے بسی کا تماشہ دیکھوں۔ کاش مجھے کوئی یقین دلا سکے کہ میرا اس ماحول میں جنم لینا حادثہ نہیں واقعہ ہے اور میرا یہاں رہنا اشد ضروری ہے کسی وقت جب میں الگ ہٹ کر سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ اس طرف کیسے نکل آیا؟ مجھے سبھی چہرے اجنبی دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ابھی ان میں سے کوئی میری جانب تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھے گا۔

"آپ کون ہیں؟"

تم اس شخص کی کم نصیبی کا اندازہ نہیں لگا سکتیں جو اپنے ماحول میں اجنبی ہو۔ جو اپنے ہی کمرے میں یوں رہ رہا ہو گویا کسی سرائے میں اترا ہے اور قافلے کا انتظار کر رہا ہے۔ اچھی لالہ! میں وہ بیل ہوں جو خاردار تاروں پر چڑھا دی گئی ہے۔ وہ چشمہ ہوں جو پہاڑ کی تاریک گھاٹی میں پھوٹتا ہے جس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا ہے لیکن جہاں جنگلی ریچھ اپنے گندے پاؤں دھرتے ہیں۔ جہاں کبھی سورج کی کرن نہیں چمکی اور

جہاں سے کبھی کوئی نیک دل مسافر نہیں گذرا۔ اگر میں اس ماحول میں جنم لے سکتا ہوں تو نیم کا درخت آموں کی فصل دے سکتا ہے اور مے خانوں میں اذانیں دی جاسکتی ہیں اور مچھلی دریا کے باہر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔

لیکن چھوڑو۔ میں آج کیسی باتیں لے بیٹھا ہوں۔ میرے لئے ہر ماحول ساز گار ہو سکتا ہے۔ مجھے ہر ماحول میں اس ننھی سی جوت کی نگہداشت کرنی ہے جو میرے دل میں روشن ہے۔ میری تخلیق میں جو چھوٹا سا مقصد پنہاں ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ میں اس محفل میں ایک پیام لے کر آیا ہوں۔ جب تک وہ پیام پہنچا نہ دوں گا زندگی کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ میں اس وقت تم سے دل کی گہرائیوں میں ہمکلام ہوں۔ تم میرے بہت ہی قریب آگئی ہو۔ میرے دل کی پوشیدہ کمین گاہ تک پہنچنے والی تم پہلی اور آخری لڑکی ہو اور میں تم سے الگ ہونا کبھی گوارا نہ کروں گا۔

تنہائی اور یکسوئی کے لمحات میں ایک چمک سی میری آنکھوں میں لہرا جاتی ہے میں ٹھٹھک سا جاتا ہوں اور روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ قدرت مجھ سے کوئی اہم کام لینا چاہتی ہے۔ مجھے اس وقت کا صبر کے ساتھ انتظار کرنا ہوگا۔ جب خدا کی طرف سے اشارہ ہو اور میں اس محفل میں وہ گیت پیش کروں جو میں نے بھی ابھی تک نہیں سنے۔ مجھے اس مقصد کی تکمیل میں ایک ساتھی کی ضرورت تھی اور وہ مجھے مل گیا ہے۔ وہ تم ہو لالہ —— صرف تم! شائد ہماری تخلیق میں ایک ہی ستارہ کارفرما ہے۔ اچھی لالہ! مجھ سے ایسی باتیں منسوب نہ کرو جن کا اس زمین کے ساتھ

کوئی تعلق نہ ہو۔ اور محبت ہونٹوں، رخساروں، آنکھوں اور گردن کے تل کے لئے ہی نہیں کی جاتی۔ یہ تو محبوب کی پوری شخصیت میں مدغم ہوتی ہے شخصیت ـــــ جو روح اور مادے کا اجتماعی تاثر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا زندگی گذارنے کا انداز انتہائی ماڈرن اور سائنٹفک ہے لیکن محبت کے معاملے میں، میں بے حد قدامت پرست ہوں۔ میری محبت، رومیو، انطنی اور پیرس کی محبت ہے۔ میں تمہیں اسی طرح محبت کرتا ہوں جس طرح بہادر اپنی تلواروں سے، مسافر درختوں سے اور چرواہے چشموں سے محبت کرتے ہیں۔ تم ہی میری تلوار، میرے درخت کی چھاؤں اور میرا چشمہ ہو۔ پھر میں یہ کیونکر گوارا کر سکتا ہوں کہ میرا درخت ٹوٹ جائے، میرا چشمہ گدلا ہو جائے اور میری تلوار زنگ آلود ہو جائے۔ میں تو پچھلے پہر کی تازہ ہوا ہوں جو اوس میں بھیگی ہوئی کلیوں کا منہ چوم کر گذر جاتی ہے۔

میں نے تمہاری عدم موجودگی میں ڈائری لکھتے رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور کل بھی تم مانگ رہی تھیں۔ دراصل میں محض اس لئے کل ساتھ نہیں لایا تھا کہ وہ غیر مکمل ہے۔ میں صرف دو تین دن لکھ سکا ہوں۔ تمہارے اصرار پر اسی خط میں اُسے نقل کئے دیتا ہوں۔

۱۳ دسمبر ـــــ

لالہ شہر والے مکان میں جا چکی ہے۔ کئی روز تک فون پر اس کی آواز نہ سن سکوں گا۔ کل شہر میں کوئی جشن منایا جا رہا ہے۔ میں بڑا اداس ہوں۔ رات گیارہ بجے

گرین وڈ ٹی ہاؤس آیا تو کلیم صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ کھانا ہم نے مل کر کھایا۔ چائے پیتے ہوئے ہم بارہ ساڑھے بارہ بجے تک لالہ کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ کلیم صاحب کہہ رہے تھے۔

"اب اگر قدم اٹھا ہے تو پیچھے نہیں ہٹنا چاہیئے۔ اب بھی وقت ہے اگر آگے چل کر تم کو بچھڑ ہی جانا ہے تو یہیں سے واپس ہو جاؤ"

میں نے کہا کہ لالہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ وہ بڑی انقلاب پرور لڑکی ہے۔ وہ خاموش رہ کر اپنی دنیا اجڑتے نہیں دیکھ سکتی۔ انہوں نے کہا:

"ایسا ہوگا مگر لڑکیاں عام طور پر رو دیا کرتی ہیں"

ایک بجے کے قریب ہم ٹی ہاؤس بند کر کے باہر نکلے۔ رات بڑی خوبصورت تھی۔ میں راستے میں لالہ کے متعلق سوچتا رہا۔ پہلے میں نے دیکھا کہ اس کی شادی مجھ سے ہو رہی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ دولھا بنا ان کے گھر جا رہا ہوں شہنائیاں بج رہی ہیں۔ ڈھولکیں دھمک رہی ہیں۔ لالہ کو دلھن بنایا جا رہا ہے۔ رضیہ اور ثریا اس پر شمع پروانوں کی طرح فدا ہو رہی ہیں۔ اسکی سہیلیاں اسے چھیڑ رہی ہیں اور گیت گا رہی ہیں۔

کھٹے چھل نے گگراں دے

رب ساڈا میل کیتا
ہن کدے وی نہ وچھڑاں گے

اور پھر میں نے اپنی جگہ ایک اور آدمی کو دیکھا۔ لالہ کسی اور سے بیاہی جا رہی تھی۔ وہ گہنے میں لدی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔ اس کا رنگ زرد تھا اور اس کے ہونٹ خشک تھے اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک طرف دیکھ رہی تھی اور سہیلیاں گیت گا رہی تھیں۔

آسمانیں اِل ماہیا

لوکاں دیاں رون اکھیاں

ساڈا روندا ای دل ماہیا

میں اس تصویر سے کانپ اٹھا اور سر جھٹک کر جلدی جلدی گھر کی سمت چلنے لگا۔ لالہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ وہ بڑی مضبوط اور بے باک ہے۔ وہ حالات کی نزاکت کے آگے یوں آسانی سے سپر انداز نہیں ہوگی۔ میں گھر پہنچ کر فوراً سو گیا۔ صبح سیر کے لئے کھیتوں میں نکل گیا۔ چاند رات تین بجے کے قریب نمودار ہوا تھا اور افسردہ سی چاندنی میں کھیتوں پر پھیلی ہوئی دھند چمک رہی تھی۔ سردی کافی تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ فضا میں شبنمی گھاس کی مہک تھی۔ ایک جگہ میں نے گیندے کے گیرو پھولوں کی چھوٹی سی کھیتی دیکھی۔ پھولوں پر زرد زرد شبنم جمی ہوئی تھی۔ میں نے جھک کر انہیں آنکھوں سے لگایا اور مجھے لالہ کے لمبے بالوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا خیال آ گیا۔

۱۵ دسمبر

سارا دن شہر میں خوب گہما گہمی رہی۔ شام کو بازار روشنیوں سے جگمگا اٹھے۔

رات بارہ بجے تک اپنے دوستوں کے جمگھٹے میں رہا۔ کبھی مال، کبھی انارکلی، کبھی راوی اور کبھی شالامار ——— خوب سیریں کیں۔ لالہ کا دھیان کئی بار آیا اور مجھے عین محفل میں اداس کر کے چلا گیا۔ اس وقت میں گھر پہ تنہا ہوں اور لالہ کی جدائی کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ وہ اس وقت اپنے مکان کی دوسری منزل والے کمرے میں سو رہی ہو گی اور اس کے ہونٹ ذرا سے نیم وا ہوں گے اور دانتوں کی سپید لکیر چمک رہی ہو گی۔ معصوم چہرے پر پُرسکون آسودگی ہو گی اور شائد خواب میں وہ صندل کے جنگلوں میں نسیم سحر کے ساتھ شاخ در شاخ لہرا رہی ہو۔ نیکی اور حسن کے دیوتا اس کی حفاظت کریں۔ کل بھی وہ مجھ سے فون پہ بات نہ کر سکے گی۔ کل کا دن بھی گذر جائے گا۔

۲۰ دسمبر ———

لالہ سے ملے، اسے دیکھے اور اس کی پیاری آواز سنے بغیر یہ دن کچھ یوں گذر گئے ہیں جیسے رنگین تصویروں کا البم دیکھتے دیکھتے درمیان میں اچانک کچھ سادہ ورق آ گئے ہوں۔ جیسے سینما دیکھتے ہوئے ایکا ایکی فلم ٹوٹ گئی ہو۔ شام کو میں بالکل اکیلا سیر کے لئے نکل گیا۔ ہلکی بارش کے بعد چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی اور موسم ایک دم خوشگوار ہو گیا تھا۔ سارے باغ میں نکھری ہوئی سبز سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کاش لالہ بھی میرے ہمراہ ہوتی۔ پھر یہ سیر کس قدر لطف انگیز ہوتی۔ غروبِ آفتاب سے پہلے کی نارنجی چمک جب لالہ کے چہرے پر پڑتی تو وہ کتنا دلکش ہو جاتا۔

چڑیا گھر میں عورتوں کا شو تھا۔ اندر ہر طرف عورتیں ہی عورتیں تھیں اور باہر مرد ہی مرد۔ عورتیں جانوروں کو دیکھ رہی تھیں اور مرد عورتوں کو تک رہے تھے گہرے سبز پانی میں سپید اور کالی بطخیں تیر رہی تھیں اور جھاڑیوں کے درمیان اندھیرا گھرا ہوا تھا۔ ایک عورت عینک لگائے کھڑی تھی اور بڑے غور سے بندر کو اچھل کود کرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی پتلے ناک والی خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس خوبصورت لڑکی نے جیب سے رومال نکالا اور بڑے زور سے ناک صاف کرنا شروع کر دیا۔ جیسے گھر کا غسل خانہ صاف کر رہی ہو ——— ! یہ خوبصورت لڑکیاں اس طرح ناک کیوں صاف کرتی ہیں ؟ ———،

ابھی لالہ! بس میں یہاں تک ہی ڈائری لکھ سکا تھا۔

اس وقت رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ میں اپنے کمرے میں لیمپ کی مدھم روشنی میں لحاف اوڑھ کر بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ باہر ——— بند کھڑکی کے شیشوں سے باہر سرما کی زرد چاندنی خنک ہوائیں اڑی جا رہی ہے۔ اس وقت دل پر بڑی مہربان سی اداسی چھا رہی ہے۔ میرا دل بے اختیار ہو کر تمہیں یاد کر رہا ہے اور تمہاری یاد مجھے ایک پرانے کشمیری لوک گیت کی یاد دلا رہی ہے۔ یہ گیت ننہال اور بٹوت کے درمیانی کہساروں میں عام گایا جاتا ہے۔ میری نانی کے ماں باپ اسی علاقے میں کہیں رہا کرتے تھے۔ یہ گیت میری ماں کو زبانی یاد ہے۔ میں نے سنا ہے کہ دیوندر ستیارتھی نامی کسی افسانہ نویس نے اپنی لوک گیتوں کی کتاب میں یا ننہال کے

علاقے کا ذکر کرتے ہوئے اس گیت کو بھی قلم بند کیا ہے۔ میں اسے کشمیری زبان میں لکھنا چاہتا ہوں مگر شاید تم اس کا لطف نہ اٹھا سکو۔ تمہیں اس کا ترجمہ سناتا ہوں گیت یوں ہے۔

——— آرو (آڑو) کے پھولوں میں تمہیں تلاش کروں گی

کیا تم ملو گے نہیں؟

جہلم نالے کے پانیوں میں تمہیں تلاش کروں گی۔

کیا تم ملو گے نہیں؟

خوبانی کے پیڑوں میں تمہیں تلاش کروں گی۔

کیا تم ملو گے نہیں؟

میرے بالوں میں چنبیلی کے پھول ہیں

میرے پاؤں پر راستوں کی گرد ہے

کیا تم ملو گے نہیں؟ ———'

لالہ! شاید یہ کسی کنواری کا گیت ہے جس نے دیکھا ہے کہ بہار آگئی ہے۔ آرو اور چنبیلی کے پھول کھل گئے ہیں اور جہلم نالے کے پانی میں تیزی آگئی ہے اور خوبانی کے پیڑوں پر شگوفے پھوٹ پڑے ہیں لیکن اس کا محبوب ابھی تک اسے ملنے نہیں آیا اور وہ بالوں میں چنبیلی کے پھول سجا کر اپنے محبوب کی تلاش میں دشوار گذار راستوں پر چل نکلتی ہے ——— کشمیر کی یہ مجبور دختر دہقان اپنے محبوب کی جستجو

میں سالہاسال سے سرگرداں ہے۔ کیا خبر وہ اپنے محبوب سے کب ملے اور کہاں ملے!

رات تم نے ریڈیو پر وہ ریکارڈ سنا تھا؟ سانجھ کی بیلا ـــ پنچھی اکیلا! شاید تمہیں پسند نہ آیا ہو لیکن مجھے یہ ریکارڈ بہت پسند ہے۔ اس ریکارڈ کے ساتھ میری سنگاپور کی خوبصورت ترین یادیں وابستہ ہیں۔ یہ گیت مجھے بیخود سا کر دیتا ہے۔ رات بھی کلیم صاحب کے پاس بیٹھے بیٹھے جب یہ گیت شروع ہوا تو میں اس کے پہلے بول کے ساتھ ہی سنگاپور نکل گیا جہاں تیز بارش میں گھنے درختوں تلے پانی ٹپک رہا تھا اور میں برساتی اوڑھے ایک فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ مجھے کبھی کوئی عورت ملتی جس نے زرد کیلوں کا گچھا اٹھایا ہوتا اور یا کوئی لڑکی جو انناس کے سنہرے رس بھرے قتلے بیچ رہی ہوتی۔ میرے اوپر درخت پانی ٹپکا رہے تھے۔ میرے سر کے بال بھیگ رہے تھے اور چہرے پر انجانی مسرت کی چمک تھی اور میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ دھوئیں، دار بارش میں یہ کیلے کے زرد پودوں اور انناس کے سنہرے قتلوں کے قریب سے ہو کر گزرنے والا راستہ کبھی ختم نہ ہو۔ مگر ریکارڈ ختم ہو گیا اور کلیم صاحب کہہ رہے تھے۔ "اب مسئلہ کشمیر پر جو سراوون ڈکسن نے ......"

ہائے کہاں سنہری انناس اور کہاں سراوون ڈکسن! کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی! ـــ باہر چاندنی کا رنگ آہستہ آہستہ نیلگوں ہو رہا ہے۔ جوں جوں رات گہری ہو رہی ہے چاندنی نکھرتی جا رہی ہے اور نیندیں گہری ہو رہی ہیں۔ اس وقت

باغوں میں اوس گر رہی ہوگی اور شگفتہ پھول بن رہے ہوں گے۔ درختوں کے نیچے چاندنی اور اندھیرا بانہوں میں بانہیں ڈالے سو رہے ہوں گے۔ اٹھو لالہ! اس وقت محبت کے تمام سُر جاگ اٹھے ہیں اور میرا دل بھی ایک گیت ہے، ایک سُر ہے۔ آؤ چاندنی کی سیج پر چپ چاپ بیٹھ جائیں اور اس کی پراسرار نیلی چمک میں کوئی بات نہ کریں۔ کیونکہ بات کرنے سے اوس کے موتی ٹوٹ جائیں گے اور پھولوں کی آنکھ کھل جائے گی اور ــــ

یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تمہارا اپنا

منصور

پت جھڑ

او گرنے والے زرد پتو!
او درختوں کے آنسوؤ!
مجھے بھی اپنے غم میں شریک کرو
میں بھی زرد پتّا ہوں
میں بھی ایک آنسو ہوں،

غالباً شروع جنوری کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ میں کاؤنٹر کے پاس کھڑا پیسٹری
ار رہا تھا کہ نزہت کا فون آیا۔ پہلے اس نے منصور کا پوچھا اور پھر ادھر ادھر کی
یں شروع کر دیں۔ منصور ابھی دفتر سے نہیں آیا تھا۔ میں نے لالہ کا پوچھا تو اس نے
ے خفیف طنزیہ لہجے میں بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی منصور کو خط لکھ رہی ہے۔
یں ذرا چونک کر کاؤنٹر پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس خفیف طنزیہ لہجے میں آنے والے کسی
رناک طوفان کی پہلی گرج سنائی دی۔ یہ گرج اتنی خفیف اور ہلکی تھی کہ مجھ ایسا تجربہ کار
دمی بھی اسے بمشکل سن سکا۔ نزہت کے متعلق میرے تاثرات منصور سے بالکل
سلف اور متضاد تھے۔ میں اسے صرف دو تین بار ملا تھا اس دوران میں میں نے
اس کے باتیں کرنے، خاص انداز سے آنکھیں بند کرنے اور پھر کھولنے اور اٹھنے بیٹھنے

کے انداز سے اپنے دل میں ایک خاص رائے قائم کر لی تھی جسے میں نے لالہ یا
منصور پر ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا تھا۔ لالہ اسے اپنی بہترین سہیلی سمجھتی تھی اور
منصور اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔ دوسری طرف اپنی رائے کی تصدیق کے لئے
میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نزہت کے معاملہ میں بالکل خاموش
تھا اور وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ کسی وقت جب میں نزہت کو لالہ کی دوستی اور اس
کی تعریف میں فخریہ انداز میں باتیں کرتا دیکھتا تو میرے شبہات کی بنیادیں بھی متزلزل
سی ہو جاتیں اور ایک لمحے کے لئے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ کہیں میں نزہت
کے متعلق ذہن میں ایسے خیالات رکھ کر اس کے ساتھ زیادتی تو نہیں کر رہا۔ اس کے
باوجود جیسے کوئی غیبی آواز میرے کانوں میں آہستہ سے کہتی کہ نزہت کی باتیں خلوص
سے خالی ہیں اور مجھے ان پر شک کی نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ منصور کی زندگی میں اب تک
صرف دو ایک لڑکیاں ہی داخل ہوئی تھیں اور یہ وہ لڑکیاں تھیں جنہوں نے کبھی گھر
سے باہر قدم نہیں رکھا تھا کبھی کسی کو فون نہیں کیا تھا اور کبھی کسی غیر آدمی سے بات
کی تھی۔ اس کے برعکس میں نے ایک زمانہ دیکھا تھا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور تقریباً
ہر قسم، ہر قماش اور ہر ڈھنگ کی عورت سے ملا تھا۔ لالہ کی سادہ دلی اور معصومیت
پر مجھے کوئی شک نہیں تھا لیکن نزہت کے چہرے پر جس کردار کی دھندلی پرچھائیں
میں نے دیکھی تھیں، منصور اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں مصلحتاً چپ تھا اور اس
طوفان کا منتظر تھا جسے میرے خیال میں ایک نہ ایک دن ضرور آنا تھا۔

چنانچہ اس روز لالہ کے بارے میں نزہت کے طنزیہ لہجے نے گویا مجھے جھنجوڑ
کر ایک دم بیدار کر دیا اور مجھے محسوس ہوا کہ جس طوفان کا میں انتظار کر رہا تھا وہ
آن پہنچا ہے۔ میں نے نزہت کے منہ سے کچھ اگلوانے کے لئے ذرا چالاکی سے
کام لیا۔ باتوں ہی باتوں میں، میں نے لالہ اور منصور کے تعلقات کا قصّہ چھیڑ دیا۔ میں
نے محسوس کیا کہ نزہت مجھ سے زیادہ ہوشیار ہے۔ غالباً وہ میرے ارادوں
کو بھانپ گئی تھی اور فراخدلی سے لالہ اور منصور کی محبت کو سراہ رہی تھی۔ جب میری
یہ ترکیب بھی ناکام ہو گئی تو میں نے وہ حربہ استعمال کیا جو عام طور پر عورتوں کے
معاملے میں بڑا کارگر ثابت ہوتا ہے۔ میں نے پہلے نزہت کی مختصر نویسی، بچے تلے
جملوں اور اس کے سیدھے سادے انداز کی تعریف کی اور پھر کہا۔

"خدا جانے لالہ اتنے لمبے چوڑے خط کیسے لکھتی ہے؟ اس نے
آج تک منصور کو جتنے خط لکھے ہیں میں نے سارے پڑھے ہیں۔
یقین کرنا نزہت! میرے پلّے کچھ بھی نہ پڑ سکا۔ یا تو میری عقل کام
نہیں کرتی اور یا پھر لالہ نیند کے عالم میں لکھتی ہے۔ اس کے خطوں
میں مطلب کی بات کم اور چاندنی راتوں، آبشاروں اور نرگس
کے پھولوں کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے تو اب اس کے خط
پڑھنے ہی چھوڑ دیئے ہیں۔ دوسری طرف تم بھی تو ہو کہیں نرگس
کے پھولوں کا ذکر نہیں ہوتا، کہیں کوئی آبشار نہیں گرتی بس مطلب

کی بات ہوتی ہے'

نزہت یقیناً اپنی تعریف سے خوش ہوئی تھی۔ وہ بڑی عجیب سی آواز میں بولی۔

'خیر آپ ذرا تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ مجھے تو لکھنا ہی نہیں آتا اور اس کے علاوہ میں اتنی زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ ہاں اتنا تو میں بھی کہوں گی کہ لالہ بڑی خیال پرست لڑکی ہے اور حقیقت کی دنیا سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے'

میں نے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

'اسی لئے تو کبھی کبھی مجھے ڈر آتا ہے کہ کہیں یہ سب کچھ محض ہوائی باتیں ہی نہ ہوں۔ منصور میرا دوست ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسی ویسی بات نکل آئی تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے گا۔ خدا جانے پھر وہ زندگی بسر کرنے کا کونسا طریقہ اختیار کرے'

نزہت ایک لمحے کے لئے چپ رہی۔ پھر بڑے افسوس بھرے لہجے میں بولی:

'اس خیال سے کبھی کبھی میں بھی پریشان ہو جاتی ہوں۔ جتنی ہمدردی مجھے لالہ سے ہے اتنی ہی منصور سے بھی ہے۔ لالہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ میں اسے ایک مدت سے جانتی ہوں۔ وہ منصور کو بے حد چاہتی ہے لیکن وہ جذباتی بہت ہے۔ اس کے علاوہ

اسے لکھنے میں بڑی مہارت ہے۔ وہ اگر اپنے خیالات کو بڑے سلیقے سے بیان کرتی ہے تو بعض باتیں بڑی خوبصورتی سے چھپا بھی جاتی ہے۔ میں اسے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ لالہ! منصور پر اپنے دل کے سارے دروازے کھول دو۔ اسے وہ سب کچھ بتا دو جسے تم چھپا چھپا کے رکھ رہی ہو۔ اس لئے کہ تم نے محبت کا رشتہ استوار کیا ہے اور محبت کا مطلب دو دلوں، دو روحوں اور دو زندگیوں کا ایک ہو جانا ہے۔ مگر نہ جانے وہ ایسا کیوں نہیں کرتی۔ میرا خیال ہے شائد اسے منصور پر اچھی طرح اعتماد نہیں۔ شائد وہ ڈرتی ہے کہ کہیں منصور اُسے چھوڑ نہ دے۔"

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ میں نے کہا،

"تم ٹھیک کہتی ہو نزہت! لالہ کے دل میں یقیناً ایک پوشیدہ خطرہ دھڑک رہا ہے۔ میں نے اس کی تحریروں سے بھی یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ کسی بات کا انکشاف کرنا چاہتی ہے لیکن نہیں کرتی اور عجیب گومگو کے عالم میں ہے۔ مگر نزہت! تم اس کی پرانی سہیلی ہو۔ تم پر تو اس کا سارا ماضی کھلا ہے۔ خدا کے لئے اگر تم منصور کی مدد کر سکتی ہو تو ضرور کرو۔ وہ اسکی محبت میں دیوانہ

ہوا جا رہا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ میں اسے آسانی سے واپس لا سکوں۔ کچھ وقت اور گذر گیا تو پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔'

اس پر نزہت ذرا ہچکچائی۔ ذرا کھانسی اور بولی۔

'نہیں نہیں ـــــ آپ ایسا نہ سوچیں۔ خدانخواستہ کوئی خوفناک بات نہیں ہے۔ بڑی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ ویسے بڑی اہم باتیں ہیں۔ اب اگر لالہ انہیں اہمیت نہ دے تو الگ بات ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں وہ منصور کے ساتھ زیادتی کر رہی ہے ـــ'

میں نے جلدی سے کہا۔

'نزہت! اگر تم مجھے وہ باتیں بتا دو تو میں تم سے ایک مرد کی حیثیت سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا نام کبھی ظاہر نہ ہوگا۔ دیکھو نزہت! منصور میرا بہترین دوست ہے۔ اسے ہر تکلیف اور مصیبت سے بچانا میرا فرض ہے۔'

نزہت کچھ گھبرا سی گئی۔

'جی نہیں۔ آپ ایسا نہ کہیں۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ لیکن کلیم صاحب میں آپ کو بتاؤں کیا؟ ـــــ میرا مطلب ہے کیا کیا بتاؤں۔ اور پھر فون پر ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ پھر کبھی سہی۔ دیسے

کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔ بس چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔
آپ پریشان نہ ہوں اور منصور کو بھی پریشان نہ ہونے دیں۔
میں انہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی ــــ اچھا اب میں جاتی ہوں۔
انہیں میرا اسلام کہیئے ــــ،

زہت نے فون بند کر دیا۔ میں نے بھی زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔ علاوہ ازیں
ٹی ہاؤس میں گاہکوں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی اور دو تین حضرات فون کرنے کے
لئے کاؤنٹر کے پاس کھڑے تھے۔ چار بجے کے قریب لالہ کا فون آگیا۔ اس وقت
منصور میرے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ہم دونوں لالہ سے باتیں کرتے رہے۔ لالہ
نے کہا کہ زہت بھی اس کے پاس کھڑی ہے اور ہمیں سلام کہہ رہی ہے منصور
نے کہا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ لالہ نے فون زہت کی طرف کر دیا۔
وہ دونوں کچھ دیر ہمکلام رہے۔ منصور ہنس ہنس کر اس کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔
اس کے بعد وہ روز کی طرح دوسرے دن فون پر ملنے کا وعدہ کر کے جدا ہو گئے۔
رات کو میں اور منصور کوئی اردو فلم دیکھنے چلے گئے۔ واپسی پر ہم ٹی ہاؤس آئے۔ چائے
پی اور سگریٹ وغیرہ پیتے ہوئے فلم پر تبصرہ کرنے لگے۔ زہت کے ساتھ فون پر جو میری
باتیں ہوئی تھیں میں نے انہیں منصور پر ظاہر نہ کیا تھا اور ابھی انہیں ظاہر کر دینے سے
کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ گھر جا کر میں بستر پر لیٹ گیا اور کتنی ہی دیر زہت اور لالہ کی دوستی
پر غور کرتا رہا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر زہت کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ لالہ کے بارے

میں کیا بتانا چاہتی تھی ؟ میں اس کی زبان سے وہ باتیں سننے کے لئے بے تاب تھا جنہیں وہ اس روز فون پر کہتے کہتے رک گئی تھی۔ خدا جانے وہ کس قدر خوفناک باتیں ہوں۔ خدا جانے ان میں کتنی سچائی اور کتنا جھوٹ ہو۔

دوسرے روز نزہت نے فون کیا کہ اسے اپنی کسی سہیلی کے لئے کچھ بڑے کیک چاہئیں اور وہ ان کے ملازم کو بھیج رہی ہے۔ میں نے موقعہ غنیمت جان کر پھر لالہ کا قصہ چھیڑ دیا۔ اس پر نزہت نے بتایا کہ وہ یونہی مجھ سے ہنس رہی تھی۔ لالہ اس کی بڑی مخلص سہیلی ہے اور بڑی وفا شعار لڑکی ہے۔ بھلا وہ کوئی ایسی ویسی بات کہہ سکتی ہے۔ میں نزہت کی ہوشیاری پر اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ نزہت نے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ معاملے کی نزاکت کو محسوس کر چکی تھی اور اپنی باتوں کا خود ہی مذاق اڑا رہی تھی۔ اس واقعہ کے بعد میرے دل میں یہ گمان یقین میں بدل گیا کہ نزہت لالہ کی سہیلی نہیں ہے اور اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لئے میں ایک بار پھر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دنوں بعد نزہت کا ایک خط آیا۔ خط منصور کے نام تھا اور ڈاک کے ذریعہ آیا تھا۔ ظاہر ہے نزہت نے لالہ کے چھوٹے بھائی کے ہاتھ اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ کہیں اسے لالہ نہ پڑھ لے۔ میں نے لفافے پر ہی نزہت کا ہاتھ پہچان لیا۔ چونکہ منصور کے نام تھا میں اسے کھول نہ سکا اور منصور کا انتظار کرنے لگا۔ چار بجے کے بعد وہ دفتر سے واپس آیا تو میں نے اسے وہ خط دے دیا۔ لفافہ کھول

کر اس نے خط پڑھا اور ہنستے ہوئے مجھے پکڑا دیا۔

"بڑی پیاری لڑکی ہے ـــــ اسے ہم دونوں سے کتنی ہمدردی ہے!"

میں نے منصور کی بات پر دھیان دیئے بغیر خط پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ اگرچہ مختصر لکھا تھا مگر اپنے اندر مفہوم کے صحرا چھپائے ہوئے تھے۔ بے جان سطروں اور خاموش الفاظ کی سطح کے نیچے مجھے بپھرتی موجوں کا قیامت خیز شور سنائی دیا۔ اس خط میں، میں نے وہ بات پالی تھی جس کی جستجو مجھے پریشان کئے ہوئے تھی۔ نزہت کا خیال تھا کہ منصور مجھے یہ خط نہیں دکھائے گا۔ چنانچہ وہ بڑی آزادی سے اس میں کچھ اشارے کر گئی تھی۔ ایسے اشارے ـــــ جنہیں منصور بالکل نہیں سمجھ سکا تھا لیکن میں سمجھ گیا تھا۔ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ دراصل منصور کی آنکھوں پر نزہت کے خلوص اور اس کی تقدیس، کا پردہ گرا ہوا تھا۔ وہ نزہت کو اس پردے میں سے دیکھتا تھا اور اسے سوائے خلوص اور تقدس کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دوسری طرف میں اسے ایک عورت سمجھتا تھا اور اس کی ہر حرکت، ہر بات کو اسی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔ چنانچہ جو نتائج میں نے اخذ کئے تھے وہ نزہت کے کردار کی تائید کر رہے تھے اور جو کچھ منصور نے سمجھا تھا وہ سر سے پاؤں تک دھوکا تھا، فریب تھا۔ نزہت کا خط یہ تھا۔

منصور کے نام!

آج کئی دنوں سے فون پر آپ سے بات نہیں ہو سکی۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ کوشش کے باوجود میں ناکام رہی۔ فون پر کوئی اہم بات تو نہیں کرنی تھی بس یونہی باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں ——— جب میرا باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے تو پھر میں بہت ہی باتیں کرتی ہوں! آپ اس سال امتحان دے رہے ہیں نا؟ مبارک ہو۔ خدا آپ کو کامیابی عطا کرے۔ آمین! کئی دنوں سے آپ نہیں مل سکے شاید مجھ سے ناراض ہیں۔ آپ مجھ سے کبھی ناراض نہ ہوں۔ خوشی کے لمحات میں نہ سہی مگر غم کے لمحوں میں مجھے اپنا شریک سمجھیں۔ مجھے آپ کی خوشی ہمیشہ عزیز ہے۔ آپ کے شاید یاد نہ ہو۔ اس دن میں نے گیارہ اور بارہ کے درمیان فون کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن بدقسمتی سے ایک ایسے چکر میں پھنس گئی کہ آج تک پریشانی نہیں گئی۔ لالہ نے کچھ زیادہ محسوس نہیں کیا۔ نہ جانے کیوں۔ مگر مجھے آج بھی اس بات کی ندامت ہے۔ مجھے افسوس بھی ہے اور صدمہ بھی۔ ایک بجے کے قریب فون کیا تو پتہ چلا کہ آپ کچھ دیر انتظار کر کے جا چکے ہیں۔

منصور صاحب! ایک تشنہ لب انسان جس کی روح شدتِ پیاس سے لبوں پر دم توڑ رہی ہو۔ وہ ننگے پاؤں جھلستا ہوا ریگستان عبور کر کے دریا کنارے پہنچے اور دریا ایک سراب ثابت ہو۔ آپ اس تشنہ لب مسافر کی بدقسمتی کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ ہماری زندگیوں میں خوبصورت لمحات بڑی دیر کے بعد آیا کرتے ہیں۔

مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں خوبصورت لمحات کے ساتھ خوبصورت دوست بھی میسّر ہیں ـــــ معلوم ہوا ہے کہ آپ پچھلے دنوں کچھ پریشان رہے ہیں۔ لیکن آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ شاید آپ ایسا کرنا پسند نہیں کرتے۔ مگر مجھے آپ سے بہت سی توقعات ہیں۔ لالہ بڑی نادان لڑکی ہے جو ایسی فضول باتوں سے آپ کو پریشان کرتی ہے۔ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی روح کو تکلیف نہ دیا کریں۔ آپ کسی کی لمبی تحریروں سے الفاظ کے معنی نہ ڈھونڈا کریں بلکہ حقیقت کی گہرائی کا مطالعہ کیا کریں۔ مفت کی سر درد مول لے کر پریشان ہونے اور خود کو اذیت پہنچانے سے فائدہ؟ کلیم بھائی خوش قسمت ہیں جو آپکے قریب ہیں۔ میں اگر ان کی جگہ ہوتی تو آپ کو کبھی پریشان نہ ہونے دیتی۔ جب آپ اداس ہوتے ہیں تو کیا وہ آپ کا جی نہیں بہلاتے؟

لالہ سے قریباً روزانہ ملاقات ہوتی ہے۔ میں اسے ہر بار کہتی ہوں کہ لمبے لمبے بے مقصد پروگرام بنانے اور طویل خط لکھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ایک کام ہم آج آسانی سے کر سکتے ہیں تو اسے کل پر کیوں چھوڑیں؟ اگر زندگی میں کبھی اکیلے بیٹھ کر باتیں کرنے کا اتفاق ہوا تو آپ سے بہت سی باتیں کروں گی۔ حقیقت کی باتیں ــــ زندگی کی باتیں! میں ہمیشہ حقیقت کے پاس رہی ہوں۔ مجھے تصنّع، بناوٹ، کاغذی محبت سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔

نزہت

رات کو حسب معمول جب ہم اپنی میز پر چائے پینے اور باتیں کرنے بیٹھے تو میں

نے نزہت کی باتیں چھیڑ دیں۔ معلوم ہوا کہ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ منصور کی آنکھیں نزہت کے خط میں کچھ بھی نہ دیکھ سکی تھیں۔ مجھے نزہت کی حالت پر رحم بھی آیا اور ہنسی بھی آئی۔ اس نے کس حیرت انگیز چابکدستی سے منصور کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی اور منصور کے بدن میں کوئی جھنجھناہٹ، کوئی بھنور پیدا نہ ہوا تھا۔ حقیقت میں وہ نزہت کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی وہ بات نہ آ سکتی تھی جس کی طرف نزہت نے اپنے خط میں اشارہ کیا تھا۔ وہ اسے لالہ کی مخلص ترین سہیلی اور اپنی بہت بڑی ہمدرد خیال کرتا تھا۔ علاوہ ازیں کچھ اس کا کردار بھی ایسا تھا کہ وہ عشق و رقابت کے گنجلک مسائل میں الجھنا کبھی پسند نہ کر سکتا تھا۔ جن باتوں پر میں گھنٹوں سوچ بچار کیا کرتا وہ انہیں تمباکو کے دھوئیں میں اڑا دیا کرتا تھا۔ اپنے محبت ناموں میں وہ جتنا لطیف اور رومانی تھا اس سے کئی گنا بڑھ کر اصل زندگی میں اکھڑ اور وحشی تھا۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس میں جذبات ہی جذبات تھے۔ ابھی اگر قہقہے لگا رہا ہے تو دوسرے لمحے افسردگی کی دبیز کہر میں گم ہے۔ ابھی کسی بات پر ضد کر رہا ہے، اڑ گیا ہے تو ابھی تن گیا ہے۔ ابھی ایک دعوےٰ کیا ہے تو ابھی اس کی تردید کرنے لگا ہے۔ اس اعتبار سے اسے یہ کہنا کہ وہ نزہت کی باتوں کا اعتبار نہ کرے بے معنی تھا۔ لیکن میں اب خاموش بھی نہ رہ سکتا تھا۔ یہ خاموشی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ اس اندھیرے میں کئی گڑھے تھے اور لالہ کو منہ اوپر اٹھا کر چلنے کی عادت تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ لالہ

سب باتوں سے آگاہ کر دوں گا۔ مجھے اس سے دلی ہمدردی تھی اور میں اس کی
دگی اور بھولپن کو شکست کھاتے کبھی نہ دیکھ سکتا تھا۔
اگلے دن لالہ کا فون آیا تو میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے پوچھا کہ نرز بہت
متعلق اس کا کیا خیال ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اس کی بڑی پیاری سہیلی ہے۔
زدار ہے، ہمدرد ہے اور اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہے۔ میں بے اختیار
س دیا۔ اس خیال سے کہ اگر منصور احمق تھا تو لالہ بھی اس سے کسی طرح کم نہ تھی۔
کچھ نہ سمجھ سکی۔

'آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟'
میں نے بڑے آرام سے سگریٹ سلگایا اور اس کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا
'لالہ! اگر میں ایک بات کہوں تو تمہیں یقین آجائے گا؟'
'کونسی بات؟'
'کوئی بھی ہو'
'آپ پہلے بات بتائیں'
'تمہیں اس سے کیا۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یقین آئیگا یا نہیں؟'
'اب میں سنے بغیر کیسے کہہ سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ بات
غلط ہو'
'پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ مجھے کیا سمجھتی ہو؟'

'اپنا بھائی۔ بلکہ بھائیوں سے بھی بڑھ کر'

'تو پھر یقین کرو کہ جو بات تمہیں کہوں گا وہ غلط نہیں ہو گی'

'اچھا یقین کر لیا۔ اب آپ بتائیں'

میں نے فون پہ ذرا جھک کر کہا۔

'تمہاری محبت کو گھن لگ رہا ہے'

چند لمحوں تک لالہ کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر اس نے ذرا سنبھل کر پوچھا۔

'وہ کیسے؟'

'بس جس طرح گھن لگا کرتا ہے'

'لیکن ——— میرا مطلب ہے ایسا کون کر رہا ہے؟'

'جسے تم اپنا ہمدرد سمجھتی ہو'

'خدا کے لئے اس کا نام تو لیں'

میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

'نزہت ———'

مجھے کسی شے کے فرش پر گر کر ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے جلدی سے پوچھا

'یہ کیا چیز ٹوٹ گئی؟'

'کچھ نہیں ——— میں میز پر بیٹھنے لگی تھی اور دوات نیچے گر پڑی'

لالہ کی آواز ایک دم بجھ سی گئی

'کلیم صاحب مجھے ——— میں ——— میرا مطلب ہے

کیسے اعتبار کر لوں۔ نزہت کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ تو

گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر منصور سے میری شادی کے پروگرام

بنایا کرتی ہے۔'

میں اُسے نزہت کا وہ خط سنانے پر مجبور ہو گیا جو اس نے بذریعہ ڈاک منصور کو بھیجا

تھا۔ خط سن کر لالہ حیران رہ گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے نزہت کی وہ باتیں بھی

سنائیں جو اس نے میرے ساتھ فون پر کی تھیں۔ لالہ کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

'مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے کلیم صاحب؟ ——— میں نے نزہت

کا کیا بگاڑا ہے؟'

'یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال وہ منصور کو تم سے چھیننے کی کوشش

میں ہے اور اگر تم نے احتیاط نہ برتی تو بعد میں رونے سے

کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ نزہت تم سے کئی گنا بڑھ کر چالاک ہے۔'

'پھر خدا کے لئے مجھے بتائیے میں کیا کروں؟ کیا میں نزہت

سے بول چال بند کر دوں؟'

'بالکل نہیں ایسا کبھی نہ کرنا ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا

پڑے گا۔'

'پھر کیا کروں؟ کیا میں ہاتھ جوڑ کر اس سے منصور کی بھیک مانگ لوں۔ یقین کریں کلیم صاحب وہ میری بڑی اچھی سہیلی ہے۔ وہ مجھے کبھی نا امید نہ کرے گی۔ وہ مجھے ضرور منصور دے دیگی.....'

لالہ کی آواز روہنسی سی ہو گئی۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

'اس طرح بدحواس ہونے سے کچھ نہیں بنے گا لالہ! تمہیں ہمّت سے کام لینا چاہیئے۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ جب تک میں منصور کے ساتھ ہوں اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس وقت تم صرف یہ خیال رکھو کہ جو باتیں ہمارے درمیان ہوئی ہیں، ان کی خبر کسی کو نہ ہو۔ یہاں تک کہ منصور کو بھی پتہ نہ چلے'

'میں وعدہ کرتی ہوں.....'

'تم نزہت سے بالکل پہلے کی طرح ملو اور اپنے سلوک سے اس پر یہ بات ابھی نہ کھلنے دو کہ تم اس کے ارادوں کو بھانپ گئی ہو'

'میں اس کا بھی وعدہ کرتی ہوں.....'

'ٹھیک ہے۔ اب تم خاموش رہو اور دیکھتی جاؤ'

'لیکن ــــ میرا دل ڈوب رہا ہے کلیم صاحب! میرا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟'

'اس طرح جی نہ ہارو لالہ! خدا پر بھروسہ رکھو'

فون بند کر کے میں کچھ دیر کے لئے فکر مند سا ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہیں میں نے لالہ کو سب کچھ بتا کر غلطی تو نہیں کی؟ وہ بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ خدا اس کی حفاظت کرے۔ میں سگریٹ راکھ دان میں بجھا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ایک ہفتہ خاموشی سے گذر گیا۔

لالہ نے اپنے وعدے کے مطابق نزہت سے کوئی بات نہ کی۔ وہ روز نزہت کے ساتھ مل کر منصور کو فون کرتی۔ کچھ دیر ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں اور ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے۔ ایک دن نزہت نے فون کیا اور مجھے بتایا کہ وہ اور لالہ، رضیہ اور ثریا کے ساتھ دوپہر کے بعد ٹی ہاؤس آ رہی ہیں۔ میں نے منصور کو خبر کر دی۔ منصور ابھی دفتر سے واپس آ کر چائے بنا ہی رہا تھا کہ باہر لڑکیوں سے بھرا ہوا تانگہ آ کر رکا۔ منصور نے میری طرف اور میں نے مسکراتے ہوئے منصور کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم سب پردے چھوڑ کر گیلری والے کیبن میں بیٹھے تھے۔ نزہت نے اپنا بہترین لباس پہن رکھا تھا۔ کھلے پائنچوں والا ریشمی غرارہ، کھلی آستینوں اور کھلے

یان کی قمیض۔ بالوں کو اس نے بڑے اہتمام سے بنا رکھا تھا۔ بھنوئیں پنسل سے
ی ہوئی تھیں۔ بھوری بھوری آنکھوں میں سرمے کی ہلکی سی لکیر تھی۔ ہونٹ ہلکے سرخ
ے اور ناخنوں پر ہلکا اور گہرا —— دونوں طرح کا پالش چمک رہا تھا۔ جہاں وہ بیٹھی
ں اس جانب خوشبو کے بھنور سے لپک رہے تھے۔ مجھے اس کے خطرناک
دسنگار سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ وہ آج کس نیت سے آئی تھی؟ وہ
ج کیا کرنا چاہتی تھی؟ لالہ اگرچہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی لیکن اندر سے اس کا دل بھی
ٹھا جا رہا تھا۔ وہ بار بار مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتی اور کچھ پوچھتے پوچھتے کچھ
تے کہتے رہ جاتی۔ اس کا لباس عام لڑکیوں ایسا تھا۔ رضیہ اور ثریا بھی سیدھے
سادھے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ رضیہ اپنے مخصوص دیہاتی لڑکیوں ایسے انداز میں
یڈیو پر کسی گانے والے کی نقل اتار رہی تھی۔ شرمیلے چہرے اور خوبصورت ناک
لی ثریا محجوب سی ہو کر زیر لب ہنس رہی تھی۔ منصور سب سے زیادہ خوش تھا۔ وہ
ی میز پر رکھے بڑے مزے سے پائپ کا دھواں اڑا رہا تھا اور رضیہ کی باتوں پر
چوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ میری نگاہ بار بار نزہت پر پڑ رہی تھی۔ جو نچلا ہونٹ قدرے
بھینچے خاموش بیٹھی تھی اور کبھی کبھی عجیب نظروں سے منصور کو دیکھ لیتی تھی۔ رضیہ کہہ
رہی تھی۔

ہائے میں آپ کو کیسے بتاؤں بھائیجان —— ریڈیو پر
جب بھی پکا گانا ہوتا ہے میرا ٹیبل لیمپ کانپنے لگتا ہے

اور میری پیاری بلی فوراً کمرے سے باہر بھاگ جاتی ہے۔ میں

تو حیران ہوں لوگ ایسے گانے گا کیسے لیتے ہیں۔ آپ کو ایسے

گانے پسند ہیں بھائی جان؟'

'مجھے؟ ____ بالکل نہیں۔ پکے گانے تو مجھے زہر لگتے ہیں'

حالانکہ منصور ایسے گانوں کا عاشق تھا اور وہ ہر ہفتے کی شام کو بڑے اہتمام

سے دلی ریڈیو پر منعقد ہونے والی راگ سبھا کا پروگرام سنا کرتا تھا۔ لیکن ان لڑکیوں

میں بیٹھ کر وہ اپنے شوق کا خود ہی مذاق اڑا رہا تھا۔ نزہت نے پلکیں جھپکاتے

ہوئے پوچھا۔

'آخر ریڈیو پر ایسے گانے کیوں ہوتے ہیں'

منصور مسکراتے ہوئے بولا۔

'آخر کچھ لوگ ایسے بھی تو ہیں جو ایسے گانے شوق سے سنتے ہیں'

نزہت ہنسنے لگی

'عجیب لوگ ہیں وہ بھی'

لالہ نے منصور کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

'وہ لوگ بھی ہماری طرح ہی ہوتے ہیں۔ بس ذرا شوق کا فرق

ہے۔ جس طرف ان کا رجحان ہوتا ہے ہمارا نہیں ہوتا'

لالہ نے نزہت کی تردید کی تھی لیکن نزہت مسکراتی رہی۔ وہاں چائے آگئی۔ منصور

نے سب کے لیے چائے بنائی۔ ثریا اپنے پیالے میں چمچہ ہلاتے بولی۔

'دیکھئے بھائی جان اس روز میں نے فون پر پوچھا کہ کلیم صاحب کہاں ہیں تو انہوں نے آواز بدل کر کہا کہ وہ تو فوت ہو گئے ہیں۔ اب میں کبھی فون پر ان سے بات نہ کروں گی۔'

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ثریا ان سب سے چھوٹی تھی اور اس کا باتیں کرنے کا انداز بڑا معصوم اور بچوں ایسا تھا۔

'بھئی میں نے تو سچی بات بیان کی تھی۔ کلیم صاحب تو واقعی فوت ہو چکے ہیں اور ہم نے خود انہیں قبر میں اتارا ہے۔'

رضیہ نے فوراً کہا۔

'میرے اللہ! ایسی باتیں نہ کریں کلیم صاحب'

لالہ اور میں ہنسنے لگے۔ منصور پائپ جھاڑنے کے بعد اسے ماچس کی تیلیوں سے صاف کر رہا تھا۔ نزہت نے کہا:

'یہ تمبا کو آپ کے پھیپھڑوں کو نقصان نہیں پہنچاتا؟'

منصور نے ڈبہ کھول کر تمبا کو نکالا اور پائپ میں بھرنے لگا۔

'ضرور پہنچاتا ہے'

'تو پھر آپ کیوں پیتے ہیں؟'

'مجبوری ہے ——'

لالہ نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر چائے کا گرم گرم گھونٹ پیا اور کہنے لگی۔

'مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا ہے کسی سینما ہال میں ایک بوڑھی سی عورت کے پہلو میں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا بُری طرح پائپ پی رہا تھا۔ اس کے منہ سے دھوئیں کے بادل اٹھ اٹھ کر عورت کے نتھنوں اور آنکھوں میں گھس رہے تھے۔ جب اس سے بالکل نہ رہا گیا تو وہ بولی۔

'کیا آپ نہیں جانتے تمباکو پینے سے عمر کم ہو جاتی ہے ؟'

بوڑھے نے بھنویں اٹھا کر عورت کی طرف دیکھا۔

'نہیں تو'

عورت نے بڑے فخر سے سر اٹھا کر پوچھا:

'آپ کی عمر کیا ہے ؟'

'پچاس سال'۔

عورت بولی۔ 'اگر آپ تمباکو نہ پیتے تو آپ کی عمر ساٹھ سال کی ہوتی'۔

اس لطیفے پر خوب قہقہے پڑے۔ ثریا اور رضیہ کی آنکھوں میں تو ہنس ہنس کر پانی آگیا۔ منصور نے صرف ایک ہی قہقہہ بلند کیا اور کیبن کی کمزور دیواریں لرزنے لگیں۔ نزہت بھی ہنسی مگر ذرا احتیاط سے، ذرا تکلف سے —— جیسے اسے منہ سے کسی شے

کے گر پڑنے کا خیال ہو۔

ایک گھنٹے کی بڑی پُر لطف اور خوشگوار صحبت کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔ چلتے وقت نزہت نے منصور سے کہا کہ وہ اس کے ہمراہ ذرا ریڈیو اسٹیشن تک چلے کیونکہ اسے وہاں اپنی ایک سہیلی سے ملنا ہے اور وہ اکیلی نہیں جانا چاہتی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ نزہت اتنا بناؤ سنگار کر کے کیوں آئی تھی۔

لالہ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"بھئی منصور تو شاید نہ جا سکے۔ آپ لالہ کو لے جائیں"

نہ جانے لالہ کو ایک دم کیا ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

"میں نہیں جا سکتی۔ مجھے گھر سے دیر ہو جائے گی"

اب منصور بھی بول پڑا۔

"کوئی بات نہیں میں چلا جاؤں گا"

اب کسی کو روکنے یا نہ روکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ٹی ہاؤس سے باہر نکلتے ہی دو تانگے لئے گئے۔ ایک میں لالہ، ثریا اور رضیہ بیٹھیں اور دوسرے میں منصور اور نزہت سوار ہو گئے۔ پہلا تانگہ لالہ کے گھر کی طرف اور دوسرا ریڈیو سٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ کچھ دور تک میں نے دیکھا کہ نزہت منصور کے ساتھ پیچھے بیٹھی بار بار اپنے ریشمی غرارے کے بل درست کر رہی تھی۔ اس کے بعد دونوں تانگے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

شام کو منصور ٹی ہاؤس آیا تو وہ کافی پریشان تھا۔ اس کا رنگ زرد تھا اور
چہرہ اترا ہوا سا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ نزہت کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے اور
وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہے۔ میں کام میں بے حد مصروف تھا۔ منصور
نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ وہ اکھڑے اکھڑے
سے قدم اٹھاتا کونے کی میز تک گیا۔ کرسی پہ بیٹھا۔ پانی کا ایک گلاس پیا۔ آہستہ
سے اٹھا اور کوٹ کے کالر چڑھا کر تیز تیز باہر نکل گیا۔ وہ اتنی تیزی سے میرے سامنے
سے گذر گیا کہ میں اسے آواز تک نہ دے سکا۔ میں نے ایک ملازم کو پیچھے دوڑایا
لیکن نہ جانے منصور باہر نکلتے ہی کہاں غائب ہو گیا تھا۔ دوسرے روز صبح کے وقت
منصور کا چھوٹا بھائی میرے پاس ایک خط لے کر آیا۔ یہ خط لالہ کے نام تھا۔ اس
اس سے پیشتر کہ میں اس خط کے کچھ حصے درج کروں میں اس ملاقات کا حال بیان
کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس روز نزہت اور منصور کے درمیان ہوئی اور جس
کی تفصیلات کا علم مجھے کچھ دن بعد منصور کی زبانی ہوا۔

جب وہ دونوں تانگے میں سوار ہو کر ریڈیو سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے تو تھوڑی
دور جا کر نزہت بولی:

"موسم بڑا اچھا ہے۔ میرے خیال میں پیدل چلا جائے۔"

منصور نے اس خیال کو پسند کیا اور وہ دونوں تانگہ چھوڑ پیدل ہی سڑک پر چل
پڑے۔ یہ سڑک کافی لمبی اور خوبصورت تھی۔ دونوں جانب کوٹھیاں تھیں اور وہ فٹ پاتھ

پر چلے جا رہے تھے۔ منصور پائپ پی رہا تھا اور نزہت کچھ سوچ رہی تھی،
کچھ غور کر رہی تھی، کچھ ادھیڑ رہی تھی، کچھ بُن رہی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن تھوڑی دور
رہ گیا تو نزہت نے بڑی نرم زبان میں اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

'میرا خیال ہے اب آپ کو لالہ سے شادی کر لینی چاہیئے'
منصور کی آنکھوں میں چمک سی آگئی اور وہ مسکرانے لگا۔

'ہاں —— میرا اپنا بھی یہی خیال ہے'
اس نے کچھ قدم خاموشی سے طے کیئے اور پھر بولا۔
'لیکن اس کے ماں باپ کیسے مانیں گے نزہت؟'
ماں باپ کیوں نہیں مانیں گے؟ جب ایک جوان لڑکی
گھر کی چار دیواری کے اندر کھڑی ہو کر یہ اعلان کرتی ہے کہ
فلاں شخص سے شادی کروں گی تو دیواریں کانپ جاتی ہیں
اور ماں باپ کے دل ہل جاتے ہیں۔ اگر لالہ اتنی جرأت
سے کام لے سکی تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی شادی آپ سے
نہ ہو۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا لالہ یہ کہہ سکے گی؟'
'میرا خیال ہے وہ ایسا ضرور کہے گی۔ وہ بڑی دلیر لڑکی ہے
اور پھر وہ بھی چاہتی ہے کہ اس کی شادی مجھ سے ہو'
'ہاں اگر ایسا ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ پھر تو اس کے ماں

باپ ضرور راضی ہو جائیں گے۔ تاہم مجھے شبہ ہے کہیں
وہ ڈر کر دب نہ جائے۔'
منصور پائپ جھاڑتے ہوئے مسکرایا۔
'محبت کمزور دلوں کو نڈر اور بے خوف بنا دیا کرتی
ہے نزہت!'
'خدا کرے کہ لالہ کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہو۔'
منصور نے ایک طرف تھوکتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔
'تمہیں لالہ پر شک کیوں ہے؟'
نزہت نقاب کے اندر مسکرائی اور بولی۔
'منصور صاحب وہ میری پرانی سہیلی ہے۔ میں اس کی طبیعت
سے پوری طرح واقف ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ کتنی مضبوط
اور کتنی کمزور ہے۔ مجھ پر جس طرح اس کا حال کھلا ہے اسی
طرح اس کا ماضی بھی روشن ہے۔'
منصور نے قدرے ٹھٹھک کر پوچھا۔
'ماضی سے تمہارا مطلب کیا ہے؟'
نزہت ذرا گھبرا سی گئی۔ فوراً سنبھل کر بولی:
'کچھ نہیں ___ میرا مطلب ہے میں جانتی ہوں اس میں کیا

کیا کمزوریاں ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اتنی باوفا ثابت ہو کہ
آپ پر اپنی جان تک قربان کر دے اور ہو سکتا ہے وہ آپ
کو چھوڑ دے؛

منصور عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ پائپ کے کش پر کش لگانے لگا۔
نزہت نے اس موقعہ سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے ایک اور وار کیا۔

"لالہ اگر میری سہیلی ہے تو مجھے آپ سے بھی ہمدردی ہے میں
چاہتی ہوں کہ شادی سے قبل آپ ایک دوسرے کو اچھی
طرح سمجھ لیں، پہچان لیں۔ ایک دوسرے کی زندگی سے
پوری طرح روشناس ہو جائیں تاکہ بعد میں آپ کی ازدواجی
زندگی نہایت سکون سے گذر سکے؛

منصور کچھ سوچنے لگا۔ دراصل وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ جیسے اپنے
آپ بولا۔

"لالہ کی پچھلی ساری زندگی میرے سامنے ہے۔ مجھے تو اس
میں کوئی برائی دکھائی نہیں دیتی۔ میں تو سمجھتا ہوں لالہ بے داغ
ہے۔ وفا شعار ہے اور مجھے زندگی کے کسی بھی دور میں دھوکا
نہیں دے سکتی۔ کم از کم اس کا ماضی اور حال مجھے یہی بتا رہا
ہے،

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کے سامنے اس کے ماضی

کا صرف ایک حصہ ہے پورا ماضی نہیں ہے"

منصور جیسے سوتے میں چونک اٹھا۔

"پورا ماضی؟ —— تم کہنا کیا چاہتی ہو نزہت؟"

نزہت اب پوری طرح تیار تھی۔ وہ آخری حملے کے لئے کیل کانٹے سے لیس

ہو چکی تھی۔ اس نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

منصور صاحب! میں آپ کی عزّت کرتی ہوں۔ مجھے آپ

سے ازحد ہمدردی ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کی

زندگی تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی

کہ جس انسان کو میں نے اپنا دوست کہا ہو۔ جسے میں نے

اپنی ہمدردی اور غمخواری کا یقین دلایا ہو اس کو اندھیرے

میں رکھوں۔ یہ میری جبلّت نہیں ہے۔ میں سچائی پسند

اور صاف گو لڑکی ہوں۔ اس سے پہلے میں اس لئے

خاموش تھی کہ آپ بہت زیادہ بول رہے تھے۔ آپ چل

نہیں رہے تھے بلکہ بھاگ رہے تھے۔ آپ دنوں کا رستہ

گھڑیوں اور مہینوں کا فاصلہ دنوں میں طے کر رہے تھے۔ میں

خاموش تھی اور خاموشی سے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی نہ

میرے دل میں خیال آیا کہ میں آپ کو راستے کی دشواریوں سے

آگاہ کر دوں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نہ جانے آپ کیا خیال کریں

اور کہیں الٹا میرے خلوص پر ہی شک نہ کرنے لگیں میں دل کی

بات دل ہی میں لے کر رہ گئی۔ مگر اب جبکہ آپ لالہ سے شادی

پر تلے بیٹھے ہیں اور آپ اس کی محبت میں چُور ہیں میرا فرض یہ ہے

کہ میں آپ پر اصل حقیقت آشکار کر دوں۔ اب ان باتوں

کے انکشاف کا وقت آن پہنچا ہے جو آپ کی زندگی کو تباہی

کے غار سے بچا سکیں گی۔"

نزہت خاموش ہو گئی۔ وہ منصور کے چہرے پر اپنی باتوں کا ردِ عمل دیکھنے

لگی۔ وہ ریڈیو سٹیشن کی عمارت کے سامنے آ گئے تھے۔ منصور کی آنکھیں کچھ کھلی تھیں

کچھ بند تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خواب میں چل رہا ہے وہ ایک درخت

کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے بجھے ہوئے پائپ کو انگوٹھے سے

دبانے لگا۔

"میں یہاں انتظار کروں گا۔"

نزہت نے "اچھا" کہا اور غرارا سنبھالتی جلدی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت

میں داخل ہو گئی۔ وہ خوش بھی تھی اور پریشان بھی۔ اسے اپنی کامیابی کا یقین ہو

چکا تھا لیکن اسے ڈر بھی تھا کہ کہیں منصور پر اس کا زیادہ اثر نہ ہو۔ ریڈیو اسٹیشن

پر سہیلی سے ملنے کا تو خیر بہانہ ہی تھا۔ اس نے ایک دو کمروں کے چکر لگائے اور باہر نکل آئی۔ منصور اسی طرح درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور بجھے ہوئے پائپ کو انگوٹھے سے سہلا رہا تھا۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی"، نزہت نے بڑے فکرمند لہجے میں پوچھا

"نہیں ـــ بالکل نہیں"، منصور جیسے بے خیالی میں بولا۔

وہ دونوں قریبی باغ میں ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ منصور نے پائپ سلگا لیا۔

"نزہت دیکھو میں تمہیں اپنا ہمدرد سمجھتا ہوں۔ مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے۔ میں اب بالکل طبعی حالت میں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے لالہ کے اس ماضی کی داستان سناؤ جو میری نگاہوں سے آج تک چھپا ہوا ہے اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ میرے دل کے معبد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائیں گے ـــ"

نزہت نے نقاب الٹ دیا اور اپنا پرس بنچ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے منصور کو وہ باتیں بتائیں جنھیں سن کر منصور کے دل و دماغ کے دہانے کھل گئے اور دہکتا، کھولتا، پتھر اور شعلے اڑاتا لاوا ابھرلوں سے اتی ہوئی وادیوں میں بہہ نکلا اور سمندر کا سینہ ابل پڑا، اور چٹانیں، بکھرتی، کف اڑاتی موجوں میں گم ہو گئیں اور سارے درخت جڑوں سے اکھڑ کر بہہ نکلے اور سارے پل ٹوٹ کر سمندر میں ڈوب

ئے اور وادیوں میں آگ ہی آگ نظر آنے لگی۔ نزہت نے منصور کو بتایا کہ لالہ
ں سے مخلص نہیں تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک مقامی ڈاکٹر سے محبت کرتی
ں اور اب بھی کر رہی ہے۔ وہ اس سے روزانہ ملنے جاتی تھی۔ ایک وقت ایک
ط منصور کو اور دوسرا ڈاکٹر کو لکھتی تھی۔ پھر نزہت نے پرس میں سے وہ خط نکالا جو
رنے تین سال پیشتر اس ڈاکٹر کو لکھا تھا اور جس میں وعدہ کیا تھا کہ وہ شام کو ضرور
نے آئے گی۔ اگرچہ اس خط پر تاریخ کوئی نہیں تھی پھر بھی منصور نے اس طرف دھیان
ں نہ دیا۔ اس کے حواس ایک دم گم سے ہو گئے۔ وہ پاگلوں ایسی حالت میں
چ پر سے اٹھا اور خط نزہت کی جھولی میں ڈال کر روانہ ہو گیا۔ نزہت نے بہتیرا
وکنے کی کوشش کی مگر وہ اپنا آپ چھڑا کر سڑک پر آ گیا اور درختوں کے نیچے سرا
م کے گہرے ہوتے ہوئے اندھیروں میں گم ہو گیا۔

دوسرے دن اس نے میرے ذریعے لالہ کو یہ خط بھجوایا۔

لالہ رخ!

تم میرے اچانک اس طرح مخاطب کرنے پر حیران تو ضرور ہو گئی ہو گی۔ کاش
یرے پاس تمہیں مخاطب کرنے کے لئے کوئی ایسا لفظ ہوتا جسے پڑھ کر تمہاری
زبان جل اٹھتی اور جسے سنکر تمہارے کانوں کے پردے پھٹ جاتے۔ اور
تمہارے ذہن کے مینار لڑکھڑا جاتے۔ اگر تمہارے کانوں پر دوپٹے کا سایہ ہے
تو اسے پرے ہٹا دو اور میری باتیں غور سے سنو۔ یہ وہ باتیں ہیں جو مجھے ایک ایسے

شخص نے بتائی ہیں جو تمہیں سر سے لے کر پاؤں تک جانتا ہے جو تمہاری زندگی
کے انتہائی قریب رہ چکا ہے اور جس کی نگاہوں سے تمہارے ماضی کا کوئی گو
چھپا ہوا نہیں ہے۔ جس وقت یہ شخص مجھے تمہاری باتیں سنا رہا تھا میرے کانو
میں سیٹیاں بجاتی، تیز آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے اور جب میں وہاں سے اٹ
کر بال پر آیا تو مجھ سے چلا نہیں جاتا تھا۔ میرے پاؤں منوں وزنی ہو رہے تھ
ایک چوک بمشکل تمام عبور کرنے کے بعد میرا سر چکرا گیا اور پنڈلیوں میں سوئیاں
سی چبھنے لگیں۔ میں نے ایک درخت کا سہارا لیا۔ کچھ سیکنڈ وہاں ٹھہرنے کے
بعد میں پاس کے بس سٹینڈ کے آہنی بنچ پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی حا
کا جائزہ لیا ـــ یہ مجھے ایکا ایکی ایسا کیوں ہو گیا تھا؟ ایسی حالت تو مجھ پر ا
وقت بھی طاری نہ ہوئی تھی جب کنیز کو ڈولی میں سوار کرایا جا رہا تھا۔ پھر یہ کو
عظیم غم تھا جس نے میری آنکھوں کے سارے چراغ گل کر دیے تھے اور جو میر
روشن راستوں پر تاریک بادل بن کر چھا گیا تھا۔ میں نے بجھا ہوا پائپ سلگ
اور یونہی گرین ووڈ ڈی ہاؤس کی طرف دیکھا جس کی روشنیاں مجھے دور سے د
دے رہی تھیں۔ مجھے یہ جگہ بڑی اجنبی سی لگی جیسے میں اسے زندگی میں پہلی
دیکھ رہا تھا۔ ایک عورت میرے پاس کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے اس
آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے تئیں سمیٹ کر وہاں سے اٹھا
ڈی ہاؤس کی جانب چلنے لگا۔ کاؤنٹر پر کھڑے ایک شخص نے مجھے

ظروں سے دیکھا۔ میں چپ چاپ کونے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے بیرے کو
نی لانے کا کہا۔ پانی پی کر میں وہاں سے اٹھ کر پھر باہر نکل آیا اور سائیکل اٹھا گھر
ی سمت چل پڑا۔

میں دیوانوں کی مانند سائیکل چلا رہا تھا۔ کبھی اس قدر آہستہ گویا اترنے لگا
ہوں اور کبھی اتنی تیز جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔ ہاں —— واقعی کوئی میرا
تعاقب کر رہا تھا۔ اس شخص کی آواز —— اس کے وہ الفاظ جو نیزوں کی طرح میرے
سینے میں اتر گئے تھے اور میرا دامن سرخ سرخ خون میں لت پت ہو گیا تھا۔ سننا چاہتی
ہو وہ الفاظ؟ مگر تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ شاید تم ان لفظوں کو گھٹیا کہہ کر پرے پھینک
دو لیکن میں انہیں پرے نہیں ہٹا سکتا۔ میں انہیں پرے نہیں پھینک سکتا۔ وہ
الفاظ سانپ بن کر اپنے پھن پھیلائے میری طرف پھنکارتے ہوئے لپکے تھے اور
انہوں نے مجھے بڑی بے دردی سے ڈس دیا ہے اور میرا رنگ نیلا پڑ گیا ہے اور
میرے منہ سے خون بہنے لگا ہے —— مجھ سے یہ خط نہیں لکھا جا رہا۔ قلم میرے ہاتھ
سے پھسل رہا ہے۔ میرا ذہن منتشر ہو رہا ہے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟
یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میری رات کیسے گذرے گی؟ میری صبح کیسے ہو گی؟ اے
سنہرے پھولوں کے درمیان رقص کرنے والی اور انگور کی بیلوں کے سائے میں بیٹھ
کر جھوٹی محبت کے کھوٹے سکے تیار کرنے والی لڑکی! تم نے مجھے یہ میرے کس
گناہ کی سزا دی ہے؟ مجھ سے کس جرم کا بدلہ لیا ہے؟ میرے سامنے الماری

میں تمہارے محبت نامے بند پڑے ہیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ایک
ایک خط اس میں سے باہر نکل رہا ہے اور میری حالت پر حقارت آمیز قہقہے بلند
کرتا ہوا میرے سامنے سے گذر رہا ہے۔

میرے چنار کے خوبصورت درختو! میرے میٹھے پانیوں کے چشمو! میرے
کی بلندیوں پر گرنے والی برف کے پھولو! میرے سمندروں پر سے گذرنے والی
ہوا کے جھونکو! میرے بھائیو! میری بہنو! میرے دوستو! میرے پاس آجاؤ
مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لو۔ شہر میں رہنے والوں نے میرے دل پہ گہرے
کے شگاف ڈال دیئے ہیں۔ ان شگافوں میں غم کے اندھیرے ہیں اور درد کے
ابل رہے ہیں۔

سنگین ستونوں سے ٹیک لگا کر محبت کے بے ثمر گیت گانے والی! میں نے
تمہارے ساتھ کیا برائی کی تھی۔ جو تم نے میرے خلوص کا گریبان پھاڑ دیا ہے۔ میں
نے کس قدر اعتماد سے تم پر اپنا آپ عریاں کر دیا تھا۔ کتنی محبت سے تم پر اپنی
زندگی کے سارے راز کھول دیئے تھے۔ جس طرح کوئی کم عمر لڑکا اپنے کسی ہمجولی
کو مہمان بنا کر گھر لائے اور اس کے سامنے اپنی صندوقچی کھول کر رکھ دے۔ اسے
اپنی کتابیں، تصویریں، کھلونے، پرندوں کے رنگین پر، اور تمام ٹوٹی پھوٹی چیزیں بڑے
شوق سے دکھائے۔ بالکل اسی طرح میں نے تمہارے سامنے اپنے ماضی کی لپٹی ہوئی
صف کو کھول کر بچھا دیا تھا۔ لیکن تم نے میری آنکھوں پر اپنا آنچل ڈال دیا اور کہا

کہ دیکھو شفق پر بادلوں کا رنگ کیسا ہو رہا ہے! کاش! میں اس وقت تمہارا رنگین دوپٹہ پرے ہٹا کر شفق پر بادلوں کا اصلی رنگ دیکھ سکتا! آج جبکہ میری آنکھیں کھلی ہیں، میں پتھروں کے درمیان خاک پر بے یار و مددگار پڑا ہوں۔ میرے پاؤں میں زنجیر ہے اور میری آنکھوں میں آنسو ہیں اور میں ان خیابانوں کو یاد کر رہا ہوں جہاں بہار درختوں کو سبز پتوں کا لباس پہنانے آتی تھی، جہاں میرے پیڑوں پر میٹھے پھل لگتے تھے اور جہاں ندیاں رقص کرتی گذرتی تھیں اور جہاں نیلگوں فضاؤں میں، میں دونوں بازو پھیلا کر پرواز کیا کرتا تھا ۔۔۔۔!

تم نے میری آرزوؤں کے تمام دیوتاؤں کو زمین پر اوندھے منہ گرا دیا ہے۔ تم نے میرے اردگرد نقلی محبت کی خاردار باڑھ کھینچ دی ہے اور میرے سامنے بناوٹی الفاظ کے جعلی سکوں کا انبار لگا دیا ہے۔ میرے پاؤں تمہارے جھوٹے وعدوں کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اور یہ دلدل مجھے نیچے ہی نیچے کھینچ رہی ہے ۔۔۔
تم نے میری تمناؤں کو جلے بجھے سگریٹ سمجھ کر باہر گلی میں پھینک دیا ہے۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ مجھے کینز سے بھی ایسی امید نہ تھی۔ مجھے کسی سے بھی ایسی امید نہ تھی لیکن مجھے ہر ایک نے زخم لگائے ہیں۔ مجھے پھولوں کے عوض ہمیشہ کانٹے ہی ملے ہیں۔ اے جھکے ہوئے اداس فنگو فو! اپنے چہرے اوپر اٹھاؤ اور مجھے بتاؤ میرا وہ سورج کہاں طلوع ہوگا جس کی جستجو میں، میں تاریک راتوں کے طویل سلسلے میں سے گذر رہا ہوں؟ مجھے بتاؤ میں زخمی محبت کی اس امانت کو کس

کے سپرد کر دوں؟

میرے بھائیو! کمرے کی تمام کھڑکیاں بند کر دو اور دروازوں پر پردے گرا دو۔ میری نیک دل بہنو! کارنس پر موم بتیاں روشن کر کے میرے پلنگ کے قریب آ جاؤ۔ میری محبت کرنے والی ماں! اپنے بیٹے کی روتی ہوئی آنکھوں پر اپنا دوپٹہ ڈال دو اور جھک کر اس کی پیشانی پر اپنے مقدس ہونٹ رکھ دو۔ میرا چھوٹا بھائی کہاں ہے؟ اسے پردیس سے واپس بلا لو۔ اسے کہو کہ تمہارے بھائی کو کسی نے زہر دے دیا ہے اور وہ بستر مرگ پر تمہارے اداس اداس گیتوں کو یاد کر رہا ہے۔

مہربان چہرو! میرے قریب آ جاؤ۔ سماوار میں سبز چائے کی پتیاں ڈال دو اور جب کمرے میں اس کی خوشبو پھیل جائے تو میری بہنو! اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے چہرے روشن موم بتیوں کی طرف کر لو اور دھیمی دھیمی غمگین آواز میں مجھے وہ پرانا کشمیری گیت سناؤ جو ایک بہن پردیس سے آنے والے بھائی کے انتظار میں گایا کرتی ہے۔

خوبانی کے پیڑ برف سے ڈھک گئے ہیں۔

مجھے سماوار گرم کرنا ہو گا۔

مجھے آگ جلانی ہو گی

مجھے دروازے پر سے برف ہٹانی ہو گی۔

میرا بھائی آرہا ہے

میرا بھائی آرہا ہے —'

میرا بھائی کب آئے گا ماں! چلو ہم اپنے وطن چلے جائیں۔ چلو ہم کشمیر کی پہاڑیوں میں کوچ کر جائیں۔ ہم وہاں سے کیوں آ گئے تھے ماں؟ شہر ہمیں راس نہیں آئے۔ شہر والے ہم چرواہوں کی بولی نہیں سمجھتے۔ وہ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ کس ملک کی زبان ہے؟ کس دیس کا لباس ہے؟ کس درخت کے پھول ہیں اور کس چشمے کا پانی ہے؟ یہاں معبدوں میں خون ہوتے ہیں ماں! یہاں چراغ جلتے ہی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ یہاں مے خانوں میں وضو ہوتا ہے اور منبروں پر بوتلیں کھلتی ہیں اور کاغذوں پر محبت ہوتی ہے۔ یہاں سناٹے بولتے ہیں اور آوازیں گنگ ہیں۔ یہاں تاریکیاں جگمگاتی ہیں اور روشنیاں تاریک ہیں۔ ہم کہاں آ گئے ہیں؟ ہم کہاں نکل آئے ہیں؟

'HOW GREEN WAS MY VALLEY
AND VALLEY OF THOSE —
WHO HAVE GONE!'

میری گمشدہ محبت! میں تمہارے بالوں سے گرے ہوئے باسی پھول اپنے تاج میں لگاؤں گا۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ میں جہاں بھی ہوں گا، تمہاری یاد کا اٹھ کر خیر مقدم کروں گا میں تمہیں چاہتا تھا اور تمہیں ہمیشہ چاہتا رہوں گا۔

تم نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی تھی۔ تم مجھ سے کبھی محبت نہ کرنا۔

لیمپ کا تیل ختم ہو رہا ہے اور میرا سر بوجھل ہو رہا ہے۔ کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی اپنا لباس سمیٹ رہی ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ نہیں ابھی ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ ابھی مجھے کچھ دیر زندہ رہنا ہے۔ ان غموں کے لئے جو ابھی بیدار نہیں ہوئے ان آنسوؤں کے لئے جو ابھی نہیں بہے۔

اچھی لالہ! جہاں رہنا خوش رہنا۔ کبھی کسی بات کے لئے دکھی نہ ہونا۔ اگر کبھی کوئی تمہارے آگے منصور کا ذکر کرے تو اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دینا اور کہنا۔

"کوئی اور بات کرو"

صرف

منصور،

اس خط نے لالہ کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ مجھے فون بھی نہ کر سکی اور انتہائی منتشر حالت میں وہ بھاگی بھاگی میرے پاس پہنچی۔ اس نے مجھے کچھ نہ کہا اور خط میرے آگے رکھ دیا۔ میں اسے پہلے ہی پڑھ چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ آگ نزہت اور صرف نزہت کی لگائی ہوئی ہے۔ لالہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ وہ اب بھی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ جس نے بھی ایسا کہا ہے بالکل غلط کہا ہے اور اس کا سوائے منصور کے اس دنیا میں اور کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس ڈاکٹر سے کالج کے دنوں میں تھوڑی سی شناسائی ضرور رہی تھی مگر وہ تو ایک مدت ہوئی ختم

ہو چکی تھی۔ اور اب وہ صرف منصور اور صرف منصور کے لئے زندہ تھی اور زندہ رہنا

چاہتی تھی۔

مجھ سے جس قدر ہو سکا میں نے لالہ کو تسلی دی اور اسے یقین دلایا کہ میں منصور

کو سمجھاؤں گا اور اس پردے کو اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کرونگا جو نزہت نے اس

کی آنکھوں پہ گرا دیا ہے۔

"کلیم صاحب! مجھے نزہت سے ایسی امید نہ تھی۔ میں
اسے اپنی عزیز سہیلی سمجھتی تھی اور وہ میری بدترین دشمن نکلی۔
اس نے میری معصوم محبت کا خون بہانے کی کوشش
کی ہے اور کیا خبر وہ اس میں کامیاب ہو گئی ہو۔"

میں نے اُسے پھر دلاسا دیا

"دل چھوٹا نہ کرو لالہ! فتح آخر کار سچائی ہی کی ہوگی"

اس کے بعد لالہ آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی اور میں منصور کے گھر کی طرف چل

پڑا۔

منصور گھر پر نہیں تھا۔

اس کی والدہ پریشان تھی اور کہنے لگی کہ وہ رات بھر جاگتا رہا تھا۔ صبح اس نے کسی سے بات نہیں کی تھی اور بغیر ناشتہ کئے چلا گیا تھا۔ میں نے منصور کی والدہ کو بھی تسلی دی اور سیدھا اس کے دفتر پہنچا۔ دفتر سے پتہ چلا کہ وہ ایک ہفتہ کی چھٹی پر ہے۔ میں نے رات نو بجے تک ٹی ہاؤس میں اس کا انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا۔ میں سائیکل پکڑ سیدھا اس کے گھر پہنچا۔ منصور وہاں بھی نہیں تھا۔ اب مجھے فکر دامنگیر ہوا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا؟ میں نے مال کے سارے ہوٹل، سارے سنیما اور ساری تفریح گاہیں چھان ماریں مگر منصور کا کہیں بھی پتہ نہ چلا۔ پونے بارہ بجے رات جب ٹی ہاؤس بند کر کے گھر جانے لگا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ منصور

کہیں صوفی ہوٹل میں نہ گیا ہو۔ یہ ہوٹل ــــ بلکہ گھٹیا قسم کا قہوہ خانہ شہر کے وسط میں ایک گنجان ترین محلے میں تھا جہاں منصور کے کچھ دوست اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ دیر کی بات ہے منصور ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گیا تھا۔ میرا اس فضا میں دم گھٹنے لگا تھا لیکن منصور بڑے اطمینان سے وہاں بیٹھا تھا اور دیر تک اپنے دوستوں سے باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ لوگ اگرچہ کمبل پوش تھے اور ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے مگر ان کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ان کی گفتگو کا موضوع منطق اور طب تھا۔ اس دن میں نے عہد کر لیا تھا کہ منصور کے ساتھ ایسی بیزار کن جگہ پر پھر کبھی نہیں آؤں گا لیکن اس حادثے کے بعد جب مجھے صوفی ہوٹل کا خیال آیا تو میرے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ منصور وہیں گیا ہوگا۔

چنانچہ میں نے ٹی ہاؤس بند کرنے کے بعد سائیکل اٹھائی اور گنجان بازاروں اور تنگ و تاریک بوسیدہ گلیوں میں سے ہوتا ہوا صوفی ہوٹل پہنچ گیا۔ ہوٹل کا دروازہ بند تھا مگر اندر روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے سائیکل باہر کھڑی کر کے تالا لگایا اور دروازے پر دستک دی۔ دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھلا اور ایک آدمی نے جھانک کر دیکھا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"منصور صاحب اندر ہیں؟"

'جی ہاں'

اس آدمی نے دروازہ کھول دیا اور جب میں اندر داخل ہو گیا تو دروازہ پھر بند ہو گیا۔

'وہ سب سے پچھلے کمرے میں بیٹھے ہیں'

میں میزوں پر الٹی رکھی ہوئی کرسیوں کی قطار میں سے گزرتا ہوا پچھلے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر پندرہ بیس کے قریب عجیب عجیب شکلوں والے لوگ بینچوں اور کرسیوں پر کمبل، شالیں اور چادریں اوڑھے بیٹھے تھے۔ کمرے کی فضا حمام ایسی تھی اور دیواروں پر گھٹیا قسم کے کیلنڈر لٹک رہے تھے۔ ایک طرف کانٹے دار ونگل کا بڑا سا اشتہار چسپاں تھا۔ منصور ان لوگوں کے درمیان کرسی پر دونوں ٹانگیں رکھے بیٹھا بڑی گرم جوشی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اندر داخل ہوتے دیکھا اور کچھ کہے سنے بغیر اپنی باتوں میں منہمک رہا۔ درمیان میں ایک گول میز بچھا تھا۔ جس پر سگرٹوں کی کئی ایک ڈبیاں کھلی پڑی تھیں۔ پاس ہی تھال میں پان تھے اور تارا مارکہ بیڑیوں کا کھلا بنڈل اور ماچس پڑی تھی۔ وہاں تقریباً سبھی لوگ سگریٹ پی رہے تھے اور پان کھا رہے تھے۔ منصور کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ہونٹوں پر پان کی پپڑیاں جمی تھیں اور سگریٹ اس کے داہنے ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔ میں خاموشی سے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ منصور کے دوستوں نے فوراً میرے لئے چائے منگوائی اور سگرٹوں کی ڈبیا میرے آگے کر دی۔ میں چائے پیتے ہوئے منصور

نیں سننے لگا۔ وہ ایک لمبی سیاہ ڈاڑھی والے پتلے دبلے درویش نما آدمی
بحث کر رہا تھا۔ جس وقت میں وہاں پہنچا منصور کہہ رہا تھا۔
"قدیم حکمانے اگرچہ مادے کی تین حالتیں مقرر کی ہیں جن میں پہلی حالت کا
قدر' دوسری کا 'وجود' اور تیسری کا 'غیر مرئی' ہے۔ اس کے علاوہ اس کی
لتیں اور ہیں۔ 'کیفیت' اور 'کمیت'۔ کیفیت اور کمیت دنیا کی ہر شے میں
ر ہے۔ اسی لئے اقبال جوابِ شکوہ میں ذاتِ باری کی جانب سے انسان
فات گنواتے ہوئے کہتا ہے کہ

عالمِ کیف ہے دانائے رموزِ کم ہے
ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے'

اس پر وہ داڑھی والے بزرگ نے اعتراض کیا۔
"لیکن آپ شے کو نفسِ شیئت سے کیونکر جدا کریں گے؟"
"ہم اسے جدا کیوں کریں؟ ہر شے کا ایک نفس ہے۔ ہم
اس نفس کو اس کی شیئت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ محسوس
کرنے، سمجھنے اور تحقیق کرنے سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ یہ نفس
ہر شے میں مشترک ہے۔ ہر شے کی ظاہری صورت میں اختلاف
اور فرق ہے لیکن نفس ایک ایسا ہے اور اس میں کوئی فرق
موجود نہیں۔ اس کی تائید اقبال یوں کرتا ہے

یہ کثرت ہے وحدت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر
چمک اس کی بجلی میں، تارے میں ہے
یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے

اسی نفس کو آپ ذاتِ مطلق کے نام سے بھی پکار سکتے ہیں پس اس بات سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگر ہم اشیاء کے اس نفسِ مشترک تک پہنچ جائیں تو ہم پر کائنات کی ہر شے کی ماہیت اجاگر ہو جائے گی۔ پھر اگر کوئی شخص درخت کو ہلائے تو ہو سکتا ہے اس کے ساتھ بجلی کا کھمبا بھی ہلنا شروع کر دے،

"مگر منصور صاحب! کیا آپ ذرے کے انفرادی اثر سے اس کے اجتماعی تاثر کا اندازہ لگا سکیں گے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا اشیاء کی ذات تک پہنچنا محال ہے۔ علم ہمیں یہاں تک نہیں پہنچا سکتا وہ ہمیں صرف ہماری جہالت کی خبر دیتا ہے ——"

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ علم ہماری رہبری نہیں کر سکتا؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ہماری رہبری نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ وہ ہمیں اشیاء کی غایتِ اصلی سے باخبر نہیں کر سکتا"

'کیوں؟'

'اس لئے کہ جن ذرائع سے ہم تک کسی شے کا علم پہنچتا ہے وہ ناقابلِ اعتبار ہیں۔'

'مثلاً'

'مثلاً ہمارا علم پانچ ذرائع کا محتاج ہے۔ ہم چکھ کر، سن کر، دیکھ کر، سونگھ کر اور ہاتھ لگا کر بتا سکتے ہیں کہ فلاں چیز میٹھی ہے، خوشبودار ہے، سریلی ہے، خوبصورت اور نرم ہے۔ ہم ایک رنگ کو دیکھتے ہیں کہ وہ سبز ہے لیکن اگر ہم یرقان میں مبتلا ہو جائیں تو وہی رنگ ہمیں زرد نظر آئے گا۔ زکام ہو جائے تو خوشبودار پھول بیکار ہوگا۔ گرمی سے حسِ ذائقہ تبدیل ہو جائے تو ہر شے کڑوی ہو گی۔ ثابت ہوا کہ ہمارے علم کے ذرائع ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ہمیں کسی ایسے ذریعہ کی جستجو کرنی چاہیئے جس پر موسموں کے تاثرات اور بیماریوں کا قطعی اثر نہ ہو جو ہر حالت اور ہر عالم میں ہماری درست اور صحیح رہنمائی کرے۔'

'آپ کے خیال میں وہ کونسا ذریعہ ہے۔'

'میں اس وقت وجدان پر بحث نہیں کروں گا۔ میں تصوّف سے پرے ہٹ کر خالص طبیعاتی نظریات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک اشیاء کی ہیئتِ اصلی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اپنے ذہن کی

بجائے اپنی طبع سے مدد لینی چاہیئے'۔

'کیا ہمارا ذہن ہماری طبع سے بالکل مختلف ہے؟'

'مختلف ہی نہیں بلکہ اس کے مقابل ہے۔ میرا دعوےٰ ذہن کی صلاحیتوں سے کیر انقطاع کا نہیں بلکہ ذہن اور طبع کی مطابقت اور تطبیق کا ہے انسان فطرتاً "سلیم الطبع" ہے۔ یعنی پیدائش کے وقت اس کی طبع سالم ہوتی ہے مکمل حالت میں ہوتی ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی طبع پوری طرح بیدار ہوتی ہے اور ذہن دبا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت قطعی طور پر خالی الذہن ہوتا ہے۔ اس کے ذہن کا حوض خشک ہوتا ہے۔ وہ وقت پر سو جاتا ہے اور ٹھیک وقت پر بیدار ہوتا ہے یعنی جب اسے بھوک لگی ہو۔ اگر اسے دودھ نہ ملے تو وہ انگوٹھا چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اپنے گرد و پیش سے متاثر ہونے لگتا ہے اور ذہن بننا شروع ہو جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ طبع دبنے لگتی ہے۔ پھر ذہن اسے اپنے اشاروں پر نچاتا ہے۔ وہ بات بات پر ذہن سے مشورہ لیتا ہے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر وسوسے اٹھتے ہیں'۔

'پھر طبع کی کیا صفات ہیں؟'

'بو علی سینا کے قول کے مطابق آدمی کی طبع ہی اس کی بہترین دوست ہو سکتی ہے۔ اور اگر وہ نہ بھی کہتا جب بھی طبع کی دوستی پر شک نہیں کیا

جا سکتا تھا۔ ہماری طبیع صرف اسی وقت بیدار ہوتی ہے جب ہمارے
ذہن کا غلبہ ہم پر بے حد خفیف ہوتا ہے۔ پھر یہ فطری طور پر ہماری درست
رہنمائی کرتی ہے اور یہ ناممکن بات ہے کہ اس کے بتائے ہوئے راستوں
پر چل کر ہم بھٹک جائیں۔ جانوروں کا ذہن محدود ہوتا ہے۔ ان کی
طبیعت پر ان کے ذہن کا غلبہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ سو فیصدی
اپنی طبیع کے زیرِ کمان ہوتے ہیں۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہمارا ذہن ہماری طبیع پر غلبہ کیونکر حاصل کرتا ہے؟"

"ہمارا ذہن ہماری طبیع پر اس طرح غلبہ حاصل کرتا ہے کہ وہ تھوڑی تھوڑی
ہر علم میں ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ ہر طرح کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے
اور کئی اطراف کو بٹ جاتا ہے۔ کئی طرف منقسم ہو جاتا ہے۔ وہ یکسوئی اور
یک جہتی کھو بیٹھتا ہے۔ وہ قسم قسم کے علوم کا کباڑ خانہ بن جاتا ہے اور آخر کار
ہماری طبیع کو بگاڑ دیتا ہے۔ مثلاً ہم باغ میں بیٹھے یونہی کسی پھول کی پتی
نوچ کر منہ میں ڈال لیتے ہیں اور چبانا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں
اس وقت بالکل بھوک نہیں لگ رہی ہوتی۔ اس وقت ہمارے ذہن
نے ہمیں فریب دیا ہوتا ہے۔ ہمارا ذہن چاہتا ہے کہ اس خوبصورت
شے کو منہ میں ڈالا جائے، معدہ بالکل نہیں چاہ رہا ہوتا۔ اگر ہم ایک ہی
تصور، ایک ہی علم میں کھو جائیں تو لازمی طور پر ہمارا تخیل زیادہ طاقتور

اور بھرپور ہوگا......'

'ذرا ٹھہریے ـــــ پہلے اس بات کی وضاحت کر دیجئے کہ تخیل سے آپ کی مراد کیا ہے؟'

منصور مسکرایا۔ اور پائپ کو میز پہ رکھ کر بولا۔

'یہ باب تفعّل کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں خیال کو فکر کے بعد جان بوجھ کر اور بالارادہ سجانا۔ مثال کے طور پہ ہم سات میزیں دیکھتے ہیں جو مختلف ہیں۔ ہم ذہن میں ایک میز کا تخیل قائم کرتے ہیں جو کسی میز سے ملتا تو نہیں لیکن اس میں ہر میز کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہوگی۔ میرا خیال ہے اتنی وضاحت کافی ہے'

'جی ہاں شکریہ ـــ اب آپ آگے چلیں'

'تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر ہم اپنے ذہن کی پوری قوت کو ایک سمت خرچ کریں تو ہم شئے مطلوبہ تک بڑی تیزی سے پہنچ سکتے ہیں۔ ہم اپنے ذہن کے کباڑخانے میں جمع شدہ اشیاء کو ضائع تو کسی طرح نہیں کر سکتے۔ ہاں انہیں تحت الشعور، لاشعور اور پھر فوق الشعور میں ضرور پھینک سکتے ہیں ـــ'

'معاف کیجیے گا، فوق الشعور سے آپ کا مطلب کیا ہے؟'

'فوق الشعور کو آپ وجدان کہہ لیجئے یا الہام [illegible]

جو کائنات میں جاری وساری ہے۔ ہماری ساری زندگی میں یہ فوق الشعور
کام کرتا ہے اور مرنے کے بعد بھی کائنات میں ہماری نمائندگی کرتا ہے
جب ہم سو جاتے ہیں تو ہمارے پانچوں حواس بھی سو رہے ہوتے
ہیں مگر ہمارا فوق الشعور اس وقت بھی بیدار ہوتا ہے اور ہماری حفاظت
کر رہا ہوتا ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جس کی مدد سے ہم بعض اوقات ہلکے
سے کھٹکے پر بھی جاگ اٹھتے ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جو ہمیں ذرا سی آہٹ
پر چوکنا کر دیتی ہے۔ ہمارا لاشعور ہر قسم کی چیزوں کا کباڑ خانہ ہے۔ یہاں
دنیا کی ہر دیکھی، سنی، چکھی، بولی اور مَس کی ہوئی شے موجود ہے۔ ہمارے
ذہن کے ہر خانے سے کٹ کر آخر کار ہر خیال، ہر ناکام آرزو اور ہر بیکار
صورت اسی خانے میں آن گرتی ہے اور جو چیز یہاں سے بھی نکل جاتی ہے
وہ فوق الشعور میں جا کر محفوظ ہو جاتی ہے۔ ہمیں معلوم نہ ہو لیکن ہمارے
فوق الشعور کو پیدائش سے لے کر موت تک ہر بات، ہر حرکت کا علم
ہوتا ہے۔ بلکہ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ
ہم ماں کے پیٹ میں آنے سے پہلے کہاں تھے ؟ کیا تھے ؟ اور کس حالت
میں تھے ؟ مگر وقت کے ساتھ ساتھ چونکہ ہماری طبع پر ہمارا ذہن جو ہمارے
ماحول کا آئینہ ہوتا ہے، اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ہم اسے بالکل
بھول جاتے ہیں لیکن ہمارے فوق الشعور کو رتی رتی حال معلوم ہوتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ہمیں اچانک کسی جنگل، وادی، شہر، گلی، محلے اور دریا کے قریب سے گذرتے ہوئے وہم سا ہونے لگتا ہے کہ ہم اس سے پہلے بھی کبھی وہاں آئے تھے۔ اس وقت یہی فوق الشعور کام کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہی وہ فوق الشعور ہے جس نے گوتم بدھ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اب میں پھر ذہن کی طرف آتا ہوں۔ اگر ہم اپنے ذہن کی صلاحیتوں کو ایک طرف لگا دیں تو ہم اپنے مقصد میں بڑی جلدی کامیاب ہو سکتے ہیں اور صحیح نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر صوفیا حضرات ذہنی طور پہ اپنے مرشد کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں ایک ہستی، ایک محبوب کا تصور قائم کر لیتے ہیں اور اسی کے گرد اپنے تمام تصورات کو پھیلا دیتے ہیں۔ اب اگر ہم تیس سال تک ذہن سے متاثر ہوتے رہے ہیں اور تیس سال تک ہمارا ذہن بنتا رہا ہے تو لاشعور میں جمع شدہ اشیاء پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے بھی اتنی ہی مدت درکار ہو گی۔ تب کہیں جا کر ذہن اور طبع میں توازن قائم ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ دعا کے لئے طبع کا خلوص ضروری ہے اور وہ عمر بھر ذہن کے تابع رہے ہوتے ہیں اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی ایک عمر کی ضرورت ہوتی ہے جو وہ نہیں کر سکتے) چنانچہ جب یہ عرصہ پورا ہو چکتا ہے تو عرفان نصیب ہوتا ہے۔

یعنی طبیع اپنی اصلی حالت میں سامنے آجاتی ہے۔ ان کا وہ فوق الشعور جو ذہن کی تعمیر سے پہلے ان کے ساتھ تھا اور جو ذہن کی تعمیر کے ساتھ ان سے جُدا ہو گیا تھا، پھر ان کے ساتھ آن ملتا ہے'

بوڑھے نے سوال کیا۔

"اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں صرف وہی علم حاصل کرنا چاہیئے جو ضروری ہو؟"

"جی نہیں یہ نہیں ــــ یہاں اس بات کا خیال رہے کہ میرے مخاطب منتخب اور چنے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ لوگ جن کی ہمدردی اور اخلاق ہمہ گیر ہے، جو ہر مریض کی چارپائی پر جا کر اس کی مزاج پرسی نہیں کرتے بلکہ ہسپتال سے باہر کھڑے ہو کر محبت اور ہمدردی کی ایک بیکراں نگاہ ڈالتے ہیں اور پھر تنہائی میں جا کر اس کا علاج سوچتے ہیں۔ میں صرف ایسے انسانوں سے مخاطب ہوں ــــ ہمیں دنیا کا ہر علم حاصل کرنا چاہیئے۔ بلکہ اگر ہم دیانتداری سے علم سے رسوخ پیدا کریں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ دنیا کا ہر علم ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ ہمیں یہ تمام علوم حاصل کرنے چاہئیں لیکن منتخب وہی علم کیا جائے جس کی ہماری زندگی کو ضرورت ہو۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ زندگی کیا ہے اور کیوں ہے؟ صاف اور سیدھے لفظوں میں زندگی یہ ہے کہ ہم زندہ رہیں، کام کریں اور آرام

کریں۔ کیوں ہے؟ اس لئے کہ زندہ رہا جائے، سویا جائے اور کام کیا جائے اور ذمّہ داریوں کو نبھایا جائے۔ زندگی کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے نفس کی عزت و تکریم کی جائے۔ بڑا آدمی وہی ہے جو ذمّہ داری محسوس کرتا ہے۔ ایک شخص روپیہ اس لئے کماتا ہے کہ اس کے بچّے بھوکوں مرتے ہیں۔ اس کی نسبت وہ انسان زیادہ بلند ہے جو اس لئے کماتا ہے کہ کہیں اس کے بچے بھوکوں نہ مرنے لگیں۔ اوّل الذکر کے بچّے تڑپتے ہیں۔ وہ یہ منظر دیکھ نہیں سکتا اور جلدی سے کوئی کام شروع کر دیتا ہے اور موخرالذکر اپنے بچوں کی بھوک کے تصوّر ہی سے کانپ جاتا ہے اور کام کرتا ہے۔

ایسی زندگی کے لئے ہمیں ہر قسم کے علم پر عبور حاصل کرنے کے بعد صرف وہی علم انتخاب میں لانا چاہیئے جس کی ہماری زندگی کو ضرورت ہو اور جو زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اگر ہم نے پورے علوم پر نگاہ نہ رکھی اور صرف جزوی طور پر کوئی علم حاصل کر لیا تو وہ علم ادھورا ہوگا اور ہمیں دھوکا دے سکے گا۔ اس لئے کہ وہ ایک طویل سلسلے کی کڑی ہے اس کڑی کو اپنانے کے لئے ہمیں اس ساری زنجیر کو بھی قابو میں کرنا ہوگا۔ نہیں تو ہمارا علم بھی زندگی کے لئے اتنا ہی نقصان دِہ ہوگا جتنا اس حکیم یا ڈاکٹر کا علم جو بدن کے امراض تو جانتا ہے لیکن نفسیات

کے علم سے بے بہرہ ہے۔"

اس پر بوڑھے نے سگریٹ سلگالیا اور ذرا مسکرا کر بولا:

"منصور صاحب آپ کا زندگی کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟"

منصور نے آنکھیں جھکالیں اور پائپ پینے لگا۔ بجلی کی روشنی میں اس کا تھکا تھکا اُس چہرہ جل رہا تھا۔ ایک لمحہ اسی طرح بیٹھنے کے بعد اس نے نگاہیں اٹھا بوڑھے کو دیکھا اور کہا:

"میں بڑی معتدل اور پُرامن زندگی کا قائل ہوں۔ مجھے صرف ایک چھوٹا سا مکان، دو وقت کی روٹی اور محبت کرنے والی بیوی کا قرب چاہیئے۔ باقی تمام چیزیں میں ان لوگوں کے لئے چھوڑتا ہوں جو فطری اور پاکیزہ زندگی کے اہل نہیں ہیں۔ ہمیں تمام علوم حاصل کر کے خاموشی اور ذمہ داری سے بسر کرنی چاہیئے اور یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ فطرت ہمیشہ حاوی رہے گی۔ (تحقیق کہ انسان گھاٹے میں ہے (قرآن)) موت کی کلائی پر ہاتھ ڈالنے والا بھی مرجائے گا۔ کوئی ابنِ مریم موت سے نہ بچ سکے گا۔ یہی زندگی ہے۔ اسی موت میں حیات کا پیام ہے ؎

اُتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

ایک پردہ اٹھتا ہے تو چار پردے گر پڑتے ہیں۔ فطرت کے اسرار

میں کمی نہ آئے گی۔ میں اپنی محبت کرنے والی بیوی اور پیارے بچوں میں خوش رہنا چاہتا ہوں۔ یہی زندگی کی معراج اور سارے علوم کا نچوڑ ہے۔"

یہاں پہنچکر بحث ختم ہوگئی اور چائے کا دور شروع ہو گیا۔

رات کے پورے تین بج رہے تھے جب میں اور منصور اس گنجان ترین آبادی سے باہر نکلے۔ میں نے اس وقت منصور سے لالہ کے متعلق کوئی بات کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ رات بڑی سرد تھی اور سڑکیں سنسان تھیں۔ منصور چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ اپنے گھر کی طرف مڑ گیا اور میں اپنے گھر کی طرف آگیا۔

دوسرے روز صبح صبح لالہ کا فون آگیا۔

میں نے اسے گذشتہ رات کی ملاقات اور عجیب و غریب بحث کا حال سنایا۔ اس نے کہا کہ وہ اسے بہت جلد ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے چاینیجے ٹی ہاؤس آنے کا کہا اور خود منصور کے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔ منصور گھر پہ موجود تھا اور اپنے دیوان خانے میں بیٹھا ستار درست کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس کے ہاتھوں میں ستار نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر اس نے ستار ایک طرف کر دیا اور میز پر سے پائپ اٹھا کر اس میں تمبا کو بھرنے لگا۔

"منصور تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

میرے اس سوال پر اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ذرا مسکرایا اور گردن

جھکا کر پائپ سُلگانے لگا۔ میں بھی خاموشی سے سگریٹ پینے لگا۔ منصور بڑے سکون سے پائپ کا ہلکا ہلکا دھواں اڑاتا رہا۔ پندرہ منٹ گذر گئے اور ہم میں سے کوئی نہ بولا۔ کمرے کی خاموشی ناقابلِ برداشت حد تک بوجھل ہو گئی۔ آخر میں نے کہا۔

"منصور تمہاری آنکھوں پر کسی نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے ہیں۔ تم روشنی میں بھی کچھ نہیں دیکھ سکتے۔"

منصور بڑی گہری اور طنز آمیز آواز میں بولا:

"میں نے اندھیرے میں وہ کچھ دیکھ لیا ہے جو روشنی مجھ سے چھپاتی رہی تھی۔"

میں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور منصور کے ذہنی انتشار کا جائزہ لیتا رہا۔

"لیکن منصور تمہیں لالہ کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ لڑکی بڑی اچھی ہے اور تم سے محبت کرتی ہے۔"

منصور نے صوفے کے ساتھ پشت لگا دی اور آہستہ سے بولا:

"وہ اس سے پہلے بھی محبت کرتی تھی، وہ اس کے بعد بھی محبت کرے گی اور عمر بھر محبت کرتی چلی جائے گی۔ میل ٹرین کی طرح اس کی محبت ہر جنکشن پر کھڑی ہو کر پانی اور کوئلہ حاصل کرتی ہے

اور آگے چل پڑتی ہے:

"منصور! خدا کے لئے کسی کی باتوں میں آ کر اپنا مستقبل تباہ نہ کرو"

منصور بڑے درشت لہجے میں بولا۔

"میرا مستقبل تباہ ہونے سے بچ گیا ہے اور پھر اپنے مستقبل کو جس طرف چاہوں موڑ سکتا ہوں"

"دیکھو منصور اگر تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو جو کچھ میں کہنے لگا ہوں اسے غور سے سنو، اور پھر سوچ کر مجھے بتاؤ کہ جن لوگوں پر اعتبار کر کے تم نے ایک بے گناہ روح کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے وہ تمہارے ساتھ کہاں تک مخلص ہے۔ میں اپنے عمر بھر کے تجربے اور پچھلے چھ ماہ کے واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تمہیں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ لالہ بے گناہ ہے اور نزہت نے اس کے خلوص کو دھوکا دیا ہے اور اس کی محبت پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لالہ اپنی گذشتہ زندگی میں چند ایک خوفناک غلطیاں کر چکی ہے مگر آج وہ اپنے دل کی گہرائیوں سمیت تمہارے اور صرف تمہارے ساتھ ہے، اگر تم نے اس کی محبت پر شک کیا تو تمہیں

آگ کے گرم ہونے اور سورج کے روشن ہونے پر بھی شک کرنا پڑے گا۔ اگر تم نے لالہ کی وفا کو بدگمانی سے دیکھا تو تمہیں مجھے بھی بے وفا کہنا پڑے گا۔ نزہت تمہیں چاہتی ہے منصور اور وہ تمہاری محبت میں اس قدر اندھی ہو گئی ہے کہ اس نے دوستی کے نازک پھولوں کو بھی اپنے پاؤں تلے مسل ڈالا ہے،

منصور خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ جب میں بات ختم کر چکا تو وہ اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں نے پھر اپنی بات پر زور دیا۔

"تمہیں نزہت کا وہ خط یاد نہیں جس میں اس نے ایک تشنہ لب مسافر کا ذکر کیا تھا جو پیاس سے نڈھال ہو کر دریا کے کنارے پہنچے اور وہ دریا ایک سراب ثابت ہو؟ تمہیں فون پر اس کی باتوں کا محبت بھرا لہجہ یاد نہیں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اس روز وہ اس قدر بھڑکیلا لباس پہن کر کیوں آئی تھی اور تمہیں جان بوجھ کر ریڈیو سٹیشن کیوں لے گئی تھی؟ منصور! خدا کے لئے کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے اسباب پر اچھی طرح سوچ بچار کر لو، مبادا تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے ــــ"

"لیکن ــــ" منصور نے رکتے ہوئے کہا ــــ "لیکن نزہت نے مجھے لالہ کا خط دکھلا دیا تھا اور وہ خط اس نے ڈاکٹر کو لکھا

تھا۔ میں کیسے اعتبار کر لوں کہ وہ میرے ساتھ ہے؟'

'لالہ کب کہتی ہے کہ اس نے ڈاکٹر کو خط نہیں لکھے؟ لیکن وہ اس کا زمانۂ جہالت تھا جو گذر چکا ہے۔ تم حال کی روشنی میں دیکھو منصور! ماضی کے اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش نہ کرو۔ خواہ مخواہ بھٹک جاؤ گے'

منصور ایک جگہ بیٹھ گیا اور پائپ دانتوں تلے دبا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

'اس میں زیادہ سوچنے کی کوئی بات نہیں۔ تم آج چار بجے ٹی ہاؤس پہنچو۔ میں نے لالہ کو بلا بھیجا ہے میں چاہتا ہوں کہ آج ہر بات کی صفائی ہو جائے تاکہ ہم آئندہ کے لئے کوئی تعمیری پروگرام بنا سکیں'

منصور کچھ نہ بولا۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں نے اسے مزید کچھ سمجھانا مناسب نہ سمجھا اور ایک بار پھر اُسے چار بجے آنے کا کہہ کر باہر نکل آیا۔

منصور ساڑھے چار بجے ٹی ہاؤس پہنچا۔ لالہ آدھ گھنٹے سے کیبن میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وہ ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تو میں نے اسے لالہ کے کیبن میں بھیج دیا۔ پہلے وہ اندر داخل ہوتے ہوئے جھجکا لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر جلدی سے پردہ اٹھا اندر داخل ہو گیا۔ لالہ نے اسے سہمی ہوئی اداس آنکھوں سے دیکھا

اور اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی۔ منصور بھی چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا اور پائپ نکال کر اسے دیا سلائیوں سے صاف کرنے لگا۔ کتنی ہی دیر کیبن میں بالکل خاموشی طاری رہی۔ منصور پائپ پیتا رہا اور لالہ دھڑکتے دل کو سنبھالے سوچتی رہی ——— سوچتی رہی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ بجھی بجھی آواز میں بولی۔

'منصور! ——— تم مجھ سے ناراض ہو ناں؟'

منصور خاموش رہا۔

'اب تم مجھ سے کبھی نہ بولو گے منصور؟'

منصور پھر بھی نہ بولا۔ لالہ بھی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا:

'منصور! اتنا سخت خط لکھنے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتے۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع تو دیتے۔ منصور! میں لاکھ گناہگار سہی لیکن ہرجائی نہیں ہوں۔ تم نے اتنی جلدی نزہت کی باتوں کا اعتبار کر لیا؟ تمہیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ وہ جھوٹ بھی بول سکتی ہے اور مجھ پر بہتان بھی لگا سکتی ہے؟ منصور! میں نے اپنی محبت کی ساری پونجی تمہارے قدموں پر ڈھیر کر دی تھی۔ میں نے تمہاری محبت کی روشنی میں اپنے خوابوں کو پرواز عطا کئے تھے۔ میں نے تو تم سے ہمیشہ ساتھ نبھانے کا عہد کیا ہوا تھا۔ پھر میں تمہیں کیسے دھوکا دے سکتی تھی؟ منصور! تمہیں فریب دے کر تمہارے خلوص

اور تمہاری معصوم محبت کا گلا دبا کر میں کیسے اور کیونکر زندہ رہ سکتی ہوں ؟ تمہیں میرے خلاف ورغلایا گیا ہے۔ تمہاری آنکھوں پر کسی نے پٹی باندھ دی ہے۔ اب تمہیں ہر طرف شکوک و شبہات کے اندھیرے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بولو منصور! میں نے کب تمہاری محبت کو جھٹلایا تھا؟ میں نے کب تمہارے خلوص کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی؟ بولو منصور! تم کچھ تو بولو۔ کچھ تو کہو!'

منصور نے تیز نگاہوں سے لالہ کو دیکھ کر بڑے پُرسکون لہجے میں کہا۔

'آنسو نہ بہاؤ! انہیں کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔ جو کچھ میں تم سے پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتی جاؤ۔'

لالہ نے دوپٹے کے پلّو سے اپنی آنکھیں خشک کریں۔

'تم ڈاکٹر کو خط لکھتی ہو؟'

'بالکل نہیں'

'تم اس سے ملنے نہیں جاتی؟'

'میں تو اس کی شکل تک بھول گئی ہوں منصور!'

'کیا یہ غلط ہے کہ تمہارے دل میں اس کی محبت بدستور موجود ہے؟'

'منصور! میرے دل میں صرف تمہاری محبت ہے اس گھر میں صرف ایک ہی قندیل روشن ہے جس پر تمہارا نام لکھا ہوا ہے۔ خدا کے

لئے میری باتوں پر یقین کرو میں صرف تمہاری ہوں اور تمہارے
لئے زندہ ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت میرے دل سے تمہارا خیال
جدا نہیں کر سکتی۔ میں پہلے بھی تمہاری تھی، آج بھی تمہاری ہوں
اور کل بھی تمہاری رہوں گی۔ نزہت نے میرے ساتھ جو سلوک
کیا ہے مجھے اس کی امید نہ تھی۔ میں نے اسے اپنا ہمدرد سمجھا
تھا اور وہ ڈائن نکلی۔ خیر اگر اس نے ایک سہیلی کو دھوکا دیا ہے تو
اس کا بدلہ وہ خدا سے پائے گی۔ خدا بھی ایسے گناہ معاف نہیں
کیا کرتا ـــــــ'

منصور کے ذہن میں بیک وقت ان گنت خیالوں کے چکر گھومنے لگے۔ ایک طرف
لالہ بول رہی تھی۔ دوسری طرف کلیم اور تیسری جانب نزہت چیخ رہی تھی اور منصور
ان کے درمیان بیٹھا کبھی اس طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی اس طرف سن رہا تھا۔ وہ کس
کا اعتبار کرے اور کس پر اعتبار نہ کرے۔ وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ اس نے جلدی
سے اپنا سر جھٹک دیا اور اتنا کہہ کر کیبن سے باہر نکل آیا۔

"اگر تم سچی ہو تو منصور تمہارے لئے جان بھی قربان کر دے گا اور
اگر تم اسے دھوکا دے رہی ہو تو وہ تمہیں آسانی سے نظر انداز
کر دے گا۔"

میں نے منصور کو مشورہ دیا کہ وہ نزہت کا دل لینے کے لئے اس سے اظہارِ محبت کرے۔ اگر اس نے .... محبت کا جواب محبت میں دیا تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور اس نے محبت میں پاگل ہو کر لالہ کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ پہلے تو منصور کو یہ عجیب سا لگا کہ وہ ایک ایسی لڑکی سے جھوٹ موٹ کا اظہارِ عشق کرے جس کی وہ آج تک بے حد عزت کرتا رہا تھا اور جس پر اس نے کبھی ایسی نگاہ نہ ڈالی تھی۔ لیکن جب اسے لالہ کے متعلق اپنے شبہات دور کرنے کا خیال آیا تو وہ اس ناٹک کے لئے تیار ہو گیا۔

دوسرے دن سہ پہر کے بعد منصور نے نزہت کو بلا بھیجا۔ وہ فوراً تانگے میں بیٹھ کر نی ہاؤس پہنچ گئی۔ منصور اسے وہیں سے لارنس باغ لے گیا۔ اخیر فروری کی شام

بڑی خوشگوار تھی۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر سبز سبز نئی پتیاں پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہوا میں شروع بہار کی نیم بیدار مستی اور مہک تھی۔ گھاس کے قطعوں کے ارد گرد کیاریوں میں ڈیزی کے پھول رنگ برنگ پلکیں اٹھائے سیر کرنے والوں کو تک رہے تھے اور آپس میں سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔ باغ میں کافی رونق تھی۔ اوپن ایئر ٹی سٹال میں، باہر درختوں کے نیچے کرسیوں پر لوگ بیٹھے چائے اور کافی پی رہے تھے۔ درختوں میں پرندے شور مچا رہے تھے اور زمین پر لوگ بول رہے تھے۔ منصور کا خیال تھا کہ کیبن میں بیٹھا جائے مگر کیبن رکا ہوا تھا۔ چنانچہ انہیں مجبوراً املی کے ایک گھنے درخت تلے بیٹھنا پڑا۔ نزہت آج شنیل کا ہلکا گلابی سوٹ پہن کر آئی تھی جو اس کا بھائی اس کے لئے کراچی سے لایا تھا۔

'شنیل تو یہاں کافی مہنگی ہو گی؟'

نزہت بڑے انداز سے آنکھیں گھما کر بولی۔

'جی ہاں۔۔۔ لیکن کراچی میں سستی ہے۔ یہاں تو کپڑا ویسے ہی بہت مہنگا ہے۔'

بیرا اُن کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ منصور نے پوچھا۔

'آپ چائے پئیں گی یا کافی؟'

'میرا خیال ہے کافی بہت گرم ہوتی ہے۔ میں چائے پیوں گی'

'بہت اچھا! بیرا۔۔۔ ایک چائے اور ایک کافی'

بیرا آرڈر لے کر چلا گیا۔ منصور نے کہا۔

"دراصل موسمِ بہار کے آغاز میں شام کے وقت کافی پینا ایسا ہی ہے جیسے پرانے ایتھنز کے کھنڈرات میں بیٹھ کر سفوکلیز کا کوئی المیہ پڑھا جائے"۔

نزہت مسکرائی اور اس کا نچلا بھنچا ہوا ہونٹ ذرا سا کھل گیا۔

"نزہت تم نے تو یونانی ادب ضرور پڑھا ہوگا"

نزہت کچھ گھبرا سی گئی۔ اس لئے کہ وہ اپنے محلّے کے دو ایک یونانی حکیموں کو تو جانتی تھی مگر یونانی ادب کا نام اس نے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ تاہم جلدی سے بولی۔

"جی ہاں کیوں نہیں۔ یونانی ادب بڑا دلچسپ ادب ہے"

منصور کے نزدیک ادب کی یہ تعریف کہ وہ بڑا دلچسپ ادب ہے انتہائی گھٹیا اور مبہم تعریف تھی۔ اس نے فوراً موضوع بدل ڈالا اور نزہت کی دلچسپی کی بات شروع کر دی۔

"تم کونسی لپ سٹک استعمال کرتی ہو؟ تمہارے نیل پالش کا رنگ بڑا قدرتی ہے۔ اور نزہت یہ تمہارے چہرے پر داغ سے کیا ہیں؟ معلوم ہوتا ہے جیسے تم کبھی بہت بیمار رہی ہو ویسے یہ بڑے اچھے لگتے ہیں"۔

نزہت نے شرمانا شروع کر دیا اور منصور اپنے لئے کافی اور نزہت کے لئے چائے بنانے لگا۔ چائے کا پیالہ نزہت کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو وہ عاشق تصور کر لیا جو اپنی محبوبہ سے پہلی بار اظہارِ عشق کرنے والا ہو۔ اس نے ہلکے سے ایک آہ بھری اور اسے اپنے اندر بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ وہ کیا حماقت کرنے والا ہے۔ لیکن جب اسے ان شکوک کا خیال آیا جو اس کے دل میں لالہ کی طرف سے پیدا ہو گئے تھے تو وہ فوراً سنبھل گیا اور اپنے پیالے میں چمچ ہلاتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس بات کا دکھ ہے نزہت کہ لالہ نے مجھے آج تک اندھیرے میں رکھا۔ میں نے اس سے کوئی برائی نہیں کی تھی۔ میں نے اسے اپنے دل میں جگہ دے رکھی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے میرے دل میں دھڑکتی تھی۔ لیکن اس نے میری محبت کی قدر نہ کی۔ اس نے مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک خط میں اگر مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا تو دوسری طرف ڈاکٹر کو لکھا کہ وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔ مجھے فون کر کے اس نے ڈاکٹر کو فون کیا اور ڈاکٹر کو فون کر کے پھر مجھے فون کیا۔ مجھے بتاؤ نزہت! لالہ نے مجھ سے ایسا برتاؤ کیوں کیا؟ اگر وہ ڈاکٹر کی تھی تو میرے پاس کیوں آئی؟ اور اگر میرے پاس آئی تھی تو ڈاکٹر کے پاس کیوں

گئی ؟'

'جہاں تک میرا خیال ہے' ۔۔۔ نزہت نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا ۔۔۔ 'لالہ کے ان گنت خطوط اور تصویریں ڈاکٹر کے پاس محفوظ پڑی ہیں۔ وہ واپس نہیں کرتا۔ لالہ ڈرتی ہے کہ کہیں وہ اسے اور اس کے خاندان کو بدنام نہ کردے۔ اس لئے وہ اس کی دلجوئی کے لئے اس سے اکثر ملتی رہتی ہے'

'اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب اس کی شادی مجھ سے ہو گئی تو وہ پھر بھی اکثر اس کی دلجوئی کرنے جایا کرے گی'

'شاید شادی کے بعد وہ ایسا نہ کرے'

منصور نے ہونٹوں تک آیا ہوا پیالہ دوبارا پلیٹ میں رکھ دیا، 'شادی کے بعد وہ ایسا ضرور کرے گی۔ پھر وہ مجھے یہ کہے گی، منصور! مجھے اب نہ صرف اپنے بلکہ تمہارے خاندان کی عزت کا بھی خیال ہے۔ اور یوں میری زندگی اس چادر کی طرح تار تار ہو جائے گی جو خاردار تاروں پہ پھیلی ہو اور جسے کوئی آہستہ آہستہ کھینچ رہا ہو'

نزہت جلدی سے بولی:

'خدا نہ کرے ایسا ہو۔ آپ اپنی زندگی خراب کیوں کرتے

ہیں۔ آپ کا مستقبل نہایت اچھا ہے۔ ابھی آپ کو سارا یورپ گھومنا ہے اور ملک ملک کی سیر کرنی ہے۔ آپ لالہ ایسی نادان لڑکی کی خاطر اپنا مستقبل کیوں تباہ کریں۔"

نزہت خاموشی سے چائے پینے لگی۔ منصور پائپ جلا کر ہلکے ہلکے کش لگانے لگا۔ اس کے آس پاس لوگ میزوں کے گرد بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ فضا میں خنکی بڑھ چلی تھی اور درختوں کے نیچے اندھیرا گہرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے منصور کو محسوس ہوا کہ وہ نزہت کے ساتھ کوئی ناٹک نہیں کھیل رہا۔ وہ ایک حقیقی اور سچے موڈ میں ہے اور نزہت نے لالہ کے متعلق جو بتایا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے اور لالہ واقعی ڈاکٹر سے ملتی ہے اور اسے خط لکھتی ہے اور اسے فون کرتی ہے۔ اس کے چہرے پر غم کا پھیکا پھیکا غبار سا پھیل گیا اور وہ بھول گیا کہ نزہت اس کے سامنے بیٹھی ہے اور وہ اسے اظہارِ محبت کے لئے لارنس باغ لایا ہے۔ وہ موسم بہار کی خوبصورت شام اور اپنی کھوئی ہوئی افسردہ محبت پر غور کرنے لگا کہ اچانک نزہت بولی۔

"آپ اپنا دل برا نہ کریں۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دیں۔ میں نے تو آپ سے ہمدردی کی ہے اور دوستی کا حق پہچانتے ہوئے آپ کو اچھائی اور برائی سے آگاہ کیا ہے۔"

"تم نے کوئی غلطی نہیں کی نزہت! بلکہ تم نے تو اپنا فرض

ادا کیا ہے۔ تم نے عین موقع پر میری زندگی کو تباہی کے غار
سے گرتے گرتے بچا لیا ہے اور میں تمہارا احسان کبھی نہیں
بھولوں گا۔"

نزہت نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں اور منصور کو فوراً اس بات کا خیال آ
گیا جس کے لئے وہ آیا تھا۔ اس نے پہلی بار دیکھا کہ نزہت کا گریبان کافی فراخ
تھا اور اس میں سے اس کی چھاتیوں کا سپید سپید ابھار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چائے
اور کافی پی چکے تھے اور شام بھی گہری ہو رہی تھی۔ منصور نے بل ادا کیا اور وہ دونوں ٹی
سٹال کے عقب سے ہو کر اس خاموش اور...... ویران سی سڑک پر چلنے لگے جس
پر گھنے اور بوڑھے درخت جھکے ہوئے تھے۔ ایک طرف آم اور جامن کے جھنڈوں
تلے لمبی گھاس میں کیسری رنگ کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ دوسری جانب پہاڑی
تھی جس کی ڈھلوان پر ناتراشیدہ پتھروں کے درمیان ہری بھری بیلوں نے جال
پھیلا رکھے تھے اور گنجان درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان کہیں سے پانی کے پتھر
پر گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ انہیں درختوں میں منصور کو ایک خالی بنچ دکھائی دیا۔
منصور کو وہ بنچ ایک سٹیج کی مانند دکھائی دیا جس پر تھوڑی دیر بعد اندر سبھا کا کوئی
انتہائی جذباتی منظر کھیلا جانے والا تھا۔ وہ پہاڑی کے دو تین چکر کاٹ کر
نزہت کو اس بنچ تک لے آیا۔

"میرا خیال ہے یہاں تھوڑی دیر بیٹھا جائے۔ بڑی خاموش جگہ ہے۔"

نزہت نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ سے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ریشمی لباس
کی سرسراہٹ نے منصور کے حواس کو یوں بیدار کر دیا جیسے وہ کسی سانپ کی پھنکار
ہو۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

'تمہیں دیر تو نہیں ہو جائے گی؟'

'جی نہیں'

منصور کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ نزہت کا
دل بھی بری طرح دھڑک رہا ہوگا۔ کیونکہ اس نے 'جی ہاں' کہنے سے پہلے اور... بعد
دونوں مرتبہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری تھی اور اس کے ہونٹ بھی خشک ہو گئے تھے۔
اسے نزہت کے سانس کی حدت اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی اور وہ بھول گیا
تھا کہ وہ عاشق کا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ ایک پل کے لئے اس کے جسم میں ایک شعلہ
سا بھڑکا اور وہ نزہت کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رہ گیا۔

'موسم بہت اچھا ہے'

نزہت خاموش رہی۔ یا شاید اس نے کچھ کہا تھا جسے وہ پوری طرح ادا نہ کر سکی اور
منصور پوری طرح سن نہ سکا تھا۔ منصور نے بڑی ہمت کر کے نزہت کے ناخن پر انگلی
رکھ کر کہا۔

'بڑے تیز ناخن ہیں'

نزہت نے اپنا ہاتھ منصور کی طرف بڑھا دیا جسے منصور نے دونوں ہاتھوں میں

تھام لیا۔ اب وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا اور اس نے بے قابو ہو کر
نزہت کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے ایسا کیا تھا لیکن
نزہت اس بت کی طرح جس کے نیچے سے چبوترہ کھینچ لیا گیا ہو منصور کی آغوش میں آن
گری۔ منصور بدحواس سا ہو گیا۔ اس کا خیال تھا نزہت ایک دم اٹھ کھڑی ہو گی اور
اپنی گردن اٹھا کر اور آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں بھر کر اسے کہے گی:

"تم انتہائی ذلیل انسان ثابت ہوئے ہو۔ تم دغا باز اور فریبی ہو۔
تم نے اس لڑکی کے منہ پر تھوک دیا ہے جسے کل تک تم محبت
میں ڈوبے ہوئے طویل خط لکھا کرتے تھے۔ تم نفس کے غلام ہو۔
تم بھوکے درندے ہو۔ تم جانوروں سے بھی بدتر ہو۔۔۔۔۔۔"

مگر اس نے اپنے دونوں بازو بڑے اطمینان سے منصور کے گلے میں حمائل کر دیئے
اور اس کے سینے پر سر رکھ کر بولی:

"مجھے خراب لڑکی نہ سمجھنا منصور، میں نے صرف تم سے ہمدردی
کی ہے اور مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے، میں تمہیں کبھی پریشان
نہیں دیکھ سکتی۔ اگر لالہ نے تم سے فریب کیا ہے تو تم بھی اُسے
اپنے دل سے بھلا دو۔ وہ اسی قابل ہے۔ وہ آج تک کسی کی بن
کر نہیں رہ سکی۔ اس نے ہر دوسرے سال ایک نئی محبت کی
ہے اور پہلی محبت کو بھلا دیا ہے۔ وہ ساری عمر یہی کرتی رہیگی

اور اس کی ساری عمر انہی الجھنوں اور پریشانیوں میں
گذرے گی ......۔

منصور، لالہ کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتا تھا۔ وہ یہ گوارا کر سکتا تھا کہ نزہت
اس سے جی کھول کر محبت کا اظہار کرے لیکن یہ اسے کسی طور بھی گوارا نہ تھا کہ وہ
لالہ کی بدخوئی شروع کردے۔ معاً ایک خیال نیزے کی طرح اس کے ذہن میں اتر گیا۔
کیا خبر نزہت ٹھیک کہہ رہی ہو؟ اس کا ذہن کھونے لگا۔ اس کے ہونٹ لرزے
اور اس نے جلدی سے اپنا چہرہ نزہت کے بالوں میں چھپا لیا۔ نہیں نہیں۔ یہ کبھی
نہیں ہو سکتا۔ لالہ اسے کبھی فریب نہیں دے سکتی۔ وہ اتنی اچھی ہے۔ اتنی مخلص
ہے۔ اتنی معصوم ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ تو فریب کے تصور کو بھی وابستہ
کرنا گناہ ہوگا۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر درختوں کے نیچے رات کے اوّلیں اندھیروں
کو پاؤں پھیلاتے دیکھا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے لالہ اس کے سامنے درخت
کا سہارا لئے کھڑی ہے اور اسے افسوس بھری نگاہوں سے تک رہی ہے۔ منصور
نے نزہت سے اپنا آپ الگ کرنے کی کوشش کی۔ نزہت نے چہرہ اوپر اٹھا
کر منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرا کر ہونٹوں کو یوں بنا لیا جیسے ہوا
میں کسی کا بوسہ لے رہی ہو۔ منصور نے اُسے آغوش میں لے کر اپنے ہونٹ اس
کے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے اور اسے ایکا ایکی یوں محسوس ہوا جیسے اس
نے کسی گندے مرتبان میں منہ ڈال دیا ہو، جیسے اس نے مردہ چھپکلی پر اپنے ہونٹ

رکھ دیے ہوں۔ وہ ایک دم تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔
وہ لارنس باغ سے باہر نکل رہے تھے اور رات گہری ہو رہی تھی۔ مال پر روشنیاں
جگمگا رہی تھیں اور آسمان پر نیلے تاروں کے پھول چمکنے لگے تھے۔ وہ دونوں تانگے
میں سوار ہو گئے۔ تانگہ روانہ ہوا تو نزہت بولی:
'جو کچھ ہوا ہے مجھے اس کا یقین نہیں آتا'
'کیوں؟'
'یونہی'
'تم پاگل ہو۔ منصور خلوص اور محبت کا پرستار ہے اور لالہ
ان دونوں خوبیوں سے محروم ہے'
نزہت نے والہانہ نگاہوں سے منصور کو دیکھا۔ سیاہ نقاب کی باریک جالی
میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ منصور کو اس کی حالت پر ہنسی بھی آئی اور رحم
بھی آیا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ نزہت سے ایسا سلوک کر رہا تھا جس کی وہ مستحق
تھی۔ نزہت بولی
'تم نے صرف ایک گھنٹے میں میری پوری زندگی بدل کر رکھ
دی ہے منصور! اب کہیں مجھے بھی نہ چھوڑ دینا۔ ورنہ میں کہیں
کی نہ رہوں گی۔ میں کسی کو شکل نہ دکھا سکوں گی پھر نہ جانے میں کس طرف
نکل جاؤں اور میرا کیا حال ہو؟'

منصور اس وقت لالہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کے دل میں شک کا ہلکا سا کانٹا کھٹک رہا تھا۔ یہ چبھن ایسی تھی جو بے خیالی میں اپنے آپ بیدار ہو جاتی اور پھر فوراً ہی غائب ہو جاتی تھی۔ وہ نزہت سے لالہ کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ پوچھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کیا خبر نزہت اس کے متعلق کیا کیا من گھڑت قصے سنائے؟ وہ نزہت سے عشق کا اظہار کر کے ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اسے نزہت سے قطعاً کوئی لگاؤ نہ تھا وہ صرف اس کی نیت پرکھنا چاہتا تھا اور وہ اس نے پرکھ لی تھی۔ مگر اب نزہت سے چھٹکارا مشکل تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی منصور کے نام معنون کر دی تھی اور اس سے کبھی الگ نہ ہونے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ پریشان سا ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نزہت کو اس کے گھر اتار کر فوراً ٹی ہاؤس پہنچے۔ گھر کی بجائے اس نے نزہت کو راستے میں ہی ایک جگہ اتار دیا اور خود جلدی جلدی میرے پاس پہنچا۔ میں کام میں مصروف تھا اس سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے شروع سے لے کر آخر تک مجھے ساری کہانی سنا دی۔ یہ سن کر مجھے افسوس بھی ہوا اور تسکین بھی ہوئی۔ افسوس اس لئے کہ اتنی پرانی سہیلی لالہ کو دھوکا دے گئی اور تسکین اس خیال سے ہوئی کہ لالہ پر جو الزامات لگائے گئے تھے وہ بے بنیاد تھے اور ایسا محض رقابت کی وجہ سے ہوا تھا۔ لالہ کو ان واقعات کا علم ہوا تو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے نزہت سے یک لخت تعلقات ختم تو نہ کئے مگر اس سے ملنا جلنا کم کر دیا۔ اب ٹی ہاؤس میں

نزہت کا فون بار بار آنے لگا۔ وہ مجھ سے صرف منصور کا پوچھتی اور اگر منصور وہاں نہ ہوتا تو دو تین منٹ ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون بند کر دیتی۔ میں نے بھی مصلحتاً اس کے منہ پر کسی بات کا اظہار نہ کیا تھا۔ مجھے تو صرف اسی بات کی خوشی تھی کہ لالہ بے گناہ ثابت ہو چکی تھی۔ نزہت دوسرے تیسرے منصور سے ملنے ٹی ہاؤس آ جاتی اور اب اس کے عشقیہ خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ منصور کی جان سخت عذاب میں تھی۔ وہ نزہت سے دوسرے ہی دن متنفر ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔

"وہ بڑی پختہ عورت ہے۔ میں تو حیران ہوں وہ سگریٹ بھی پیتی ہے اور بالکل ایسے جیسے گوشت بیچنے والے پیتے ہیں کلیم صاحب اس کا چہرہ طوائفوں کے پاندان کی طرح ہے جس کا ڈھکنا ہمیشہ اکھڑا رہتا ہے اور جسے کوئی بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔"

اور میں منصور کی اس تشبیہہ پر بڑا ہنسا۔

منصور جس دن نزہت سے ملتا وہ اس ملاقات کا سارا حال لالہ کو کہہ سناتا۔ شروع شروع میں تو لالہ نزہت کا مذاق اڑاتی رہی اور منصور کو تلقین کرتی رہی کہ وہ نزہت کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کر کے چھوڑے لیکن ایک دن اس نے یہ خط بھیج دیا۔

اچھے منصور!

کل دوپہر جب میں گیسٹ ہوم واپس آئی تو رضیہ نہیں تھی۔ تین بجے تک میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ امی نے بتایا کہ وہ کہتی تھی کہ آپا کے گھر سے ہو کر آؤں گی، پھر میں اور ثریا دونوں تیار ہو کر تمہاری طرف آنے لگیں، عین اسی وقت میری ایک پرانی سہیلی آگئی۔ جسے چھوڑ کر میں نہیں آسکتی تھی مجھے بہت افسوس ہوا۔ کاش وہ چند لمحے بعد آتی! ثریا بضد تھی کہ میں ضرور جاؤں گی۔ چنانچہ وہ آگئی مگر منصور تم نہ ملے۔ زندگی میں پہلی بار وہ گھر سے اکیلی چل کر تمہارے پاس آئی تھی۔ وہ کبھی کہیں تنہا نہیں جاتی۔ اس کے جانے کے بعد میں فکر مند سی ہو گئی کہ ناسمجھ لڑکی ہے خدا کرے اچھی طرح پہنچ جائے۔ واپسی کا مجھے فکر نہیں تھا کیونکہ میرا خیال تھا تم اسے گیسٹ ہوم تک چھوڑنے ضرور آؤ گے،

بہرحال اس کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد رضیہ آگئی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی بہت جھڑکیاں دیں۔ جب اس نے بتایا کہ وہ تمہارے پاس گئی تھی تو مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ پھر رات گئے تک رضیہ میں اور ثریا تمہاری باتیں کرتی رہیں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ تم بھی ہمارے پاس ہوتے! منصور کیا کبھی ایسا ہو سکے گا؟

اچھے منصور! کل میں بڑی مطمئن ہو کر اور گہری نیند سوئی۔ تین چار راتوں سے

بے چین تھی اور پوری نیند نہیں لے سکی تھی۔ آج صبح میں بہت ہشاش بشاش
تھی۔ خوب دن چڑھے تک سوئی رہی۔ پھر بڑے مزے سے اٹھ کر غسل کیا۔
دودھ میں اوولٹین ڈال کر پی۔ صبح سے لے کر دوپہر تک خوش خوش رہی۔ منصور کی
طرف سے بالکل مطمئن تھی۔ میں نے روز کا ٹائم ٹیبل بھی تیار کیا جس پر سختی سے عمل کرنے
کا پروگرام بھی بنایا۔

صبح پانچ بجے اٹھنا۔ بھیا کے ساتھ زبردستی سیر کو جانا۔ واپسی پہ غسل، نماز اور
کتابِ مقدس کی تلاوت۔ طلوع ہوتے سورج کے سامنے آنکھیں بند کر کے پانچ منٹ
تک کھڑے رہنا۔ ناشتہ۔ اس کے بعد مطالعہ۔ پھر دوپہر کا کھانا۔ تھوڑا سا آرام۔ پھر
منصور سے ملاقات۔ شام کی چائے۔ پھر مطالعہ۔ آٹھ سے دس بجے تک تمہارے
پرانے خطوط کا مطالعہ۔ خواب گاہ میں داخل ہونے سے پہلے آسمان کو دیکھنا۔
اگر چاندنی رات ہو تو آدھ گھنٹہ تک چاندنی میں چپ چاپ بیٹھنا اور پھر رات کو
خدا سے دعا مانگ کر مزے سے سو جانا۔

دوپہر کو ریڈیو پر فلمی نغموں کا پروگرام سننا۔ اس کے بعد میں نہانے کے لئے
غسل خانے میں چل دی۔ میرے غسل خانے میں داخل ہونے کے فوراً بعد تم
ہمارے ہاں آ گئیں۔ سیدھی میری چھوٹی بھابھی کے پاس جا کر بیٹھ گئیں اور باتوں
ہی باتوں میں کہنے لگیں۔

ملالہ کا اب کہیں منگنی کر کے اس کی شادی کر دیں۔ میں نہیں چاہتی

کہ یہ خواہ مخواہ بدنام ہو جائے۔ آخر میری سہیلی ہے میں نے
اسے دو تین بار گھر سے اکیلی باہر جاتے دیکھا تھا اس لئے کہہ رہی
ہوں۔ آپ اس سے میرا ذکر نہ کریں۔ ویسے اپنی طرف سے اس
کا خیال رکھیں ......'

جب میں غسل خانے سے باہر نکلی تو مجھے دیکھ کر کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ آنکھیں چار
کرتے ہوئے کچھ گھبرانے لگی۔ خوب بنی سنوری تھی۔ اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہی
تھی۔ کسی وقت کہیں گم سی ہو جاتی۔ بولتی یوں احتیاط سے جیسے کوئی لفظ نیچے نہ گر پڑے
کبھی اپنے آپ مسکرائے اور کبھی اپنا بازو مجھے دکھا کر کہے۔

'لالہ! کیا میرے بازو خوبصورت ہیں؟'

مجھے پتہ ہے منصور! تم نے یقیناً کہا ہوگا کہ نزہت تمہارے بازو بڑے خوبصورت
ہیں، پھر وہ مجھے کہنے لگی لالہ! منصور کا خیال چھوڑ دو۔ تم میری اچھی سہیلی ہو۔ میں
تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ منصور تمہیں کبھی نہیں چاہتا تھا، اس کے بعد وہ چلی
گئی۔ اچھے منصور! اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ سب کچھ جھوٹ کہہ رہی ہے پھر بھی
نہ جانے کیوں میرا دل بے حد افسردہ ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک چڑیل تمہیں
مجھ سے بدگمان کر رہی ہے۔ تمہیں مجھ سے چھین رہی ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں نزہت
کو ابھی جا کر جان سے مار ڈالوں۔ جس نے مجھے اس قدر دھوکا دیا۔ جس نے میری دوستی
کو اتنا گہرا صدمہ پہنچایا اور جس نے دوستی کے کئی سالوں کو بیکار سی شے سمجھ کر نظر انداز

دیا۔ اور جس نے میرے خلوص کو سر بازار رسوا کیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر نزہت میرے پاس آ کر صاف لفظوں میں کہہ دیتی کہ لالہ! میں منصور کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں اسے بے انداز پیار کرتی ہوں تو میں بڑی فراخدلی سے کہتی کہ اگرچہ میرے لئے ایسا کرنا ناممکن ہے لیکن میں اپنی دوستی کی لاج کو نبھانے کے لئے جو میرے اور تمہارے درمیان ہے...... منصور تمہیں دیتی ہوں۔ تم جب چاہو اس سے ملو۔ جہاں چاہو اس کے ساتھ گھومو۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ وہ بڑی ذلیل لڑکی نکلی منصور! ——— اور اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔

منصور، میرے اچھے منصور! اب تم نزہت سے ہرگز ہرگز نہ ملنا۔ اب تم اسے سمجھ لو کہ وہ ذلیل اور گھٹیا لڑکی ہے۔ اگر تم اس سے ملے تو میں تم سے خفا ہو جاؤں گی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال آ رہا ہے کہ میری محبت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم کسی اور لڑکی سے بھی دوستی پیدا کرو۔ منصور! تم بہت بھولے ہو۔ تم نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا۔ کل کو اگر تمہیں نزہت پہ بھی رحم آ گیا تو؟ ——— تو پھر کیا ہوگا ہو؟ نزہت اگر اپنے سستے جذبات سے مجبور ہو کر تمہارے سامنے بے سدھ ہو گئی تھی تو اسے اپنی دوستی کو دھبہ نہیں لگانا چاہیے تھا۔ بس تم آئندہ اس ڈائن کو بالکل نہ ملنا۔ لیکن یہ نہ کرنا کہ اس سے مل کر بھی مجھ سے چھپا لو۔

اچھے منصور! اس وقت...... میرا دل بے حد اداس ہو رہا ہے۔ اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں۔ باہر اداس چاندنی درختوں پہ سہمی ہوئی ہے۔

ہلکی ہلکی دھند بھی چھائی ہوئی ہے۔ اخیر سرما کی اداس چاندنی ــــ اور میرا غمزدہ
دل ــــ جسے دیکھنے والا کوئی نہیں!

میرے شہزادے! نہیں پتہ ہے نا کہ لالہ تمہارے کس قدر قریب آچکی ہے
جب میں تمہارا چہرہ دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے سارے غم بھول جاتے ہیں۔ مجھے
تمہارے چہرے پر اپنی عظمت۔ اور برتری کا عکس جھلملاتا دکھائی دیتاہے۔ میں تمہاری
آنکھوں میں محبت اور روشنی کے وہ مینار مسکراتے دیکھتی ہوں جو میرے تمام
اندھیروں کو روشن کر دیتے ہیں۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میرے ہو اور
اب صرف میرے ہو کر ہی رہو گے اگر تمہیں اپنے وعدے کا احترام ہے تو
منصور! آئندہ نزہت سے مت ملنا۔ تم نے مجھے کہا تھا کہ ہرنی والی تشبیہ تم نے
صرف میرے لئے رکھی ہوئی ہے پھر تم نے نزہت کو کیوں کہا کہ

"نزہت! تمہاری محبت میرے دل کے اندر یوں چپ چاپ
پڑی تھی جس طرح پھولوں بھری ٹوکری میں ہرنی کا بچہ چھپا ہوتا
ہے"

اچھے منصور! مجھے نزہت سے اب خوف آنے لگا ہے۔ وہ بڑی چالاک لڑکی
ہے۔ کہیں وہ تم کو مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہ چھین لے۔ میں تم وعدہ کرتی ہوں
کہ اب اس سے کبھی نہ ملوں گی۔ میں اپنے ماں باپ کی عزت، اپنے منصور کی عزت
اور اپنی عزت کا پورا پورا خیال رکھوں گی۔ تمہاری باتیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

ں تنہائی میں اکثر ان پر سوچ بچار کرتی رہتی ہوں۔ تم بہت سمجھدار ہو اور رضیہ
نے بھی کہا تھا۔

"منصور! بڑا سمجھ دار لڑکا ہے۔ وہ شادی کی بات پر کچھ کچھ فکرمند
ہو گیا تھا اور مجھے اس سے بہت ہمدردی پیدا ہو گئی تھی"

منصور! دیکھو میری انگلیوں پر سیاہی کے دھبے پڑ گئے ہیں۔ تم یہ دھبے دیکھا
کرتے ہو ناں؟ اس وقت میں تمہیں اپنی انگلیاں کیسے دکھاؤں؟ منصور! کیا ہم
کبھی رات کو نہیں مل سکیں گے؟

کسی چاندنی رات میں سیر پر نہ جا سکیں گے؟ منصور ہم کونسے ملک میں پیدا ہو
گئے ہیں؟ اس ملک میں پیدا ہونے سے تو یہ روپ جاکر مر جانا زیادہ خوبصورت
معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو رات بیتی جا رہی ہے اور تم نہ معلوم کہاں بیٹھے ہو گے۔ شروع بہار
کی یہ راتیں جب ہواؤں میں نیند کی ہلکی ہلکی گھلاوٹ بھی شامل ہو، مجھے بہت عزیز ہیں۔ خدا
جانے کب بارش ہو! اچھے منصور! بارش والے دن میں تمہیں بہت یاد کروں گی۔

اب میری آنکھوں پر رخصتی کے پھول رکھ دو!

تمہاری اپنی

لالہ رخ

خط پڑھ کر منصور غصے سے بھڑک اٹھا۔ اسے ایک دم یوں محسوس ہوا کہ اگر
اس نے نزہت کو کچھ دن اور اسی فریب میں مبتلا رکھا تو وہ اسے لالہ سے ہمیشہ

کے لیئے محروم کر دے گی۔ وہ پاگل سا ہو گیا۔ وہ دفتر سے چھٹی لے کر ٹی ہاؤس میں بیٹھ گیا اور نزہت کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے اگر منصور کے ارادوں کا علم ہوتا تو میں یقیناً اسے سمجھاتا لیکن مجھے اس وقت پتہ چلا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب نزہت کا فون آیا۔ میں نے منصور کو بلایا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کاؤنٹر تک آیا۔ ریسیور ہاتھ میں لیا اور ایک دم نزہت کی بے عزتی شروع کر دی۔ اس نے بڑی بے باکی سے نزہت کو بتا دیا کہ وہ اس کو فریب دے رہا تھا اس سے ناٹک کر رہا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ لالہ کے ساتھ، اپنی سہیلی کے ساتھ کس حد تک مخلص ہے۔ نزہت کی جانب سے کوئی آواز نہ آئی۔ میرا خیال ہے وہ سکتے میں آ گئی ہو گی۔ اپنی طنز بھری تقریر ختم کر کے منصور نے فون بند کر دیا اور ٹی ہاؤس سے باہر نکل گیا۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھے بالکل امید نہ تھی کہ منصور اتنی بیوقوفی سے بھی کام لے سکتا ہے۔ میں خاموش ہو گیا اور آنے والے انقلابات پر غور کرنے لگا۔

کچھ دن بڑے سکون سے گذر گئے۔
لالہ قریباً بلاناغہ فون کرتی اور ایک دن چھوڑ کر خط بھی لکھ ڈالتی۔ اس نے لکھا
ہوتا کہ نزہت نے ان کے ہاں آنا جانا بالکل بند کر دیا ہے اور وہ کسی سے نہیں ملتی۔
منصور بڑا مطمئن تھا۔ اسے خوشی تھی کہ نزہت کی مصیبت سر پہ آتے آتے ٹل گئی اور لالہ
سے جا ملا۔ مگر میں مطمئن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ نزہت زخمی ریچھ کی طرح بوکھلائی پھر
رہی ہوگی اور وہ اپنا وار کرنے سے کبھی نہیں ٹلے گی۔ اس نے لالہ کو ایک خط لکھا جس
میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ لالہ سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ وہ خط یہ تھا۔

"لالہ!
میں نے ان دنوں تمہیں بے اختیار یاد کیا ہے۔ جب دیا بجھنے لگتا ہے تو

زیادہ روشن، زیادہ بھڑکیلا ہو جاتا ہے۔ تم شروع خط میں ہی میری باتوں پر حیران نہ ہو جانا۔ آج میں تمہیں ایک نیا خط لکھ رہی ہوں اور شاید پھر کبھی نہ لکھ سکوں۔ میری باتوں میں سے کوئی اور مطلب نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔ خدارا کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔ تم بہت ہی اچھی ہو لالہ! تم کوئی ایسی بات نہ سوچنا۔ آج میری طبیعت اس قدر پریشان ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ یقین کرو میں تمام گذشتہ زندگی میں اس قدر رنجیدہ اور ملول نہیں ہوئی۔ لالہ! تم اس شخص کی افسردگی کا اندازہ لگا سکو گی جس نے اپنی زندگی کی ہر قیمتی چیز، دوستی، پیار، محبت، اعتماد بھروسہ گویا اپنی زندگی کا سارا سرمایہ کسی چھوٹے کھیل میں ایک ہی داؤ میں ہار دیا ہو؟ ایک اجنبی مسافر کو تنہا دیکھ کر راہبر ہی اس پر حملہ آور ہو کر اسے لوٹ لیں اور اس سے اس کی طاقتِ گفتار بھی چھین لیں تو وہ بے بس اپنی کم مائیگی پر جس قدر بھی آنسو بہائے کم ہوں گے۔

لالہ! مجھے اتنی بلندی سے نیچے گرا دیا گیا ہے کہ میں وہاں کا تصوّر تو کیا اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکتی۔ مجھے روشنی سے اتنی خوفناک تاریکی میں لایا گیا ہے کہ میں اندھی ہو گئی ہوں اور سوچ بھی نہیں سکتی کہ یہاں کیسے اور کیونکر آ گئی۔ میرے چاروں طرف گہرا اندھیرا اور مکمل تاریکی ہے۔ میں اس تاریکی میں گم ہو رہی ہوں۔ یہ بھیانک اندھیرا مجھے اپنے اندر جذب کر رہا ہے۔ میں اب رونا چاہتی ہوں تو میرے آنسو میرا ساتھ نہیں دیتے۔ چیخنا چاہتی ہوں تو آواز میرے حلق میں ہی رُک

جاتی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہوں تو خاموشی کی مہر میرے لبوں کو بند کر دیتی ہے۔
سب مانوس چہرے مجھے اجنبی دکھائی دے رہے ہیں۔ کوئی غمخوار نہیں۔ کوئی
پرسانِ حال نہیں۔ لالہ! میں تمہیں کسی بات کا یقین دلانا نہیں چاہتی۔ میں اپنی صفائی
میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی اور کبھی نہیں کہوں گی۔ تم جو چاہو
کہہ لو۔ میں تمہاری ہر بات سننے کو تیار ہوں۔ تم ہر بات کہہ سکتی ہو۔ تم ہر واقعے کو دہرا
سکتی ہو۔ تمہیں اس کا حق ہے۔ پورا پورا حق ہے۔ اور مجھے کبھی اس کا افسوس بھی نہیں
ہوگا۔ میرے آج اور کل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں جو بات آج سن سکتی ہوں اُسے
کل اور کل کے بعد بھی سن سکتی ہوں۔ نیا اور پرانا دن مجھ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر
سکے گا۔ میں ان باتوں سے بہت دور چلی گئی ہوں۔ میری راہیں بالکل الگ ہو گئی ہیں۔
یہ وہ راہیں ہیں جن پر تم دو قدم بھی نہ چل سکو گی۔ یہ کانٹوں سے الجھی ہوئی ویران راہیں
ہیں۔ تمہارے سامنے پھولوں سے اَٹے ہوئے راستے ہیں اور مہربان چہرے ہیں۔

تم اپنے دل کو افسردہ نہ کرنا لالہ!
تمہاری سہیلی مر گئی ہے۔ یقین کرو نزہت مر گئی ہے۔ وہ اپنی موت نہیں مری
بلکہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی ہے۔ میں تمہیں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ وہ صرف تم
سے ہی نہیں بلکہ اس دنیا اور دنیا والوں سے ہی بہت دور چلی گئی ہے۔ لالہ! میں
ذہنی طور پر بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی ہوں۔ میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا۔ میں ہر
چیز سے بیگانگی محسوس کر رہی ہوں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے لالہ! بلکہ مجھے

از خود ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ میں خود نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں جا رہی ہوں۔ میری صحت خراب ہو رہی ہے۔ میں روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہوں۔ مگر مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ میں عنقریب یہاں سے جا رہی ہوں۔ تم مجھ سے بچھڑنے کا افسوس نہ کرنا۔ دوست زندگی کے ہر موڑ پر مل جایا کرتے ہیں۔ تمہیں بھی کوئی اچھی دوست مل جائے گی اور پھر میں اس وقت بھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑے جا رہی۔ تمہارے پاس منصور ایسا دوست ہے وہ حقیقت میں تمہارا نہایت ہی اچھا دوست ہے۔ وہ دوست بھی ہے، غم خوار بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی بھر کا ساتھی بھی ہے۔ تم اس کی عزت کرو اور اس سے پیار کرو۔ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ انسان کچھ کھو کر ہی کچھ پاتا ہے اور تم نے پتھر کھو کر ہیرا پایا ہے۔ لالہ! تم کسی بات پر رنجیدہ نہ ہونا۔ یقین کرو تمہاری زندگی میں کوئی تغیر نہیں آئے گا۔ تمہیں کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ یہ سب وقتی ہنگامے ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ ہی گذر جایا کرتے ہیں۔ تم میری باتوں سے کوئی مطلب نہ لینا۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں تمہاری احسان مند ہوں۔ میں منصور سے بھی ناراض نہیں ہوں۔ مجھے اس کی کسی بات پر افسوس نہیں ہے۔ مجھے اس سے ناراض ہو کر کیا لینا ہے؟ اور میرا حق ہی کیا ہے کہ میں کسی سے یونہی ناراض ہوتی پھروں؟ منصور تمہارا ہمدرد ہے۔ میں اب بھی اس کا ویسے ہی احترام کرتی ہوں۔ تم اس کے قریب رہنا۔ یہیں سے تمہیں منزل کا پتہ ملے گا۔ میری دوست

میری باتوں کا بُرا نہ ماننا۔

تم مجھے ہنستے ہوئے دیکھ کر سمجھتی ہو کہ میں وہ سب کچھ بھول گئی ہوں مگر تم نہیں جانتیں کہ میری یہ ہنسی ہزاروں آنسوؤں کو چھو کر آتی ہے۔ میری اس ہنسی کے پیچھے آنسوؤں کا ایک طوفان ہوتا ہے۔ میں ان آنسوؤں کو چھپانے کے لئے ہنستی ہوں۔ میرے قہقہوں میں آہ و فغاں کی چیخ و پکار تمہیں سنائی نہیں دیتی؟ تم میرے قریب ہو کر میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو، تمہیں ریگستانوں میں خاک اُڑتی نظر آئے گی۔

فقط

نزہت،

منصور نے یہ خط پڑھ کر لالہ کو واپس کر دیا اور اسے تنبیہہ کی کہ وہ نزہت سے بالکل نہ ملے۔ وہ اب اس کی سہیلی نہیں ہے اور وہ ان دونوں سے انتقام لینے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہی ہے۔ دو تین ہفتے گذر گئے۔ اس دوران میں نزہت کا کوئی فون نہ آیا۔ وہ اس کھیل میں سے بالکل ہی غائب ہو گئی۔ اس کردار کی مانند جو پہلے ایکٹ میں ہی مر جائے اور پھر سارے ڈرامے میں اس کے دوبارہ نمودار ہونے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ نزہت کے تمام واقعات پر ایک خواب کا گمان ہونے لگا جو دوپہر کو سوتے میں دیکھا ہو اور جو بالکل یاد نہ رہا ہو۔ لالہ سے ملنے بھی وہ کبھی گیسٹ ہوم نہ آئی تھی۔ کبھی کبھی جب

ہم تینوں بیٹھے ہوتے تو ہمیں نزہت کا خیال آجاتا اور ہمیں محسوس ہوتا کہ وہ کبھی ہمارے درمیان نہ آئی تھی اور ہم اسے زندگی کے کسی دور میں نہ ملے تھے۔

ایک دن اچانک اس کا منصور کے نام ایک چھوٹا سا خط آگیا۔ خط دفتر کے پتہ پر آیا تھا۔ منصور اسے لے کر میرے پاس آگیا۔ میں نے جلدی سے کھول اسے پڑھنا شروع کیا۔

منصور صاحب!

آج اپنی الماری کی صفائی کرتے ہوئے مجھے آپ کا ایک پرانا خط مل گیا۔ خط دیکھتے ہی منہ سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی، اور میری آنکھوں کے سامنے وہ زمانہ آگیا جس کے ساتھ میری زندگی کی ہزاروں ویرانیاں وابستہ ہیں۔ وہ زمانہ گذر گیا لیکن اپنے پیچھے ایک الم انگیز یاد چھوڑ گیا۔ آج مجھے وہ حسین لمحے یاد آرہے ہیں جب میں نے پہلی مرتبہ کن آرزوؤں کے ساتھ محبت کے اس پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس وقت یہ پھول مجھے کس قدر حسین دکھائی دیا تھا۔ اس کی مہک نے میرے جسم میں زندگی کی ایک تازہ لہر دوڑا دی تھی۔ میں بے حد خوش تھی مگر زمانے کے نشیب و فراز سے بے خبر —— مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ سب کچھ محض سراب ہے۔ میں نے اس پھول کو ہاتھ لگایا تو کانٹوں نے میری تواضع کی۔ وہ حسن، وہ رنگ و بو کہاں چلے گئے تھے!

یہ دنیا ایک دھوکا ہے۔ میں نے تصنع اور بناوٹ کے ان محلوں میں چاروں طرف

فریب کے آئینے لگے دیکھے ہیں۔ کاش! یہ دوستی اس طرح ختم نہ ہوتی۔ اس کی پیدائش پر تو دلی خلوص اور بے لوث ہمدردیوں کی قندیلیں روشن کی تھیں۔ اسے آخر دم تک نبھانے کی تو ستاروں کو گواہ بنا کر قسمیں کھائی گئیں تھیں۔ اس کی بقا اور عظمت کے لیے تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگی گئی تھیں۔ اسے بادِ مخالف سے بچانے کے لئے تو سنگین دیواروں کی بنیادیں رکھی گئی تھیں۔ کیا یہ سب کچھ دھوکا، فریب اور جھوٹ تھا؟ کیا وہ تمام وعدے اور عہد و پیماں حباب آسا تھے؟

منصور صاحب! آپ میری باتوں پر رنجیدہ نہ ہوں۔ میں آپ سے کوئی شکوہ نہیں کر رہی مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ اگر آپ کو یہ محبت پسند نہ تھی اور آپ نے اسے زہر پلا دیا تو میں یہی کہوں گی کہ تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا اور اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ انسان بھی نوجوانی میں مر جاتے ہیں میں اس وقت اپنے اندر اتنی سکت محسوس نہیں کرتی کہ کسی بات کو دہراؤں۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے معاف کر دیں۔ دراصل قدرت کو آپ دونوں سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ آپ یہ خط پڑھ کر لالہ کو دکھا دیں اور پھر اسے بھی میرے تمام پچھلے خطوط سمیت جلا کر ضائع کر دیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جائیں کہ کوئی بیوقوف لڑکی بھی آپ کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ آپ لالہ کی ہر طرح دلجوئی کریں۔ اس کی سہیلی مر گئی ہے اور مرنے کے بعد تمام گلے شکوے ختم ہو جاتے ہیں۔ آپ نزہت کی موت

پر افسوس نہ کریں۔ اس کے مر جانے سے محفل کے حسن میں کوئی فرق نہیں آیا۔

نزہت

نزہت کا خط پڑھ کر مجھے یقین آگیا کہ منصور کو اس نے معاف نہیں کیا اور وہ اس سے ضرور انتقام لے گی۔ میں نے اپنے اس خیال سے لالہ اور منصور، دونوں کو آگاہ کر دیا۔ لالہ ڈر کر سہم سی گئی اور منصور نے اسے ہنس کر ٹال دیا۔ لالہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی کہ نزہت کو پورا حال معلوم ہے اور اس کے ذرا سے لب کھول دینے پر اس پر وہ آفت آئے گی اور تباہی نازل ہو گی جس کا وہ تصوّر بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ مجبور تھی اور سوائے اس کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی کہ ڈری ڈری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہے اور ذرا سی آہٹ پر چونک کر ادھر ادھر تکنے لگے۔ اگرچہ میں نے اور منصور نے اسے کافی تسلی دی تھی اور یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر نزہت نے اسے بدنام کیا تو ہمارے پاس بھی اس کے خطوط موجود ہیں۔ ہم اسے ایسا کرنے سے روک سکتے ہیں۔ لیکن لالہ کا خوف دُور نہ ہوا تھا۔

ایک دن میں اور منصور کاؤنٹر کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر ہوئی دفتر سے آیا تھا اور ابھی ہم نے چائے منگوائی ہی تھی کہ لالہ کا بھائی بی ہاؤس میں داخل ہوا۔ اس نے منصور کو خط دیا اور یہ کہہ کر کہ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا واپس چلا گیا۔ منصور نے پائپ میز پر رکھ دیا اور جلدی جلدی خط پڑھنے لگا۔ خط نسل

ے لکھا تھا اور تحریر شکستہ تھی۔ جیسے عجلت میں لکھا گیا ہو۔ وہ خط یہ تھا۔

"اچھے منصور!

آج دوپہر سے میرا ذہن چکی کی طرح جو دانوں کو پیسنے کی بجائے
ں توں گرا دیتی ہے گردشِ بے سود میں مصروف ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں
صور! ہمارے گھر میں ایک زبردست ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔ ہائے زہت
ے میری بھابی اور بڑے بھائی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں دوپہر کے کھانے کے
عد سو رہی تھی اور وہ میری بھابی کے پاس بیٹھی میری داستانِ محبت کے آخری
فاظ لکھ رہی تھی۔ کاش وہ میری سہیلی کبھی نہ ہوتی۔

میرے شہزادے! اس وقت میں نہ جانے کن گہری سوچوں میں غرق ہوں۔
بھی ابھی میں چاقو سے پیاز چھیل رہی تھی لیکن بالکل بے خبر تھی۔ پھر چاقو سے انگلی
بھی کاٹ لی مگر مجھے پتہ نہ چلا۔ ثریا نے بتایا تو میں یوں چونک اٹھی جیسے کسی کی نیند
وٹ جائے۔ منصور! کیا میں تمہیں حاصل کر سکوں گی؟ تم مجھے کہا کرتے تھے کہ آؤ
لاؤ سوچیں اگر ہماری شادی نہ ہوئی تو کیا ہو گا اور ہمارا زندگی بسر کرنے کا انداز کیا ہو گا۔
لیکن میں ایسے موقعوں پر تمہارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی، ایسی باتیں
نہ کرو۔ یہ اچھا شگون نہیں۔

آؤ منصور! اب میرے پاس آؤ اور اکٹھے سوچیں کہ اگر شادی نہ ہوئی تو کیا
ریں گے؟ میرے منصور! مجھے کیا علم تھا کہ پرسوں میں تمہیں آخری بار مل رہی ہوں۔

کاش مجھے پہلے پتہ چل جاتا اور میں جدا ہوتے وقت تمہیں جی بھر کے دیکھ لیتی۔ اب
میں تمہارے پاس کیسے آسکوں گی۔ میرے ارد گرد پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں ٹیلیفون
اٹھا کر ابا جان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اپنے بھائی کو میں نے بڑی مشکل سے
بھیجا ہے۔ شاید اب کبھی تمہیں نہ دیکھ سکوں منصور، شاید اب کبھی تمہارے خوبصورت
چہرے کو اپنے ہاتھوں سے نہ چھو سکوں۔ میں اس وقت سے رو رہی ہوں اور میں نے
کچھ نہیں کھایا پیا۔ اب میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ اب میں بہت جلد مر جاؤں گی تاکہ
نزہت کا دل ٹھنڈا ہو جائے اور اس کے انتقام کی آگ سرد پڑ جائے۔ منصور
آج سارا دن ہمارے گھر میں میری شادی کے چرچے رہے ہیں۔ میرے ماں باپ
بدنامی سے خوفزدہ ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے جلد سے جلد کسی جگہ بیاہ دیں گے۔ میں
تمہیں یہ خط نہ جانے کیسے لکھ رہی ہوں۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا ہے۔ کاش منصور کاش
میں تمہارے پاس ہوتی اور پھر میں تمہیں بتاتی کہ چاہے کوئی گھرانا آزاد ہو یا پرانی سوچ کا
—— غریب ہو یا امیر —— لڑکیوں کی حیثیت ہر جگہ ایک ہی ہوتی ہے۔ اور پھر
شادی کے معاملے میں تو باپ اور بھائیوں کے ہوتے ہوئے کوئی لڑکی نہیں بول
سکتی۔ امیر گھرانوں میں، پڑھے لکھے آزاد گھرانوں میں، ماں باپ لڑکی کو اطلاع
دے کر من مانی کارروائی کرتے ہیں اور جاہل گھرانوں میں بغیر اطلاع دیئے کر گذرتے
ہیں۔ بس پڑھے لکھے اور جاہل گھرانے میں صرف اسی قدر فرق ہے۔
منصور میں تمہیں شروع سے سارا قصہ سناتی ہوں۔ تم یقین کرنا میں اس وقت

پاگل سی ہوئی جا رہی ہوں۔ جس وقت نزہت نے بھابھی سے بات کی تو بھابی نے فوراً اپنے خاوند اور میرے دوسرے بھائیوں کو دفتر سے بلا بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد ابا جان بھی آ گئے اور وہاں ایک پنچائت سی لگ گئی۔ مجھے انہوں نے درمیان میں بٹھلا لیا اور ہر طرف سے طعنوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ میں صرف روتی رہی اور روتی رہی میرے ابا جان انتہائی قدامت پسند ہیں۔ وہ شادی کے معاملوں میں لڑکیوں کا دخل کسی طرح بھی گوارا نہیں کیا کرتے۔ دولت نے انہیں بہت زیادہ مغرور بنا دیا ہے۔ بڑے بھیا مجھے بے حد لعن طعن کر رہے تھے۔ اباجان کی آنکھوں میں سرخ سرخ خون اتر آیا تھا اور وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ اس لڑکی نے میری عزت خاک میں ملانے کی کوشش کی ہے۔ میں ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی شادی کر دوں گا اور ایسی جگہ کروں گا جہاں عمر بھر یہ گھر سے باہر قدم نہ رکھ سکے گی۔ بھابی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ اباجان تو مجھے مارنے کے لئے بھی اٹھے مگر امی جان نے انہیں پکڑ لیا۔ امی نے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن جہاں باپ اور بھائی جمع ہو جائیں وہاں ماں بیٹیوں کی کون سنتا ہے؟ اباجان اور بھیا کوئی آخری فیصلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میں ابھی تک ضبط کئے بیٹھی تھی۔ عورت کی آواز مرد کی بھاری آواز تلے دب جاتی ہے اور یہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ پھر بھی میں نے کہہ دیا۔

"آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ میں یہ شادی ہرگز نہ کروں گی اگر آپ مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو پھر مجھ سے اچھائی کی توقع کیوں رکھتے

ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنی بہتری کے لئے کیا ہے۔ اور آئندہ بھی جو کچھ
کروں گی بہتری کے لئے ہی کروں گی"
اس پر بھیّا اور ابّا جان بہت بگڑ گئے۔ کہنے لگے۔
"تو پھر تو ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اگر تو نے ہماری رائے کا احترام نہ
کیا تو جہاں تمہارا جی چاہے جا سکتی ہے لیکن اس گھر میں نہیں رہ سکتی"
میں چپ رہی۔ رضیہ اور ثریا بھی ایک طرف چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ اچھے منصور دیر
تک جھک جھک ہوتی رہی۔ اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے گھروں میں
لڑکیوں کی کیا وقعت ہے۔ آخر میں نے ابّا جان سے کہہ دیا کہ "اگر آپ نے میری مرضی
کے خلاف کہیں بات پکی کر دی تو بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ میں ابھی سے آپ
کو آگاہ کئے دیتی ہوں کہ اگر میں بُری ہوں تو پھر میری یہ باتیں آپ کو ناگوار نہیں گذرنی
چاہئیں" اتنا کہہ کر میں اپنے کمرے میں آگئی اور تمہارے متعلق سوچتی رہی اور روتی
رہی۔ اس وقت مجھے اس بات کی از حد ندامت تھی کہ میری اس گھر میں کوئی شنوائی
نہیں۔ میں سوچنے لگی اگر انہوں نے میری کسی اور جگہ شادی کر دی تو ان وعدوں کا
کیا حشر ہوگا جو میں نے منصور سے کئے تھے؟ پھر مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے دل
کو کانٹوں پر کھینچ رہا ہے۔ منصور! کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟ منصور تم مجھے ضرور بتانا۔
کیا مجھے چھوڑنے کا تمہیں بہت صدمہ ہوگا؟ منصور! تم بہت ہی اچھے لڑکے ہو۔
نہیں چھوڑنے کا رنج ہر ایک کو ہو سکتا ہے اور اسی لئے اگر ایسا کبھی ہوا تو میں رنج

سے پاگل ہو جاؤں گی۔ پھر شاید میں مر جاؤں۔ لیکن کیا مجھے چھوڑنے کا تمہیں بھی غم ہو گا؟ کیوں ہو گا؟ منصور! میں خوبصورت نہیں ہوں۔ مجھ میں کوئی اچھائی بھی نہیں ہے۔ میں تو محض ایک ضدی اور بقول اپنے والدین ایک بری لڑکی ہوں—!

منصور! میرے منصور! اگر تم میری زندگی میں نہ آئے ہوتے تو آج میں اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر چکی تھی۔ جو گھر والوں کا جی چاہتا کرتے۔ جب دل بجھ جائے جب امیدیں اداسیوں کے کفن اوڑھ لیں تو پھر انسان بھی بدل جاتا ہے۔ پھر اگر میرے گھر والے مجھے پینے کو زہر بھی دے دیتے تو میں نے پی لیا ہوتا۔ مگر اب ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔ اب مجھے اپنے منصور سے کوئی جدا نہ کر سکے گا۔ اچھے منصور! میں تم سے ایک بار ضرور ملوں گی۔ تم کوئی فکر نہ کرنا۔ میں نے جو تم سے وعدے کئے ہیں مجھے ان کا پورا پورا احترام ہے اور میں ان پر ہمیشہ ہمیشہ قائم رہوں گی۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو پہلے ہنس ہنس کر وعدے کرتی ہیں اور پھر رو رو کر مکر جاتی ہیں۔ جب تک میرے ہوش و حواس قائم ہیں مجھ سے دنیا کی کوئی طاقت زبردستی نہیں کر سکتی۔

اے کاش! میرے اختیار میں ہو تو میں اس ماحول کو چکنا چور کر کے رکھ دوں جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ اچھے منصور! تم نہیں جانتے میں نے اس ماحول میں رہ کر کس قدر جد و جہد نہیں کی۔ اپنی راہیں خود ترتیب دی ہیں۔ اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ ہر مخالفت سے شدید ٹکر لی ہے۔ کیونکہ میں عام لوگوں ایسی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنے محدود ماحول میں مطمئن نہیں تھی۔ میں دیکھتی تھی کہ یہاں انسان کی

بنیادی ضرورتوں کو کس بری طرح سے پامال کر دیا جاتا ہے۔ میں دیواروں میں قید نہیں رہنا چاہتی تھی۔ میں کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ میں ہر زیادتی کا بھرپور طریقے سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی اور پھر میں نے ہر ایک سے ٹکر لی۔ اور اب میں کیونکر چپ رہ سکتی ہوں؟ یہ میری شادی جہاں کرنا چاہتے ہیں میں ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کر سکتی۔ میں نے عہد کیا ہوا ہے کہ اپنی مرضی سے شادی کروں گی۔ اور یہ ایک ایسی ضد ہے جو بچپن ہی سے میرے سینے میں پرورش پا رہی ہے۔ میں اب اپنے فیصلہ کُن جذبوں سے حقائق کے چہروں پر سے نقاب اٹھاؤں گی۔ اچھے منصور! جب میں نے اپنی ساری زندگی اسی جدوجہد میں گذاری ہے تو پھر بھلا اب میں کیونکر چپ رہ سکتی ہوں؟ اب کیونکر میں اپنی پچھلی محنتوں پر پانی پھیر سکتی ہوں؟ میرے حوصلوں کو وقت کے اژدھا کبھی نہیں نگل سکتے۔ میں اب اپنے اندر وہ عظیم قوت محسوس کر رہی ہوں جو طوفانوں کے رُخ پھیر دیتی ہے اور آندھیوں اور زلزلوں سے ٹکر لیتی ہے۔ میں زمانے کو مجبور کر دوں گی کہ وہ اپنی رفتار کو بدل دے۔ میں حالات سے ٹکرا جاؤں گی۔ میں ہر حملہ آور کو للکار سکتی ہوں۔ اچھے منصور! مجھے زندگی عزیز ہے۔ وہ زندگی جو انسان کو ایک ہی بار ملتی ہے۔ خوبصورت اور پُر امید زندگی۔ میں ایک نہ ایک دن زندگی کی اس بلندی تک ضرور پہنچوں گی جہاں یہ لوگ مجھے سر اٹھا کر دیکھیں گے۔ میں آج بہت تھک گئی ہوں اور یہ ذہنی تکان میرے جسم کو بھی تھکا رہی ہے مگر یہ بہت جلد دور ہو جائے گی۔ یہ تکان تمہارے ساتھ مل کر بہت جلد دور ہو جائے گی۔ پھر

ہم اکٹھے بلند ترین چوٹیوں تک پہنچیں گے۔ ہم سورج کو ہاتھ لگائیں گے۔ ہم چاند ستاروں کی وادیوں میں اپنے الاؤ روشن کریں گے۔ ہم گلاب کے شگوفوں میں چھپ چھپ کر بیٹھیں گے اور ہمارا قیام سمن زار بہاروں میں ہوگا۔

میرے شہزادے! تم اپنے آپ کو پریشان نہ کرنا۔ فتح آخر ہماری ہوگی۔ اب میں بھی گھر میں سوائے امی، رضیہ اور ثریا کے اور کسی سے کلام نہیں کروں گی۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ اپنے بھیا اور ابا سے کبھی نہیں بولوں گی۔ میرے دل میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جو طاقت اور دولت کے بل پر دوسروں پر زور ڈالیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب روپیہ بولتا ہے تو صداقت چپ ہو جاتی ہے مگر میں کبھی چپ نہیں رہ سکتی۔ اب میں نے اپنے ذہن کو بالکل اسی طرح تمام رنج و غم سے صاف کر لیا ہے جس طرح اسفنج سے سلیٹ صاف کر لیتے ہیں۔ میں زندگی کی بے رحم ناہمواریوں کا پوری پوری طرح ڈٹ کر مقابلہ کروں گی اور مزاج کی سختی میں اس دھرتی کے مانند بن جاؤں گی جو روندے جانے کے باوجود سبزہ اور پھول پیدا کرتی ہے، جو کہیں آبشاروں کی صورت میں نغمہ ریز ہے اور کہیں گلزاروں کے روپ میں تبسم کناں ہے اور کہیں ویران میدانوں کی شکل میں خاموش ہے میں اپنے بھائیوں کو ہمیشہ معاف کر دیا کرتی تھی اور ہمیشہ ان کی عزت کرتی تھی۔ مگر آج انہوں نے مجھے بہت سخت لفظ کہے ہیں اور میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ بڑے بھیا کے لہجے میں تو اتنا طنز بھرا ہوا تھا جیسے میں نے ان کی بیوی کا خون کر دیا

ہو۔ ان کو شائد معلوم نہیں کہ عورت بڑے سے بڑا زخم بھول سکتی ہے مگر بعض اوقات چھوٹی سی بات پر اڑ جاتی ہے اور اپنی ساری زندگی سے کھیل جاتی ہے۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے جانتی ہوں کہ جب میں کسی کو اچھا سمجھوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کے خیال سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میری محبت وہ ستون ہے جسے بڑے سے بڑا سمندری طوفان بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔ منصور! جب میرے ارد گرد ہزار فتنے بیدار ہو جاتے ہیں تو مجھے تمہارے وہ الفاظ یاد آجاتے ہیں جو تم نے اس روز مجھے لارنس باغ میں کہے تھے کہ:

"لالہ! چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میں اپنے دل کا سکون خراب نہیں کرتا۔"

منصور! میں نے تمہارے ان الفاظ کو اسی وقت ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ اب میں تمہاری اس بات پر دل و جان سے عمل کروں گی اور ان حالات میں بھی مطمئن رہوں گی۔

اچھے شہزادے! مجھے وہ خوبصورت شام یاد آرہی ہے جب ہم نہر کنارے کھیت کی منڈھیر پر بیٹھے تھے۔ ہمارے سر پر نیلا آسمان تھا جس میں سفید سفید بادلوں کے جزیرے تھے۔ ارد گرد مخملیں کھیت تھے۔ پاس ہی ندی کا شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ درختوں کی چھاؤں میں سکون اور خنکی تھی اور میں تمہارے پاس چپ چاپ بیٹھی تھی۔ تم یقین کرو میں کبھی بھی گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ میں تمہاری گود میں سر رکھ کر لیٹ جانا چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ وقت کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ مجھے جنگل

خوبصورت کھیت اور کھلی فضا پاگل سا بنا دیتی ہے۔ ہم جدا ہو گئے۔ تم سامنے کی پگڈنڈی
پر نہر کنارے چل دیئے اور میں مٹی کے کچے راستے پر گرتی پڑتی چلتی رہی اور سورج
درختوں کے عقب میں غروب ہو گیا۔ پھر میں اور ثریا دونوں واپس آئیں۔ راستے
میں ندی کا پانی کتنی بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس
کا رنگ ہر چیز پہ نمایاں ہو رہا تھا۔ میرا جی چاہنے لگا کہ تانگے سے چھلانگ لگا دوں
اور بھاگ کر شفق کے دامن میں اتر جاؤں۔ شفق کے اس پار نہ جانے کس قدر خوبصورت
وادیاں ہوں گی۔ جس چادر کا کنارا اتنا حسین ہے وہ ساری چادر کتنی خوبصورت
ہو گی۔ کاش! میری موت کسی حسین منظر کی گہرائیوں میں واقع ہو!

تم مرد ہو منصور! میں جانتی ہوں تم مجھے بہت جلد بھول جاؤ گے۔ جس دن تم
مجھے بھول گئے۔ اس دن میں دریا کی گہرائی دیکھنے اس میں اتر جاؤں گی۔ اور پھر شاید
کبھی باہر نہ آؤں۔ گہری چیزیں —— گہری محبت —— یہ سبھی کچھ چھپا ہوا ہوتا
ہے۔ اس وقت میرا دل پھر اداس ہو گیا ہے۔ میرا جی پھر نڈھال سا ہو رہا ہے
میرا دل جو دوسروں کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہے ہر ایک نے مسل ڈالا ہے
دنیا میں مسلی ہوئی چیزیں کون پسند کرتا ہے۔ لیکن منصور! مجھے تو مرجھائے ہوئے
پھولوں، ٹوٹے ہوئے دلوں، اداس چہروں اور دکھی چیزوں سے والہانہ ہمدردی
ہے۔ شاید ان میں مجھے اپنا آپ نظر آتا ہے۔

اچھے منصور! میری آنکھوں میں پھر آنسو آگئے ہیں۔ اپنی بے بسی کے خیال

سے میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے پاس آ کر تمہارے زانو پر سر رکھ کر خوب روؤں۔ خوب روؤں۔ یہاں تک کہ ایک بھی آنسو باقی نہ رہے منصور! تمہارے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر والوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ مجھے گیسٹ ہوم سے نفرت ہوگئی ہے۔ انہی لوگوں کی غفلت کے باعث مجھ ایسی غم خوردہ لڑکی کے سینے میں غم کے بڑے بڑے زخم بن گئے ہیں اور شاید میں ساری زندگی دکھی رہوں۔ سوچتی ہوں، پتہ نہیں تمہیں بھی پا سکوں گی یا نہیں؟ بس اس خیال سے اور بھی رونا آرہا ہے۔ اگر تمہیں نہ پا سکی تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ منصور! پھر میں کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟ اس وقت تم سے ملاقات بھی نہیں کر سکتی۔ فون بھی نہیں کر سکتی۔ پھر اس محبت، اس پیار کا فائدہ کیا ہوا؟ مجھے اپنے گھر میں آج یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنوں سے بچھڑ کر کسی غیر جگہ پر آگئی ہوں۔ جہاں کوئی مجھے نہیں جانتا، کوئی مجھے نہیں پہچانتا۔ جہاں ہر شخص مجھے گھور کر دیکھتا ہے اور ہر شخص اجنبی ہے۔ سورج کی سنہری کرنیں کھڑکی میں سے ٹوٹ ٹوٹ کر مجھ پر گر رہی ہیں اور مجھے تمہارے زندگی بخش، محبت کی حرارت سے بھرپور سانس کا خیال آرہا ہے۔

میرے شہزادے! میں عام لڑکیوں ایسی نہیں ہوں۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ میری شادی اگر تم سے نہ ہوئی تو پھر دنیا کے کسی شخص سے نہ ہوگی۔ میں تمہیں شدت سے یاد کر رہی ہوں۔ تم آؤ تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم میں گم ہو جاؤں۔ جی چاہتا ہے تم مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لو اور کوئی طاقت مجھے تم سے

علیحدہ نہ کر سکے۔ تم یقین کرو منصور! میں تمہیں بے انتہا پیار کرتی ہوں۔ میں تمہیں
کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ اچھے شہزادے! تمہاری شہزادی بیوفا نہیں ہے۔ میرے
لئے دنیا میں جو کچھ ہو وہ صرف تم ہی ہو۔ میں تمہارے ان جذبات کو کبھی دھوکا نہیں دے
سکتی جو تمہارے دل میں میرے لئے ہیں۔ منصور! میں تمہارے بغیر زندگی قبول کرنے
سے انکار کر دوں گی۔ تم میرے اپنے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے تمہیں اپنے دل کے
اندر چھپا لوں۔ اچھے منصور! میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ تم میرے بغیر اداس
ہو جاؤ۔ میں تمہیں غم کے اندھیروں کے سپرد کبھی نہ کروں گی۔ میں ہمیشہ ہمیشہ تمہارے
ساتھ رہوں گی۔ نزہت نے جو وار کیا ہے میں اس کا جی کھول کر مقابلہ کروں گی
اس سے زیادہ وہ مجھ سے دشمنی نہیں کر سکتی تھی۔

صرف تمہاری

لالہ رُخ

خط پڑھ کر منصور کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے پائپ اٹھایا۔ ہاتھوں میں اسے
دو تین بار گھمایا اور پھر میز پر رکھ دیا اور انگلیاں چٹخانے لگا۔

"آخر اس نے وہی کیا جو ایک عام عورت کیا کرتی ہے"

اس دوران میں چائے آ چکی تھی اور میں نے منصور کے لئے ایک پیالہ بنا رکھا تھا۔
منصور ٹھنڈی چائے پینے لگا اور میں لالہ کا خط پڑھنے لگا۔ چونکہ مجھے نزہت سے اسی
قسم کے سلوک کی توقع تھی اس لئے میں زیادہ حیران نہ ہوا۔ مگر منصور زیادہ پریشان

تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہونا چاہیئے؟ دو تین گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ لالہ کے باپ کے پاس رشتے کا پیغام بھیج دیا جائے۔ اگرچہ ہمیں یقین تھا کہ اس کا باپ کسی بھی حالت میں اپنی کا رشتہ ایک مفلوک الحال کے ساتھ طے نہیں کرے گا مگر منصور بضد تھا کہ یہی آخری علاج ہے اور ہمیں اس وقت پانسہ ضرور پھینک دینا چاہیئے۔ دوسرے روز لالہ کا بھائی خط کا جواب لینے آیا تو منصور نے اسے لکھ دیا کہ وہ رشتے کا پیغام بھجوا رہا ہے وہ اپنے پاؤں پر مضبوط ہو جائے۔ فوراً ہی لالہ کا جواب آگیا کہ اس وقت پیغام بھیجنا غلطی ہو گی اور اس کے ماں باپ ایسی حالت میں کبھی یہ رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ لیکن منصور بالکل نہ مانا۔ اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو لالہ کو کوئی اور شخص بیاہ کرلے جائیگا۔ اور وہ دیکھتا ہی رہ جائے گا۔ چنانچہ اسی روز دوپہر کے بعد میں نے اپنے بزرگ صورت خالو کو ساتھ لیا اور ہم لالہ کے باپ کے پاس پہنچ گئے۔

لالہ کا باپ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ پتلا دبلا جسم، گورا رنگ، سر پر سرخ ترکی ٹوپی
ڈھیلے ڈھالے بھورسلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ آنکھوں پہ سنہرے فریم کا چشمہ
لگائے اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اس کا دفتر شہر کے وسط میں ایک خوبصورت عمارت
کی تیسری منزل پہ تھا۔ جس وقت میں اور میرا خالو اس کمرے میں داخل ہوئے وہ
کسی فائل پہ جھکا نیلے کاغذ کا کوئی نقشہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی عینک
کھسک کر آگے کو جھک آئی تھی اور بھنوئیں سکڑی ہوئی تھیں۔ کنپٹیوں پر کئی ایک
سفید بال تھے اور وہاں دو تین نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ ہمیں اندر داخل ہوتا دیکھ
کر اس نے خالص دفتری مسرت کا اظہار کیا اور ہمیں کرسیاں پیش کیں۔ فائل
بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور چشمہ اتار کر میز پہ رکھ دیا۔

"فرمائیے —— میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے ذرا کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

"جس کام کے لئے ہم حاضر ہوئے ہیں وہ یہاں نہیں ہو سکتا اگر آپ دفتر سے فراغت کے بعد کوئی وقت دیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

لالہ کا باپ ذرا مسکرایا۔

"اگر آپ ابھی وہ کام کہہ دیں تو میرے خیال میں کوئی حرج کی بات نہ ہوگی۔"

"جی نہیں وہ کچھ غیر دفتری —— میرا مطلب ہے کچھ ذاتی کام ہے۔"

لالہ کے باپ کی بھنویں ذرا اکٹھی ہو گئیں۔

"یعنی ——"

"جی آپ اگر دفتر کے بعد ملیں تو بڑے اطمینان سے بات کر سکیں گے۔"

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے، آنکھوں پہ چشمہ لگایا، نوٹ بک کی ورق گردانی کی، ایک صفحے پر کچھ لکھا ہوا پڑھا اور چشمہ اتار کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"آپ پانچ بجے کے بعد اسی جگہ تشریف لے آئیں۔"

شکریہ،

ہم اٹھے اور ہاتھ ملا کر دفتر سے باہر نکل آئے۔ لالہ کا باپ کچھ فکر مند سا ہو گیا تھا۔ لفظ 'ذاتی کام' نے اسے کافی حد تک بیدار کر دیا تھا۔ بہر حال میں نے پورے پانچ بجے اپنے خالو کو ساتھ لیا اور لالہ کے باپ کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ ہمیں پہلے کی طرح بڑے تپاک سے ملا۔ فوراً چائے آگئی۔ چائے پر چیزوں کی مہنگائی، جائدادوں کے جھگڑوں اور سیاسی حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ جب ہم چائے پی چکے تو میں نے بغیر کچھ تمہید باندھے اور دوسری بات کئے ۔۔۔ بڑے آرام سے کہا۔

'ہم جناب کی خدمت میں آپ کی بیٹی کے رشتہ کے لئے آئے ہیں'

لالہ کا باپ رومال سے منہ پونچھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ہونٹوں پر ہی رہ گیا۔

'آپ کا مطلب ؟'

'ہم چاہتے ہیں کہ آپ میرے چھوٹے بھائی کو اپنی فرزندی میں قبول کر لیں'

لالہ کا باپ خاموش ہو گیا۔ اس نے رومال میز پر رکھ دیا اور ذرا آگے کو جھک کر جیسے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

'لڑکا کیا کام کرتا ہے ؟'

"وہ بنک میں ملازم ہے"

لالہ کے باپ نے چونک ہماری طرف دیکھا۔

"اس کا نام منصور ہے"

"جی ہاں ——"

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے کی حالت میں فرش پر ادھر ادھر چکر لگانے لگا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور چہرے پر غصے اور طیش کی علامات تھیں۔

"آپ کو یہ کیسے جرأت ہوئی کہ میرے سامنے اس شخص کے رشتے کی بات کریں جس نے میری لڑکی کو ساری برادری میں بدنام کر دیا ہے۔ جس نے میری عزت پر حملہ کیا اور میرے خاندان کی شرافت پر ذلت کا داغ لگانے کی کوشش کی ......"

میں پہلے تو گھبرا گیا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے منصور کے خلاف آپ کو بھڑکایا گیا ہے۔ وہ نہایت شریف لڑکا ہے۔ برسر روزگار ہے شریف ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ آپ کی لڑکی کو گھر کی رانی بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور میرا خیال ......"

"میں کسی کا خیال نہیں سننا چاہتا"

لالہ کے باپ نے طیش میں آ کر میری بات کاٹ دی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا"

اتنا کہہ کر اس نے میز کی دراز میں سے چشمے کا کیس نکالا۔ عینک ڈال کر اسے جیب میں رکھا اور چھڑی اٹھا دفتر سے باہر نکل گیا۔ چار و ناچار ہم بھی اٹھے اور دفتر سے باہر آگئے۔

ٹی ہاؤس میں منصور بڑی بے تابی کے عالم میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میری صورت دیکھ کر وہ کافی نا امید سا ہو گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ لالہ کے باپ نے یہ رشتہ منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ بغیر کچھ کہے سنے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ اس نے لالہ کو ایک بڑا زوردار خط لکھا جس میں اس کی ساری محبت، سارے پیار اور تمام وعدوں کو دہرا کر اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر اس کے پاس آجائے تاکہ وہ اپنے طور پر شادی کر لیں اور اپنی تمام امیدوں کو شاداب ہوتا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ سکیں۔ اس کے جواب میں لالہ نے یہ خط لکھا۔

"میرے اپنے منصور!

کلیم بھائی نے میرے ابا جان سے رشتے کی بات چھیڑ کر میرے لئے حالات کو اور زیادہ دشوار بنا دیا ہے۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ ابھی یہ بات شروع کرنے کا وقت نہیں ہے۔ لیکن تم نے میری بات پر عمل نہ کیا اور میرے ارد گرد بھڑکنے والے شعلوں میں اضافہ کر دیا اور میرے لئے گھر کی دیواریں اور اونچی کر دی

ہیں۔ منصور! اس وقت مجھے تمہارے اور اپنے درمیان کئی سمندر، کئی ریگستان اور کئی پہاڑ حائل دکھائی دے رہے ہیں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جس دن تم لوگ میرے ابا جان سے ملے ہو ہمارے گھر میں کیسا فساد نہیں مچا۔ ابا جان زخمی شیر کی طرح گیسٹ ہوم کے کمروں میں پھر رہے تھے اور گرج گرج کر مجھے اور تمہیں اور سب کو کوس رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے انہیں بیچ بازار میں عریاں کر دیا ہے اور محض میری وجہ سے وہ آج کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ منصور! میں ابا جان کے ان فقروں پر بہت دیر تک روتی رہی۔ بھلا میں کب چاہتی تھی کہ وہ میری وجہ سے یوں بدنام ہوں۔ میں نے تم سے محبت کی تھی منصور، کسی دیوتا کو گالی نہیں دی تھی، کسی دیوی کا بت نہیں گرایا تھا اور کسی پھول پر گندگی نہیں اچھالی تھی۔ کاش! تم تھوڑا سا صبر کر لیتے اور ابھی کچھ دن ضبط کے ساتھ گزار دیتے۔ منصور! اب کیا ہوگا؟ منصور! میرے گھر میں سب لوگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ خدا جانے یہ میرے لئے کیا فیصلہ کریں!

منصور! میں تمہاری کشتی میں سوار ہو چکی ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب مجھے کوئی اس فیصلے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ میرے راستے میں خواہ کتنے ہی طوفان کیوں نہ آئیں میں تمہارے ساتھ، تمہاری کشتی میں ہی رہوں گی۔ تم جھونپڑی میں بھی رہو گے تو میں خوشی خوشی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میری خوشی صرف تمہاری محبت اور تمہارے قرب میں ہے اور وہ جہاں تم ہو گے

یں میسر آئے گی۔ تم زندہ رہو گے تو میں بھی زندہ رہوں گی اور خوش رہوں گی۔
صور! میں یہ باتیں تمہیں جذباتی بن کر نہیں لکھ رہی۔ تم یقین کرنا اس وقت
کوئی میرے سامنے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے ہاتھ میں سورج لے کر
بھی آجائے تو منصور میں پھر بھی تمہاری اور صرف تمہاری طرف ہی آؤں گی۔ مجھے
ہر لحظہ، ہر آن، اپنے ان وعدوں کا خیال رہے گا جو میں نے تم سے کئے تھے اور
میں اپنے وعدوں کے سامنے کبھی مجبور نہیں ہوا کرتی۔ اور سنو منصور! یہ جو تم نے
بھاگ کر آجانے کو کہا ہے یہ بڑی بری بات ہے۔ میں اپنے گھر سے اسی طرح رخصت
ہونا چاہتی ہوں جس طرح دلہنیں رخصت ہوا کرتی ہیں۔ حالات کیسی ہی نازک صورت
اختیار کیوں نہ کر جائیں میں ان کے آگے سپر نہ ڈالوں گی۔ میں تمہیں پورا پورا یقین
دلاتی ہوں کہ میں اپنے اندر اتنی قوت محسوس کرتی ہوں کہ خراب سے خراب
اور سنگین سے سنگین حالات میں بھی اپنے والدین کو مجبور کر دوں کہ میری شادی تم
سے ہی کریں۔ میں اپنے گھر والوں کو ضرور منا سکتی ہوں اور منا رہی ہوں۔ چاہے
اس کے لئے مجھے کتنی ہی مار اور طعنے کیوں نہ سہنے پڑیں۔ مجھے وہ لڑکیاں ایک
آنکھ نہیں بھاتیں جو گھر سے بھاگ نکلتی ہیں۔ ان میں اگر جرأت ہو تو وہ ماں باپ کو
اپنے فیصلے کے سامنے جھکا سکتی ہیں۔ لیکن بھاگ نکلنا بزدلی ہے — سراسر
بزدلی ہے۔ ویسے تم نے اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ تم فکر نہ کرو منصور
میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں اور یہ صرف اس محبت کی خاطر جو میرے دل میں

ہے اور جو تمہارے دل میں ہے۔

منصور! اب میں شاید تمہیں کبھی نہ مل سکوں۔ میرے گھر والوں نے میرے اوپر سخت پہرہ لگا دیا ہے۔ میرا گھر سے باہر قدم رکھنا بالکل بند کر دیا گیا ہے۔ منصور! میرا دل تمہیں ملنے کو تڑپ رہا ہے مگر کیا کروں؟ تمہیں کیسے ملوں؟ تمہیں کہاں بلاؤں؟ منصور! مجھے ابھی ابھی ایک ترکیب سوجھی ہے تم سنو گے تو بڑے خوش ہو گے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کل رات تم ہماری کوٹھی کے پچھلے دروازے پر آ کر مجھے مل جاؤ۔ رات کو وہاں کوئی پہریدار یا ملازم نہیں ہوتا۔ وہ دروازہ لکڑی کا ہے اور ہمیشہ بند رہتا ہے تم ایسا کرنا رات کی بجائے پچھلے پہر کوئی چار بجے کے قریب وہاں پہنچ کر آہستہ سے۔ بڑی آہستہ سے دستک دینا۔ میں سیر کے بہانے قریب ہی درختوں میں گھوم رہی ہوں گی۔

منصور ضرور ضرور ضرور آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔

کل رات —— پورے چار بجے!

ہمیشہ تمہاری

مغموم لالہ رُخ

منصور کو لالہ کا خط پانچ بجے شام ملا۔ وہ رات کو لالہ کے گھر جانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اسے بہتیرا سمجھایا کہ ان حالات میں لالہ کے گھر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے مگر محبت اندھی ہوتی ہے۔ منصور نے سنی ان سنی کر دی اور تین بجے کا الارم لگا کر سو گیا۔

پورے تین بجے کارنس پر رکھا ہوا ٹائم پیس چیخ اٹھا۔ منصور بستر سے باہر نکل آیا۔

اس نے سیاہ پتلون پر گہرے بھورے رنگ کا گرم کوٹ پہنا۔ بڑی احتیاط
سے دروازہ کھول کر اسے دوبارہ بند کیا اور لالہ کے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔
رات بڑی اندھیری تھی اور سڑکوں اور گلیوں میں کارپوریشن کے لیمپ بھی بجھ چکے
تھے۔ اپنی گلی پار کر کے منصور سٹیشن جانے والی سڑک پر آ گیا۔ آسمان پر ننھے ننھے لاتعداد
ستارے چمک رہے تھے۔ دور سٹیشن کی عمارت اور سگنلوں کی سرخ و زرد بتیاں ٹمٹما
رہی تھیں۔ کہیں ایک انجن کھڑا سسکار رہا تھا اور بھاپ کے بادل اُگل رہا تھا۔
سڑک دور تک سنسان اور ویران تھی۔ سردی اگرچہ زیادہ نہیں تھی پھر بھی پچھلے پہر کی
ہوا میں خنکی تھی۔ وہ چلتا گیا۔ یہاں تک کہ شہر سے باہر سول لائنز کے رقبے میں آ
گیا۔ یہاں شہر کی نسبت زیادہ خاموشی اور ویرانی تھی۔ دو رویہ فٹ پاتھ پر درخت
سر جھکائے سو رہے تھے اور ارد گرد تمام کوٹھیوں کی روشنیاں گل تھیں۔ راستے
میں سوائے ایک کوچوان کے اسے کوئی انسان نہ ملا۔ یہ کوچوان تانگے میں بیٹھا
اونگھ رہا تھا۔ منصور قریب سے گزرا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔ لمبی سیدھی سڑک
عبور کر کے وہ اس پتلی سی سڑک پر آ گیا جو کوٹھیوں کے ساتھ ساتھ گول چکر کاٹ
کر بائیں طرف نہر کی جانب نکل گئی تھی۔ جب یہ سڑک ختم ہونے لگی تو منصور تین چار
کوٹھیاں چھوڑ کر ایک گلی میں گھوم گیا۔ تھوڑی دور جا کر وہ ایک درخت کے نیچے
کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے گیسٹ ہوم کے عقبی حصے کے درخت چپ چاپ کھڑے
تھے۔ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی چھوٹی سی کھائی کے پار ایک شکستہ سی دیوار بھی جسے

جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اسی دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا جس کے دونوں پٹ بند تھے۔ یہاں اندھیرا گہرا تھا اور منصور کو تاروں کی روشنی میں چیزوں کے خاکے ہی نظر آ رہے تھے۔ اس نے کلائی پر وقت دیکھا۔ ابھی صرف ساڑھے تین ہی ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ لالہ ضرور بیدار ہو چکی ہو گی اور بہت ممکن ہے وہ دروازے کے قریب ہی کھڑی ہو۔ مگر وہ ٹھیک چار بجے دستک دینا چاہتا تھا۔ وہ درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر ذرا اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ سامنے پودوں کی قدِ آدم دیوار میں کہیں جھینگر بولنے لگا۔ ایک آدھ رات کی رانی اور چنبیلی کی مہک بڑے پیار سے اسے چھو کر گزر گئی۔ تمباکو پینے کو اس کا جی مچلنے لگا لیکن وہ پائپ قصداً گھر چھوڑ آیا تھا۔ اس لئے کہ ایسے مقام پر پائپ سلگانا دوسروں کو اپنی موجودگی سے باخبر کرنا تھا۔ اس نے اپنا سر درخت کے تنے سے لگا دیا اور درختوں کے بیچ میں سے لالہ کے مکان کے دھندلے دھندلے خاکے کو دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نہ کسی کمرے میں ایک دم بتی روشن ہو گی۔ لالہ باہر نکلے گی اور بتی پھر بجھ جائے گی۔ وہ کتنی ہی دیر تک انتظار کرتا رہا مگر کسی کھڑکی، کسی روشندان میں روشنی نہ ہوئی۔ اس نے کوٹ کا بازو پرے ہٹا کر وقت دیکھا چار بجنے میں پورے چھ منٹ باقی تھے۔ اس نے کوٹ کے کالر اٹھا کر بٹن اچھی طرح بند کئے۔ ڈھلکی ہوئی جرابیں اوپر کیں اور لمبی گھاس اور جھاڑیوں میں دبے دبے چلتا لالہ کے مکان کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس

پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا
تھا جیسے وہ اس جگہ چوری کرنے آیا ہے۔ اسے اپنے آپ پر چور کا گمان ہونے
لگا اور اس نے سیٹی کی تیز آواز سنی اور پولیس کے بھاری بوٹوں والے قدم
بھاگتے ہوئے اس کے قریب آکر رک گئے۔ وہ تڑپ کر دیوار کے سائے میں ہو
گیا اور اسے پسینہ آگیا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا —— کوئی بھی نہیں تھا۔ درختوں
کی لٹکتی ہوئی خاموش ٹہنیاں اس کی سمت بازو پھیلائے گہری نیند میں تھیں۔ دروازے
کی دہلیز میں اگی ہوئی گھاس میں سے کوئی شے پھدک کر دوسری طرف بھاگ گئی۔

منصور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے آہستہ سے دروازے
کے پاس جاکر رک گیا۔ اس نے آخری بار اطمینان حاصل کرنے کے لئے اپنے ارد
گرد نگاہ دوڑائی اور دروازے پر تین بار بڑی نرمی سے دستک دی۔ اسے ایکا
ایکی یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کسی ڈھول پر تین بھرپور ہاتھ مارے ہیں اور ابھی
کوئی دم میں ہر طرف کوٹھیوں کی روشنیاں جگمگا اٹھیں گی اور ایک شور مچ جائیگا
اور اسے اسی عالم میں گرفتار کرکے جیل بھجوا دیا جائے گا۔ اسے اپنی دستک کی
آواز پر اس چنگاری کا شبہ ہوا جو فلیتے پر بھڑکتی ہوئی بارود کی طرف بڑھ رہی ہو۔
اس نے جھک کر دروازے کی درز پر اپنا کان رکھ دیا۔ دوسری طرف گہری خاموشی
تھی۔ وہ سوچنے لگا کہیں لالہ نے مذاق تو نہیں کیا؟ کہیں وہ اپنے پلنگ پر نرم
کمبل میں دھنسی سو تو نہیں رہی؟ اس نے ایک بار پھر آہستہ سے دستک دی اور

دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔ دوسری جانب جھاڑیوں کے اِدھر اُدھر ہٹنے اور گھاس پر کسی کے دبے دبے قدم رکھنے کی آواز آئی۔ منصور کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ کیا خبر لالہ نہ ہو بلکہ اس کا باپ ہو جو بھنویں سکیڑے آنکھوں میں نفرت کے شعلے لیئے اس کی طرف بڑھ رہا ہو ——— وہ ایک دم سیدھا ہو کھڑا ہو گیا۔ کسی نے بڑی احتیاط سے چٹخنی کھولی اور رُک رُک کر دروازے کا پٹ ایک طرف ہٹنے لگا۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔

منصور کے سامنے لالہ کھڑی تھی۔ اداس اور خاموش!

اس نے لپک کر اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور پاگلوں کی طرح چومنے لگا۔ لالہ کچھ نہ بولی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور آواز دب گئی تھی۔ وہ منصور سے چمٹ گئی اور اس کی آنکھوں میں اپنے آپ آنسو آ گئے۔ دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش دیوار کے پاس درختوں کے گہرے سایوں میں کھڑے رہے۔ منصور وارفتگی کے عالم میں کبھی لالہ کا منہ چومتا، کبھی کان، کبھی گردن، کبھی ہاتھ، کبھی بالوں میں منہ چھپا دیتا۔ جب انہیں ایک دوسرے کی موجودگی اور قرب کا پورا پورا یقین ہو گیا تو وہ دروازہ بند کر کے پاس ہی جامن کے درختوں تلے گھاس پر بیٹھ گئے۔ منصور کو وہ شام یاد آ گئی جب وہ لالہ اور زنہت کے ساتھ وہاں آیا تھا اور اس نے پہلی مرتبہ لالہ کا منہ چوما تھا اور اپنی محبت کو ستاروں کی چھاؤں میں پلکیں کھولتے دیکھا تھا۔ اس نے لالہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

'لالہ! تم جاگ رہی تھیں؟'

'ہاں ۔۔۔ میں ساری رات نہیں سوئی'

لالہ کی آواز میں رت جگے کی گھلاوٹ اور مخمور تھکن تھی۔ منصور نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

'میں نے تمہاری جدائی میں بڑے بڑے دن گذارے ہیں لالہ! مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے میں تمہیں ایک ہزار سال بعد مل رہا ہوں'

لالہ نے پلکیں اٹھا کر محبت کی عمیق نگاہوں سے منصور کو دیکھا۔ پچھلے پہر کے گھلتے اندھیرے میں لالہ کی آنکھیں اس تارے کی طرح بھڑک رہی تھیں جو ڈوبنے کے قریب ہو۔ اس نے منصور کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

'میں بھی تمہیں دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ میں کئی دنوں سے رو رہی ہوں منصور ۔۔۔ تم اپنی لالہ کی خبر لینے کیوں نہ آئے؟ ۔۔۔ ہائے میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی منصور ۔۔۔'

اور اس نے اپنا سر منصور کے سینے پر رکھ دیا اور اپنے ریشمی رخسار اس کے کوٹ سے مسلنے لگی۔ منصور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ جنوبی فرانس کے جزیروں میں سیاحت کر رہا ہے اور اس کی ٹوپی میں منیلا کے سرخ پھول ہیں اور گلے میں کلیوں کا ہار ہے اور زمین پر نرم گھاس

کے ریشمی قالین بچھے ہیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور لالہ کے بالوں میں
چہرہ چھپا لیا۔ لالہ کے بالوں سے ہلکی ہلکی ٹھنڈی مہک آرہی تھی۔ ایسی مہک
اس نے سنگاپور کی برسات میں کنول سے بھری ہوئی جھیلوں کے قریب سے
گذرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ لالہ کا سر بھی ایک جھیل ہی تھا جہاں ادھ پکے خیالوں
کے کنول اپنی پنکھڑیاں کھول رہے تھے۔ لالہ کا پھول بڑا اداس پھول ہوتا ہے
وہ صحراؤں میں اُگتا ہے اور اُسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ پھول شہروں میں بھی
اُگتا ہے۔ مگر یہاں اس کا داغ دل کی جلن کا نہیں، جسم کی بھوک کا آئینہ دار ہوتا
ہے۔ لالہ بھی ایک پھول تھی جس کے سینے پہ گہرے سیاہ رنگ کا داغ تھا اور آنکھوں
میں آنسو تھے اور پاؤں میں زنجیر تھی ـــ سلسلہ در سلسلہ گھر سے بازار اور بازار
سے گھر تک پھیلی ہوئی زنجیر! کبھی نہ کھلنے والی، کبھی نہ ٹوٹنے والی! منصور نے لالہ
کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"اب کیا ہوگا میری اچھی؟ اب ہم کیسے اکٹھے ہوں گے؟"

لالہ کا چہرہ ایک دم اداس ہو گیا۔ اس نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

"کاش تم میرے ابا جان سے رشتہ نہ مانگتے۔ تم مجھے گھر میں
زمین ہموار کرنے کا موقع تو دیتے۔ منصور! میں اپنے گھر والوں
کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ اب میرے
لئے بہت الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں!"

'مگر لالہ! میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں

تھا۔ تم ہی بتاؤ میں پھر کیا کرتا؟'

'تمہیں خاموشی سے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیئے تھا جب

ہمارے گھر میں میرے رشتے کی بات شروع ہوتی پھر تم دیکھتے

منصور میں کس دلیری سے اپنی محبت کی نمائندگی کرتی'

'اور اب ——؟'

'اب جو کچھ ہوا اسے ہمیں بھول جانا چاہیئے۔ اور خدا پر بھروسہ

رکھنا چاہیئے'

'لیکن لالہ! محض خدا پر بھروسہ کرنے سے کچھ نہیں ہوا کرتا'

'میں جانتی ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ میں اس وقت بھی اپنے

فیصلے منوا سکتی ہوں۔ آج بھی مجھ میں اتنی قوت ہے کہ گھر

والوں کو مجبور کر دوں کہ وہ میری شادی تم سے اور صرف تم

سے کریں'

منصور نے لالہ کو سینے سے لگا لیا۔

'تم نہیں جانتیں لالہ! وہ لوگ ایسا کبھی نہ ہونے دیں گے۔

انہیں یہ رشتہ کبھی منظور نہ ہوگا'

'میں انہیں مجبور کر دوں گی منصور!'

'وہ تمہیں بے بس کر دیں گے لالہ! وہ تمہاری آواز دبا دیں گے وہ تمہارا گلا دبا دیں گے۔ تم جوش میں آئے ہوئے باپ کا مقابلہ قائم نہیں کر سکتیں۔ وہ اپنی جھوٹی عزت اور جھوٹے وقار کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہے'

'تم یقین کرو منصور ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں بھرے بازار میں ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو جاؤں گی اور انسانیت کے نام پر اپنی محبت کا حق طلب کروں گی۔ میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ میں بہت کچھ کر جاؤں گی منصور! تم پریشان نہ ہونا۔ تم مطمئن رہنا۔ تمہاری لالہ تمہیں کبھی الگ نہ ہونے دے گی۔ وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ، تمہاری آغوش میں، تمہارے پہلو میں رہے گی۔ یہیں وہ زندہ رہ سکیگی اور یہیں اس کی موت ہوگی'

لالہ نے اپنا چہرہ منصور کے کالر میں چھپا دیا۔ منصور آہستہ سے بولا۔
'میرا دل نہیں مانتا لالہ! جانے کیا بات ہے مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آ رہا ہے۔ میں اس طوفان سے نہیں ڈرتا۔ مجھے صرف اس بات کا ڈر ہے کہیں کوئی لہر تمہیں مجھ سے دور نہ لے جائے۔ اسی لئے میں نے تمہیں کہا تھا کہ چلو یہاں سے بھاگ چلیں اور کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر

پر جا کر اپنا ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنائیں۔ میں دن بھر شاداب
چراگاہوں میں بھیڑیں چراؤں اور تم پشمینے کی چادریں بنو اور چمڑے
کے مشکیزے میں دودھ ڈال کر اسے زور زور سے گوندھ کر مکھن نکالو
اور جب میں شام کو آؤں تو تمہارے لئے چراگاہوں کی مہک اور
جنگلی شگوفوں کا تاج لاؤں اور پھر ہم موم بتی کی روشنی میں آتشدان
کے پاس بیٹھ کر ان لوگوں کی داستانیں دہرائیں جو تنگ و تاریک
گلیوں میں رہتے ہیں اور جن کے رنگ زرد ہوتے ہیں اور جو سانس
لیتے ہوئے ڈرتے ہیں اور ڈر ڈر کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو بے گناہ
لڑکیوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں اور ان کی محبتوں کی تجارت کرتے
ہیں۔ پھر ہم روشنی بجھا دیں اور دروازے کھڑکیاں کھول کر سو
جائیں اور وادی کی رات آہستہ آہستہ ڈھلتی جائے —— لالہ!
پھر ہم آزاد ہونگے۔ پھر ہمیں کسی کا خوف نہ ہوگا۔"
لالہ نے منصور کی گود میں سر رکھ دیا۔
"میرے منصور! ایسا نہ کہو —— خدا کے لئے مجھے اس راہ پر نہ
ڈالو جہاں میں دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ میں اپنا گھر کیسے چھوڑ دوں؟
لوگ کیا کہیں گے؟ میرا باپ تو زہر کھا لے گا۔ میرے بھائی یہاں سے
بھاگ جائیں گے اور پھر میری بہنوں کا کیا بنے گا؟ انہیں تو کوئی اپنے

پاس بھی نہ پھٹکنے دے گا۔ منصور! پھر اس خاندان کے سارے ستون گر پڑیں گے۔ سارے مینار مسمار ہو جائیں گے۔ یہ لوگ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ ہمیں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے'۔

'تو پھر یاد رکھو! تم میرے پاس کبھی نہ آ سکو گی۔ تمہارا باپ تمہیں میرے ساتھ، بنک کے ایک معمولی ملازم کے ساتھ کبھی نہ بیاہے گا۔ تم لاکھ چیختی رہو۔ تمہاری آواز کوئی نہ سنے گا۔ تمہاری فریادوں پر کوئی کان تک نہ دھرے گا اور تمہیں منصور سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا جائے گا ——'

لالہ منصور کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔

'نہیں نہیں منصور —— خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم دیکھ لینا ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ لالہ تمہاری ہے اور صرف تمہاری بن کر رہے گی۔ اسے اور کوئی اپنے گھر کی رانی نہ بنا سکیگا'۔

اچانک پاس ہی درختوں میں آہٹ سی ہوئی۔ لالہ تڑپ کر پرے ہٹ گئی منصور چوکنا ہو گیا۔ دونوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ انہوں نے سہمی سہمی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور آہٹ پر کان لگا دیئے۔ لیکن وہ آواز پھر سنائی نہ دی۔

'کوئی جانور ہوگا'، منصور نے سرگوشی میں کہا اور لالہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

لالہ کا دل خوف سے سمٹا جا رہا تھا۔ اس نے فضا میں خطرے کی بو سونگھ
۔ وہ پریشان نگاہوں سے اپنی کوٹھی کے روشندانوں کی طرف تک رہی
خود ڈھلتی رات کے مرطوب اندھیروں میں سو رہے تھے۔ معاً وہی آہٹ دوبارہ
دی اور وہ دونوں اٹھ کھڑے ہو گئے۔ منصور درختوں کی طرف بڑھنے لگا۔
لالہ نے اسے روک دیا۔ درختوں کے اندھیروں میں سے کوئی ان کی طرف آ رہا
لہ کا جسم پسینے میں تر بتر ہو گیا۔ جب وہ سایہ قریب آیا تو لالہ کی جان میں جان آئی۔
بھی اور از حد گھبرائی ہوئی تھی۔

'باجی خدا کے لئے اپنے کمرے میں چلو۔ جلدی چلو ابا جان کو پتہ چل گیا
ہے'

لالہ نے اپنے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے کی بتی ایک دم روشن ہوئی اور
بجھ گئی۔

'باجی خدا کے لئے جلدی چلو۔ ابا جان ادھر ہی آ رہے ہیں'

'انہیں کس نے بتا دیا؟'

'مجھے نہیں پتہ — وہ تمہیں ڈھونڈھ رہے ہیں'

لالہ بھی گھبرا گئی۔ اس نے انتہائی گھبراہٹ اور مایوسی میں منصور کو آخری
دیکھا اور جلدی سے ثریا کے ساتھ بھاگتی ہوئی درختوں میں گم ہو گئی۔
منصور نے اب وہاں ایک لمحہ بھی رکنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً دروازے

کے ادھ کھلے پٹ میں سے باہر سڑک پر آگیا اور فٹ پاتھ کے درختوں
ہوتا ہوا تیز تیز گھر کی طرف چلنے لگا۔ آسمان پر صبحِ کاذب کی نیلی نیلی
نمودار ہو چکی تھی اور ستارے ماند پڑنا شروع ہو گئے تھے۔

اسی دن صبح دفتر جانے سے پہلے منصور میرے پاس ٹی ہاؤس آیا اور اس نے مجھے رات کا سارا واقعہ سنایا۔ جب وہ دفتر جا چکا تو میں نے چائے منگوائی اور کاؤنٹر پہ بیٹھا پینے لگا۔ چائے پی کر میں نے سگریٹ سلگایا اور یونہی سیاہ رنگ کے بھدے سے ٹیلیفون کی طرف دیکھا جو محبت کی ایک رنگین داستان دہرانے کے بعد خاموش تھا — بالکل خاموش تھا! اچانک گھنٹی بجی۔ شاید لالہ نے فون کیا ہو۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"سیٹھ صاحب کو بول دو تو مارا اسپاری آگیا ہے"

میں نے پوچھا

"آپ نے کہاں فون کیا تھا؟"

"سیٹھ کلن بھائی بٹن بھائی سپاری والے کو"

"غلط نمبر ہے"

اور میں نے نا امیدی سے ریسیور رکھ دیا۔

اس تازہ حادثے کے بعد تو لالہ کے فون کی توقع ہی عبث تھی۔ بلکہ حالات زیادہ نازک صورت اختیار کر گئے تھے۔ شام کو منصور دفتر سے جلدی واپس آگیا۔ وہ بہت پریشان تھا اور بار بار اس بات پر زور دے رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح لالہ کے گھر سے اس کی خیریت کی خبر منگوائی جائے۔ ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں، تو اس کے قریب ضرور تھا۔ ہم میں سے کسی کے وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ٹی ہاؤس کے ملازموں میں سے کسی کو وہاں بھیجیں تو وہ کس کے پاس جائیں؟ وہاں جا کر کیا پوچھیں؟ علاوہ ازیں ہمارے سارے ملازم ابھی عمر کے تھے۔ اب تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ بڑے صبر سے لالہ کے خط کا انتظار کیا جائے۔

چنانچہ اس کے خط کا انتظار شروع ہو گیا۔ ایک دن، دو دن، تین دن، چار دن، ــــ ایک ہفتہ گذر گیا لالہ کی طرف سے کوئی خط نہ آیا۔ منصور کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا اور اکثر میرے پاس بیٹھا بھی گھنٹوں اپنے تفکرات میں گم رہتا۔ میں جان بوجھ کے لالہ کے بارے میں اس سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ مجھے علم تھا اسے اس ذکر سے دکھ پہنچتا ہے۔ تھوڑی بہت الجھن مجھے بھی تھی۔ آخر کیا وجہ تھی جو لالہ منصور کو خط بھی نہیں لکھ سکی۔ وہ کسی نئی

مصیبت میں گرفتار نہ ہو گئی ہو۔ کہیں اسے زبردستی — مجھے ان دونوں سے اس قدر ہمدردی تھی کہ میں ان کے متعلق کوئی ناخوشگوار بات ذہن میں لاتے ہوئے بھی گھبراتا تھا۔ میں منصور کو اداس اور پریشان دیکھتا تو میرے دل پہ چوٹ سی لگتی۔ مجھے بے اختیار بہار کے وہ مہکتے ہوئے روشن دن یاد آجاتے جب وہ دونوں گھنٹوں ٹیلی فون پر باتیں کیا کرتے تھے اور ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو مذاق کیا کرتے تھے کیا ہماری خوشیوں کی یہی قیمت ہے؟ کیا ان مسرتوں کا یہی انجام تھا؟ میں ان دونوں بیقرار روحوں کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا مگر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جب اس واقعے کو پورے گیارہ دن گذر گئے تو بارہویں روز منصور کے نام ایک خط موصول ہوا۔ خط بذریعہ ڈاک آیا تھا اور لفافے پر لکھائی کا انداز للّا کا نہ تھا۔ میں نے اسے اسی طرح سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔ شام کو منصور دفتر سے واپس آیا تو چائے منگوا کر میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں بھی کاؤنٹر چھوڑ کر اس کے ساتھ آن بیٹھا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ منصور آج قدرے خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس کے چہرے پر سے اداسیوں کے سائے ماند پڑ گئے تھے اور وہ باتیں کرتے ہوئے ذرا ذرا مسکرا رہا تھا اور ریپایوں میں بڑی دلچسپی سے جیبیں ڈال رہا تھا۔ مجھے اسے مسرور دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ خدا کرے کہ وہ اس تازہ زخم کو آہستہ آہستہ بھلا سکے اور یہ طوفان اس کے مکان کی دیواریں اکھیڑے بغیر ہی گذر جائے۔ وہ آج پائپ کی بجائے سگریٹ پی رہا تھا۔

"پائپ چھوڑ دیا؟"

اس نے سگریٹ کو آنکھوں کے آگے گھماتے ہوئے کہا۔

"چھوڑنا نہیں ملتوی کر دیا ہے"

اور یہ بات کہہ کے خود ہی ہنس پڑا۔ آج وہ واقعی بہت خوش تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی خوشیوں میں ایک اور خوشی کا اضافہ کر دیا جائے۔ میرے نزدیک باہر سے کسی دوست کا خط ملنا ایک بہت بڑی خوشی ہے۔ چنانچہ میں نے جیب سے خط نکال کر منصور کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ آج صبح آیا تھا"

منصور نے وہیں سے آنکھیں سکیڑ کر خط کو گھورا اور اتنا کہہ کر جلدی سے لفافہ چاک کر دیا۔

"لکھائی تو ثریا کی معلوم ہوتی ہے"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ خدا خیر کرے۔ ثریا نے خط کیوں لکھا؟ لالہ کہاں تھی؟ اور پھر لفافے پر تو مہر کراچی کی تھی۔ کیا وہ لوگ کراچی چلے گئے تھے؟ میں نے پیالہ میز پر رکھ کر سگریٹ سلگایا اور بڑے غور سے منصور کے چہرے پر اس خط کا عکس دیکھنے لگا۔ منصور کے چہرے پر سوائے اس کے اور کوئی تغیر نہ ہوا کہ وہ شگفتگی جو تھوڑی دیر سے وہاں چمک رہی تھی، بجھ گئی۔ اس نے خط پڑھ کر میری طرف کر دیا اور بولا۔

"آپ بھی پڑھ لیجئے۔ میں اتنی دیر میں سگریٹ لے آؤں"

اگر مجھے تھوڑا سا بھی علم ہوتا کہ خط میں کیا لکھا ہے تو میں منصور کو اس وقت کبھی باہر نہ

نے دیتا۔ میرا خیال تھا کہ ثریا نے یہی لکھا ہوگا کہ لالہ بیمار رہی ہے اور ہم اسے کراچی لے
ئے ہیں یا اسی قسم کی کوئی اور بات۔ میں نے منصور کو باہر جانے سے بالکل نہ روکا
ر خود خط کھول کر پڑھنے لگا، جو اس طرح شروع ہوتا تھا

پیارے بھائی جان!

اس روز ابا جان کو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ جب آپ واپس گئے تو
م گھبراہٹ میں عقبی دروازے کو چٹخنی لگانا بھول گئیں۔ کھلے دروازے نے سارا
از طشت از بام کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے سارے بھائی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں
نے لالہ کو کمرے میں بند کر کے اسے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئی اور اس نے صاف
صاف کہہ دیا کہ وہ آپ سے ملی تھی اور وہ صرف آپ سے ہی شادی کرے گی۔ دوسرے
روز ابا جان ہمیں لے کر کراچی آ گئے اور یہاں کل ایک مقامی بیرسٹر کے لڑکے سے
لالہ کی شادی کر دی گئی ہے۔ بھائی جان لالہ رو رو کر ہلکان ہو گئی ہے۔ اس کا برا
حال ہو گیا ہے۔ وہ ضرور مر جائے گی۔ اگر وہ مر گئی تو پھر میں بھی مر جاؤں گی۔ پھر میں
بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ کاش! آپ اس روز نہ ملنے آتے۔ میں نے لالہ سے کہا
کہ میں بھائی جان کو خط لکھنے لگی ہوں تم بھی کچھ لکھ دو۔ اس نے روتے ہوئے کہا کہ
"اب کیا باقی رہ گیا ہے؟" بھائی جان لالہ مجبور تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر
اس کی شادی کر دی گئی ہے۔ کوئی مہندی کی رسم ادا نہیں ہوئی، کوئی شہنائیاں
نہیں بجیں۔ یہ شادی نہیں تھی بلکہ لالہ کا جنازہ گھر سے نکلا تھا۔ آپ اسے معاف

کر دیں - آپ مجھے معاف کر دیں - اور خدا کے لئے یہ خط فوراً جلا دیں - اور اس کا
جواب نیچے لکھے ہوئے پتے پر ضرور بضرور دیں - آپ پریشان نہ ہوں - خدا کو
یہی منظور تھا -

آپ کی اداس بہن

ثریا بانو

خط پڑھ کر ایک لمحے کے لئے میرا ذہن ماؤف ہو گیا - میں جیسے سکتے میں آ گیا -
مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خط میں جو کچھ لکھا تھا ایسا ہوا ہو - میرے ذہن میں کہیں
فون کی گھنٹی چیخ رہی تھی اور کہیں لالہ کی آواز آ رہی تھی "ہیلو ! ہیلو ! ذرا منصور بھائی
کو بلا دیجئے" مگر منصور کہاں تھا ؟ میں خط جیب میں ڈال کر جلدی سے باہر نکلا - سڑک
پر سینکڑوں آدمی ادھر ادھر رواں تھے - میں نے پان والے سے پوچھا - اس نے بتایا
کہ منصور تھوڑی دیر ہوئی وہاں سے گذرا تھا - وہ کہاں گیا ہو گا ؟ اس کا پتہ کرنا چاہیئے -
میں نے کاؤنٹر پہ اپنے بھائی کو بٹھایا اور خود سائیکل پکڑ سارے شہر کا چکر لگا دیا مگر
منصور کا کہیں پتہ نہ چلا - رات کو اس کے گھر گیا - وہ گھر پر بھی نہیں پہنچا تھا - صوفی
ہوٹل پہنچا - پتہ چلا کہ اس روز کے بعد وہ وہاں بھی نہیں گیا - رات گذر گئی - میں صبح
اٹھتے ہی منصور کے گھر گیا - اس کی والدہ بے حد پریشان تھی - میں نے انہیں ایک
بار تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ یہیں کہیں کسی دوست کے گھر سو گیا ہو گا - انہیں فکر
نہ کرنا چاہیے -

ایک ہفتہ گذر گیا منصور کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس دوران میں اس کے بڑے بھائی
بھی کئی بار ٹی ہاؤس آئے۔ انہوں نے مجھ سے تمام حالات دریافت کئے اور اپنے
جذباتی بھائی کی تلاش شروع کر دی۔ میں نے ثریا کو لکھ دیا کہ منصور کہیں باہر چلا گیا ہے
اور اسے لالہ کی شادی کا انتہائی صدمہ ہوا ہے۔ اس سے زیادہ لکھنے کا مجھے حوصلہ
نہ ہوا۔ پندرہ دن بعد ثریا کا ایک اور خط آیا جس کے ساتھ منصور کے لالہ کے نام
لکھے ہوئے محبت ناموں کا پارسل بھی تھا۔ ثریا نے لکھا تھا کہ میں لالہ سے یہ خطوط
حاصل کر کے آپ کو بھجوا رہی ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک اب یہ بے کار ہیں اور خطرہ
ہے کہ کہیں یہ لالہ کی موجودہ زندگی بھی تباہ نہ کر دیں۔ میں نے پارسل وصول کر کے رکھ
لیا اور گھر جا کر خطوں کو اپنے ذاتی بکس میں بند کر کے قفل لگا دیا۔ جب کمرے سے باہر
نکلنے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے منصور کو قبر میں دفنا کر آ رہا ہوں۔ میرے بدن میں سنسنی سی
دوڑ گئی اور میں سر جھٹک کر واپس ٹی ہاؤس آگیا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ منصور کی مجھے کوئی خبر نہ مل سکی۔ اس دوران میں اس کا بڑا بھائی
مجھے دو ایک بار ملا اور اپنی تلاش بے سود کی روداد سنا کر واپس چلا گیا۔ دفتر میں دو
ماہ کی رخصت کی درخواست بھجوا دی گئی تھی۔ وقت کا چکر گھومتا رہا۔ زندگی منصور اور
لالہ کے المناک واقعات سے بے نیاز آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ ایک دن صبح صبح میں
ابھی ٹی ہاؤس کھول کر کاؤنٹر پہ بیٹھا حساب کتاب کی کاپیاں ٹھیک کر رہا تھا کہ منصور
کا چھوٹا بھائی دروازے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھا جس کے

گرد زرد رنگ کا کاغذ لپٹا تھا۔ میرے پاس آ کر اس نے مجھے سلام کیا اور پیکٹ میز پر رکھ کر جیب سے ایک خط نکال کر دیا۔

'کس کا خط ہے؟'

'رات بھائی جان گھر آئے ہوئے تھے۔ یہ انہوں نے دیا ہے۔'

'منصور آیا ہوا تھا؟'

'جی ہاں'

میں نے جلدی سے پوچھا

'اب کہاں ہیں؟'

لڑکے نے کہا

'وہ چلے گئے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ یہ پیکٹ کلیم صاحب کو پہنچا دیا جائے۔'

'کہاں گئے ہیں؟'

'یہ انہوں نے نہیں بتایا'

میں نے لفافہ چاک کر کے خط کھولا۔ خط کافی لمبا تھا اور ثریا کے نام تھا میں نے خط جیب میں رکھ لیا اور منصور کے بھائی کے لیے چائے منگوائی۔

'انہوں نے کچھ نہیں بتایا کہ وہ اتنی دیر کہاں رہے اور اب کہاں جا رہے ہیں؟'

'صرف اتنا کہا تھا کہ میں ٹلیاں کے قریب کسی دیہات میں اپنے دوست کے پاس ہوں'

'اس دیہات کا نام کیا ہے؟'

'یہ انہوں نے مجھے نہیں بتایا'

'انہوں نے کپڑے کیسے پہن رکھے تھے'

'قمیض اور پتلون تھی'

'وہ یونہی گھر آئے تھے یا کسی کام کے لئے'

'وہ ستار ساتھ لے گئے ہیں'

میں خاموش ہو گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لڑکا اٹھ کر واپس چلا گیا تو میں نے پیکٹ کھولا۔ یہ تمام خطوط تھے۔ لالہ کے خطوط — جو اس نے محبت کے پرجوش دور میں منصور کو لکھے تھے۔ منصور نے انہیں بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ان خطوط کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پرزہ میرے نام بھی تھا۔

کلیم صاحب!

وہ پھول بھیج رہا ہوں جنہیں بہار میرے پاس چھوڑ گئی ہے۔ ان کی شگفتگی گرم آنسوؤں کی محتاج ہے اور آنسوؤں کا ذخیرہ میں ختم کر چکا ہوں۔ میں پت جھڑ کے ویرانوں میں ہوں اور یہ بہار کی نشانیاں ہیں۔ میرے ساتھ رہ کر یہ نشانیاں مرجھا جائیں گی آپ ان خطوں کو اپنے پاس رکھیں اور اگر نہ رکھ سکیں تو ان پر گلاب کا عرق اور موتئے کے پھول چھڑک کر شعلوں کے سپرد کر دیں، اور ان کی راکھ کسی تنہا مقام پر دفن کر کے اوپر نرگس کے بیج بکھیر دیں۔ میں انہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ یہ مجھے طلوع آفتاب کی یاد دلاتے ہیں اور میرے کندھوں پر شام کے سائے جھک آئے

ہیں۔ یہ مجھے پہاڑی جھرنوں اور ٹھنڈے چشموں کے گیت سناتے ہیں اور میں پنڈلیوں تک ریت میں دھنسا بنجر صحراؤں میں سفر کر رہا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے ان خطوں، ان چشموں سے، ان جھرنوں اور ان سلگتی بہاروں سے بچائیے۔ یہ گیت مجھے گونگا اور بہرہ کر دیں گے، یہ چشمے مجھے پیاسا مار دیں گے۔ ثریا کے نام اپنا آخری خط بھیج رہا ہوں۔ آپ کے پاس اس کا پتہ موجود ہے۔ میرا خط اس تک پہنچا دیجئے گا۔

آپ کا

منصور'

رات کو گھر پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ منصور کے بھجوائے ہوئے خطوط کا پیکیٹ بھی لالہ کے خطوں کے ساتھ ہی اپنے بکس میں بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے ٹیبل لیمپ جلایا اور منصور کا وہ آخری خط پڑھنے لگا جو اس نے لالہ کی چھوٹی بہن ثریا کے نام لکھا تھا۔ وہ خط یہ تھا۔

'ثریا بہن!'

شائد اس کے بعد تمہیں مخاطب کرنے کا مجھے موقعہ نہ ملے اس لئے آج بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں صرف میری باتیں ہیں۔ تمہیں صرف اتنی تکلیف دوں گا کہ تم خاموشی سے سنتی جاؤ۔ بیچ میں بولنا مت، مجھے ٹوکنا مت، کوئی بات یاد نہ دلانا۔ ورنہ میں بھول جاؤں گا، بھٹک جاؤں گا اور تمہیں اپنے دل و دماغ کے ان حصوں کی سیر نہ کرا سکوں گا جہاں میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ آؤ۔ یہاں تمہیں گلاب

کی جھاڑیوں کی بجائے خاردار سرکنڈے اور مرمریں بارہ دریوں کی جگہ دھول اڑاتے کھنڈرات
کا سلسلہ دکھائی دے گا۔ لیکن ابھی بہن گھبرانا مت انہیں خاردار سرکنڈوں میں تمہیں وہ کلیاں بھی
نظر آئیں گی جنہیں سنگار کے وقت محبوب دلھنوں کے بالوں میں پرویا جاتا ہے اور انہی ویران
کھنڈرات میں تمہیں سنگِ سرخ کے وہ چبوترے بھی ملیں گے جہاں بیٹھ کر مصر و یونان کی شہزادیاں
طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھا کرتی تھیں۔ تم ڈاونچی کو اپنے مکان کی چار دیواری میں مونالیزا پینٹ
کرتے دیکھو گی۔ تم ہیلن آف ٹرائے کو سپارٹا کے قلعے میں بے چینی سے ٹہلتے پاؤ گی۔ تم دیکھو گی
کہ نمرود تخت کے کنگروں پر ہاتھ رکھے اپنے خدا ہونے کا اعلان کر رہا ہے اور سقراط زہر
کا پیالہ پی رہا ہے۔ ایتھنز کے دیوان خانوں میں تمہیں جواں سال فلسفی جمہوریت کے
اصولوں پر بحث کرتے نظر آئیں گے اور انہی دیوان خانوں کے عقب میں تمہیں وہ
زرخرید غلام بھی ملیں گے جو ان فلسفیوں کے لئے کھیتوں میں کام کر رہے ہوں گے۔ تم میرے
ساتھ رہنا۔ تمہیں آج بہت سی تصویریں دکھاؤں گا۔ یہ تصویریں تم نے اس سے پہلے کہیں
نہ دیکھی ہوں گی۔

میں اس خط میں تم سے لالہ کی کوئی بات نہیں کروں گا۔ میں اس البم میں تمہیں لالہ کی
کوئی تصویر نہیں دکھاؤں گا اور اس ربط پر اس محبت کا کوئی گیت نہیں گاؤں گا جو ٹیلیفون
پر شروع ہو کر خطوں پر ختم ہو گئی۔ جس نے ہوا کی لہروں میں جنم لیا اور جھوٹے الفاظ کی چار
دیواری میں دم توڑ دیا۔ میں لالہ کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تمہاری باجی کے متعلق
کوئی بات نہیں کروں گا۔ اس نے تمہیں ٹھیک کہا تھا کہ منصور کو لکھنے کے لئے اب

اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا لیکن میں صرف ایک بات اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ منصور کے متعلق اس نے کبھی لکھا ہی کیا تھا؟ وہ تو منصور کو سامنے بٹھلا کر اپنی اس محبت سے ہمکلام تھی جو اس نے کسی سے نہیں کی۔ مگر میں پرانی باتیں دہراؤں گا نہیں، بلکہ محض ان قبروں کے کتبے پڑھتا جاؤں گا جہاں میری زندگی کے خوبصورت لمحے دفن ہیں۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں، کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ آج میں ان پڑھ عالموں اور پڑھے لکھے جاہلوں سے بہت دور کھیتوں میں بیج بکھیرنے والے اور ڈاچیوں پر سوار ہو کر سفر کرنے والے سادہ لوح انسانوں کے درمیان آگیا ہوں۔ یہ لوگ مجھ سے کبھی نٹشے پر بحث نہیں کرتے۔ لیکن ان کا اخلاق فریڈرک نٹشے کے اخلاق سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی کسی کو محبت بھرے طویل خط نہیں لکھتا مگر ان میں سے ہر ایک کے سینے میں محبت کا اوقیانوس ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ انہوں نے شیکسپیئر نہیں پڑھا لیکن ان کے اندر ہوریشو کا خلوص اور رومیو کا ایثار موجود ہے۔ انہوں نے کبھی وان گو کا نام نہیں سنا مگر ان کے ہلوں کے تیز پھل چلچلاتی دوپہروں میں زمین پر جو تصویریں بناتے ہیں، جو لکیریں کھینچتے ہیں وہ مجھے وان گو کے شہکارون کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ تصویریں دنیا کی مشہور آرٹ گیلریوں سے دور سہی مگر زندگی کے بہت قریب ہیں، زمین کے بہت قریب ہیں۔ یہ وہ لکیریں ہیں جو پتھروں پر کھنچی جاتی ہیں اور یہ وہ الفاظ ہیں جو مذہبی کتابوں میں لکھے جاتے ہیں۔ ان کی سچائی اور عظمت پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔

میں جب ان سے ملا تو یہ کھیتوں میں کام کر رہے تھے اور ان کے تانبے ایسے مضبوط جسم

پسینے میں شرابور تھے۔ انہوں نے کام چھوڑ دیا اور مجھے خندہ پیشانی سے ملے۔ وہ
میرے لیے مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ لائے۔ مہربان چہروں والی نیک دل عورتوں اور
حیا آلود آنکھوں والی کنواری دہقان زادیوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور مجھ
سے پوچھنے لگیں کہ میں کون ہوں اور جہاں سے آیا ہوں وہ شہر کیسا ہے؟ انہوں نے شیشم کی
چھاؤں میں دفن مٹکے میں سے ٹھنڈی لسی کا پیالہ بھر کر میرے پاس رکھ دیا اور میں نے انہیں
بتایا کہ میں لوہے اور پتھر کی عمارتوں والے شہر سے آیا ہوں اور ان دوستوں سے بچھڑ کر آ رہا
ہوں جنہوں نے میرے قہقہوں پر آنسو بہائے اور میرے آنسوؤں پر قہقہے لگائے۔ جنہوں
نے ہر گلی، ہر چوک، ہر بازار میں کھڑے ہو کر میرا انتظار کیا اور جب میں وہاں سے گذرا تو انہوں
نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کو کہا: دیکھو وہ جا رہا ہے جس نے محبت کی اور پتھر کھائے، سونا
دیا اور ریت وصول کی، جو ہم سے نہیں بولتا، جو ہم سے دور دور پھرتا ہے۔ — ہاں
میری پیاری ماؤ اور بہنو! میں ایسے ہی ہمدرد دوستوں کو کھو کر آ رہا ہوں۔ مجھے ان سے بچھڑنے
کا صدمہ ہے۔ اب وہ چوک میں پتھر جمع کیے کس کا انتظار کریں گے؟ اب وہ کس کے آنسوؤں
پر قہقہے لگائیں گے؟ مجھے ان سے ان کے پتھروں اور ان کے قہقہوں سے ہمدردی ہے۔
مجھے ان پر رحم آتا ہے۔

دیہاتی عورتوں نے مجھے محبت سے پیار کیا۔ باحیا کنواریوں نے شفاف آنکھیں جھپکا
جھپکا کر مجھے تعجب سے دیکھا اور پھر مسکرانے لگیں اور میرے ارد گرد کھیتوں میں دور دور
تک سرسوں کے بسنتی پھول جھومنے لگے اور رہٹ کے گرد گھومنے والے بیلوں کے قدم

تیز ہو گئے اور ٹھنڈا میٹھا چمکیلا پانی اچھل اچھل کر کھیتوں میں گرنے لگا۔ شام ہوئی تو برگد کے پرانے درخت تلے خشک جھاڑیوں والا الاؤ روشن ہو گیا اور بھولے بھالے گندمی چہروں والی دوشیزاؤں نے اپنے مکھن لگے چمکیلے بال کھول دیئے اور ہاتھوں میں ہاتھ دے کر جھومر ڈالنے لگیں۔ ان کے خاک آلود پاکیزہ پاؤں تھرک تھرک کر ایک ساتھ اٹھتے، ہلکے پھلکے بدن کمان کی طرح جھک جاتے اور چہرے مسرت اور حیا سے سرخ ہو جاتے۔ ان کے سیاہ لہنگے اور کھلی قمیضوں کے دامن ہوا میں لہرا رہے تھے اور الاؤ کے شعلوں کا عکس ان کے گندمی چہروں پر رقص کر رہا تھا۔ وہ خود بھی الاؤ کے شعلے تھیں۔ ایک پاؤں پر اچھلتی ہوئیں وہ نصف دائرے کی شکل میں تالی پیٹتے آگے کو جھکتیں اور پھر ایک دم اوپر کو اٹھ آتیں۔ ان کی باریک آوازوں کا آہنگ شعلے کی طرح درمیان میں لہرا رہا تھا۔ وہ گا رہی تھیں اور ان کے چہروں پہ دھرتی کا عزم اور آسمان کی چمک تھی۔

گلّی گلّی بنّی نی سمّیے
بیر سنبھل سنبھل کے دھریے

میں واری سمّیے

اُچّی اُچّی ماڑی وے ڈھولا
سنبھل سنبھل چڑھیے وے ڈھولا

میں واری سمّیے

گیلی منڈھیر پہ سمّی بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتی ہے۔ مبادا وہ گر پڑے اور چکنا چور

ہو جائے۔ سسی دیہاتی پنجاب کی دیوی سائیکی ہے۔ وہ جانوروں کے لئے پٹھے کترتی ہے
وہ دودھ دوہتی ہے اور کٹی ہوئی فصل کے گٹھے تیار کرتی ہے اور کپاس چنتی ہے اور چرخے پر
سوت کاتتی ہے۔ وہ نہر کنارے بیٹھ کر کپڑوں کا انبار دھوتی ہے اور پانی کے بڑے بڑے مٹکے
ڈھوتی ہے۔ وہ کیچڑ میں دھنس کر دھان کی پنیری بوتی ہے اور آستینیں اوپر چڑھا کر شام
ہونے تک مونجھ کوٹتی ہے۔ وہ گھڑے پر لیٹ کر چناب عبور کر کے مہینوال سے ملنے جاتی ہے
اور رانجھے کو بے یار و مددگار چھوڑ کر ڈولی میں سوار ہو جاتی ہے۔ وہ پنوں کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی
مر جاتی ہے اور مرزا کی کمان درخت پر لٹکا کر اسے اپنے بھائیوں سے مروا ڈالتی ہے اور
اس کی خون آلود لاش پکارتی رہ جاتی ہے۔

میں بنا بھرا واں ماریا
میری ننگی ہو گئی گنڈ
لیے دل دیاں دل وچ رہ گیاں
میں کس دا کراں گھمنڈ

وہ خون سے محبت کرتی ہے۔ اس کی محبت کا رنگ سرخ ہے۔ گہرا سرخ — کھولتے
اور ابلتے ہو خون کا رنگ۔ اس کی محبت نیچر کی محبت اور اس کا خلوص فطرت کا خلوص ہے۔
وہ اگر ماں کے سینے میں میٹھا دودھ ڈالتی ہے تو داغدار سانپ کو مہلک زہر عطا کرتی ہے۔
یہی خونخوار چیتے کو بھیڑوں کے گلے میں روانہ کرتی ہے اور چیدا ہے کے ہاتھوں میں بندوق
دیتی ہے۔ مور کے پروں پر یہی نقش و نگار بناتی ہے اور شاہی محلات اسی کی بدولت ویران

کھنڈرات میں تبدیل ہوتے ہیں۔ وہ پنڈورا بھی ہے اور مریم بھی، وہ بھڑکتا شعلہ بھی ہے اور گرتی آبشار بھی، وہ تلوار کی دھار بھی ہے اور کنول پھول کی پتی بھی۔ اس کی رگوں میں ہارلکس اور اولٹین نہیں۔ زندگی کا خون دوڑتا ہے۔

میری اچھی بہن! یہ محبت جس نے مجھے اپنی چادر میں لپیٹ لیا ہے ہر دستر خوان پر نہیں چنی جاتی۔ اس کا پھل ہر موسم میں درختوں پر نہیں لگتا اور اس کی روشنی ہر آنکھ کے لئے نہیں ہے۔ اس کا بیج دل کی گہرائیوں میں پھوٹتا ہے اور وہیں اس کی آبیاری ہوتی ہے اور وہیں پروان چڑھتا ہے۔ تم اور تمہارے بھائی اس پھول کی خوشبو اور اس کی چمک برداشت نہیں کر سکتے۔ تمہیں اس آفتاب کو دیکھنے کے لئے آنکھوں پر پٹی باندھنی پڑے گی اور اس نغمۂ بے باک کو سننے کے لئے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا پڑیں گی۔ تمہارے لئے تمہاری باجی کی محبت بڑی موزوں ہے۔ تھوڑا سا وقت ہنس کھیل کر گذار دیا اور آخر میں دو آنسو بہا کر رخصت ہو گئے۔ یہ محبت رومانٹک بھی ہے اور زود ہضم بھی۔ اس سے معدہ ٹھیک رہتا ہے۔ کافی اور ہارلکس پینے والے معدے کو ہم دیہاتیوں کی محبت راس نہیں آ سکتی۔ تمہاری محبت قسمیں کھاتی ہے اور ہماری محبت زخم کھاتی ہے۔ تمہاری محبت تاریک مکانوں سے شروع ہو کر بیڈ روم میں پہنچ کر مر جاتی ہے اور ہماری محبت شیشم کے سایوں میں پیدا ہوتی ہے اور برچھیوں کے سائے میں ہلاک ہو جاتی ہے۔ تم لوگ الفاظ سے عشق کرتے ہو اور ہم مفہوم سے۔ تم اپنے سائے کا تعاقب کرتے ہو اور ہم روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ تم محبت کرتے وقت اپنے تیز پنجے سموری کھال میں چھپا لیتے ہو۔ تم

جس سے محبت کرتے ہو اسی کا مذاق اڑاتے ہو، تم جس چشمے کا پانی پیتے ہو وہیں اپنے
گندے پاؤں دھوتے ہو اور تم صبح جس کے سر پہ موتیوں کا تاج رکھتے ہو شام اسی کے گلے میں
لیتروں کا ہار ڈالتے ہو۔ تم گندے جوہڑوں میں رینگنے والے کیڑے ہو، تم مردہ لاشوں
میں گڑے ہوئے غلیظ ناخن ہو اور تم شمشانوں سے اٹھنے والی منحوس آوازیں ہو۔ لیکن
میں تمہاری باجی کے متعلق کچھ نہ کہوں گا اور نہ تمہاری معصومیت پہ انگلی اٹھاؤں گا۔
میرے مخاطب صرف وہ لوگ ہیں جنہیں تم نہیں جانتیں مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں۔
تمہاری باجی کو کہنے کے لئے میرے پاس بہت کچھ ہے لیکن میں اسے کچھ نہیں
کہوں گا۔ اس نے میرے قلم سے پھول جھڑتے دیکھے ہیں، وہ شعلے ٹوٹتے نہ دیکھ سکیگی۔
اس نے ستار پہ انگلیاں چلتی دیکھی ہیں، وہ نیزوں میں پروئے ہوئے سر نہ دیکھ
سکے گی۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ میں اس کی برائی نہیں چاہتا۔ میں اس کی برائی
کبھی نہیں چاہوں گا۔ اگر کبھی وہ تم سے میری بات کرے تو اسے کہنا کہ منصور نے خودکشی
نہیں کی۔ وہ زندہ ہے اور پہلے سے بڑھ چڑھ کر زندہ ہے۔ اسے کہنا کہ تمہاری محبت
کے صدمے نے اس کے پاؤں میں غم کی زنجیر نہیں ڈالی بلکہ آنکھوں پہ سے جہالت کی
پٹی اتار دی ہے۔ اور وہ تمہارا شکر گذار ہے۔

میں تمہارے فرعونوں کا مصر چھوڑ کر اشوری قافلوں کے ساتھ دجلہ اور فرات
کی وادی میں آ گیا ہوں۔ میں فنیقی جانبازوں کے ساتھ اپنے برق رفتار رتھوں کے
نیچے دشمنوں کی لاشیں کچل رہا ہوں۔ میں نینوا کے کتب خانوں کو آگ کے شعلوں میں

پھنکوا رہا ہوں - اور میں فرات اور شام کے درمیانی صحراؤں میں رہنے والے گلہ بانوں
کے پاس بیٹھا ستاروں اور زمین کا علم سیکھ رہا ہوں - میں کنعان کے بازاروں میں خوبصورت
پیغمبر زادے کو ایک اٹی کے عوض فروخت ہوتے دیکھ رہا ہوں - میں بنی اسرائیل کے قیدی
نوجوانوں کو بابل کے قید خانوں میں اپنے وطن کی یاد میں سوگوار گیت گاتے سن رہا ہوں -

ــــ ہم بابل کے دریاؤں پر بیٹھ کر صیہون کو یاد کر کے روتے ہیں
ہم نے اپنے بربط بید کے درختوں پر لٹکا دیے ہیں
اے یروشلم کی زمین اگر ہم تجھے بھول جائیں تو ہمارے ہاتھ ہمیں
بھول جائیں ــــ

میں گنگا اور جمنا کے طاسین میں بھائی کو بھائی کے ساتھ برسرِ پیکار دیکھ رہا ہوں -
میں بندرابن کے جنگلوں میں کرشن کو بنسری پر ہمہ گیر محبت کے گیت الاپتے سن رہا
ہوں - میں ایتھنز کی عدالت میں بیٹھا ہوں اور سقراط اپنی آخری تقریر کر رہا ہے - میں
سیزر کی پشت میں بروٹس کا خنجر اور قلوپطرہ کے سینے پر نیل کے سانپ کا زہر دیکھ رہا
ہوں - میرے کانوں میں فلسطین کے پرنور چہرے والے گڈریے کی آواز آ رہی ہے -

مبارک ہیں وہ لوگ جن میں صداقت کی تڑپ ہے کیونکہ وہی آسودہ
ہوں گے - مبارک ہیں وہ لوگ جو غمگین ہیں کیونکہ وہی سکون پائینگے -
مبارک ہیں وہ لوگ جو رحم دل ہیں کیونکہ انہی پر رحم کیا جائے گا اور
مبارک ہیں وہ لوگ جو سچائی پر ہیں اور ستائے جاتے ہیں کیونکہ آسمان

کی بادشاہت انہی سے قائم ہے۔"

میں مقدس بدھ کو سنگِ مرمر کے چبوترے پر ہزاروں لوگوں کے مجمع میں نرم

اور میٹھی زبان سے یہ کہتے سن رہا ہوں۔

"زمین خوبصورت ہے میرے بھائیو! اس کی پیداوار سے محبت کرو۔

اپنی کمزوریوں کو ایک سنہری سیڑھی بناؤ۔ اور اس کے ذریعے سنہری

حقائق تک پہنچو۔

اس طرح تم زیادہ روشن بلندیوں تک پہنچ جاؤ گے۔"

اور پھر مجھے ایک اور آواز سنائی دیتی ہے۔ جس میں چٹانوں کی مضبوطی اور

صبح کی ہوا الیسی لطافت ہے۔ یہ آواز عرب کے تاریک اُفق پر سچائی اور محبت کا

آفتاب بن کر طلوع ہوتی ہے۔

"تحقیق کہ برائی سے برائی پیدا ہوتی ہے اور نیکی سے نیکی۔ اندھیرے

سے اندھیرا اور روشنی سے روشنی ——

اے لوگو! میں تمہیں نیکی اور روشنی کی خوشخبری دیتا ہوں ——"

ابھی لڑکی! میں تمہیں ان لوگوں سے ملا رہا ہوں جنہوں نے اس وقت لوگوں کو

پھول دیئے جب ان کے راستوں میں کانٹے بچھائے گئے۔ جنہوں نے بھیانک

اندھیروں میں بیٹھ کر روشنیوں کے مینار تعمیر کئے اور گرم صحراؤں میں پھوٹنے والے

ٹھنڈے اور شیریں چشموں کا سراغ لگایا۔ میں اکیلا ہوں لیکن میری تنہائی تمہاری

محفلوں سے زیادہ روشن اور زندگی خیز ہے۔ اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں اور رخصتی کے اس اداس لمحے میں بھی تمہاری باجی کو کچھ نہیں کہوں گا۔ اچھا ہوا وہ میرے پاس نہ آسکی۔ میرے گھر میں بجھا ہوا لیمپ تھا اور تمہاری باجی اندھیرے سے ڈرتی ہے مجھے ان باتوں —— ان چھوٹے چھوٹے لڑائی جھگڑوں کا خیال آرہا ہے جو ہم ٹیلی فون پر کیا کرتے تھے۔ وہ دن جب بھی یاد آئیں گے مجھے ان راستوں کی یاد دلائیں گے جہاں سے کبھی میں اپنی محبت کے پہلو میں سنہری رتھ پر بیٹھا شاہزادوں کی طرح گذرا تھا لیکن اب جہاں خاک اڑتی ہے اور صرف خاک اڑتی ہے۔

لالہ رخ کی چھوٹی بہن! میں ان یادوں کو اپنے سینے میں دفن کر لوں گا میں ان پرانے قالینوں کو اپنی اداس شہ نشینوں پر بچھا کر تمام کھڑکیاں بند کر دوں گا اور کسی سے کوئی بات نہ کروں گا۔ میں اب تم سے کبھی تمہاری باجی کا ذکر نہ کروں گا میں اب کبھی تمہارے آم اور انگور نہ چراؤں گا۔ اور میں کبھی تمہیں وہ دن یاد نہ دلاؤں گا۔ جب ہم سب ایک جگہ بیٹھ کر اکٹھے ہنسا کرتے تھے، گایا کرتے تھے اور بچوں ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔ دریا پر پہنچ کر ہم کبھی اس چشمے کو یاد نہ کریں گے جس نے راہ میں ہماری پیاس بجھائی تھی اور روشنیوں میں آکر ہم اس دیئے کو بھلا دیں گے جس نے تاریک گھاٹیوں میں ہمیں راہ دکھائی تھی۔ اپنی باجی سے ایک بات —— صرف ایک بات ضرور کہنا۔ اسے کہنا محبت سبھی کرتے ہیں لیکن قربانی ہر کوئی نہیں دیا کرتا۔ محبت اپنی قربان گاہ پر پہنچ کر

ذاتِ الٰہی سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے تاروں کو چمک، سورج کو روشنی اور کلیوں کو مہک عطا ہوتی ہے۔ اسے کہنا لارنس میں گھاس، پتوں اور درختوں کے درمیان ہنس کھیل کر گذارے ہوئے دن بھول جائے۔ قافلہ گذر چکا ہے۔ آگ بجھ گئی ہے۔ اب راکھ کریدنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس راکھ میں یادوں کے بجھے ہوئے انگاروں کے سوا اسے اور کچھ نہ ملے گا۔

اور شاید اب راکھ کریدنے کی اسے ضرورت بھی نہیں۔

منصور،

یہ کہانی یہاں ختم ہوتی ہے۔

منصور کے اس آخری خط کو ملے آج چوتھا سال گذر رہا ہے۔ اس کے بعد میں اسے کہیں نہیں مل سکا۔ اس کی طرف سے بھی کوئی خط نہیں آیا۔ لالہ سے بھی پھر ملاقات نہیں ہو سکی۔ انہی دنوں ثریا کا ایک خط آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ لالہ اپنے خاوند کے ساتھ جنوبی افریقہ چلی گئی ہے اور وہ لوگ وہیں آباد ہو گئے ہیں۔ پھر اس کا بھی کوئی خط نہیں آیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ہوائی قالین پر بیٹھا خوبصورت دودھیا گنبدوں اور نیلے میناروں والے بغداد کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی ہے اور اب نہ وہ قالین ہے، نہ گنبد اور نہ مینار —— زندگی اپنے بے رنگ تسلسل کے ساتھ پھر اسی طرح رواں ہے۔ ٹی ہاؤس میں اسی طرح گاہک آتے ہیں

اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلے جاتے ہیں۔ بس اسی طرح صبح اٹھتا ہوں۔ ٹی ہاؤس کھولتا ہوں۔ نو بجے سے دو بجے تک کام کرتا ہوں اور ایک دو گھنٹے آرام کے بعد پھر کاؤنٹر پر آن حاضر ہوتا ہوں اور رات گیارہ بارہ بجے تک اونگھتا رہتا ہوں۔ فکر مند کلرک، پریشان چہروں والے میزبان، گردنیں اکڑا کر بیٹھنے والے تھانیدار، بلو پر خوبصورتی سے دستخط کرنے والے شاعر، نقاد، ادیب، مصور، موسیقار — سبھی آتے ہیں۔ بالکل پہلے کی طرح آتے ہیں۔ ان کی یک رنگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ادھیڑ عمر کا مضبوط جسم والا ٹھیکیدار اسی طرح اپنے ساتھی کے ہمراہ جھولتے ہوئے اندر آتا ہے اور اپنی مخصوص میز پر جا کر بیٹھ جاتا ہے اور اگر ذرا دیر ہو جائے تو ہاتھ پھیلا کر چیخ اٹھتا ہے۔

"جناب ہم لاہور کے ایک سو بیس ہوٹل چھوڑ کر یہاں آتے ہیں"

انشورنس کمپنی کا ایجنٹ حسب معمول شام کو میرے پاس کاؤنٹر کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور مجھے اپنے بچوں کے لڑائی جھگڑے کے قصے سنانے لگتا ہے۔ انگریزی سینما کے راگی بکنگ کلرک آج بھی اسی شان سے کندھے ہلاتے ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے ہیں۔ میز پر زور سے ہاتھ مار کر بیرے کو بلاتے ہیں اور دودھ کی پیالی سامنے رکھ کر لاہور سے کالو ریڈ و تک کے اخراجات کا تخمینہ لگانا شروع کر دیتے ہیں۔

ریٹائرڈ اینگلو پاکستانی بوڑھا باقاعدگی سے آتا ہے۔ ایک پلیٹ پلاؤ،

روغن جوش اور انڈوں کا حلوہ ہضم کر کے تھوڑے تھوڑے وقفے سے پانی بھرا ہوا پورا جگ ختم کرتا ہے اور گھڑی پر وقت دیکھ کر چلا جاتا ہے۔ اگر چینی دوان میں کہیں کوئی چیونٹی دکھائی دے جائے تو اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں چل کر میرے پاس آئے گا اور جھک کر کہے گا۔

"میرا کہ بولیں چینی کھیال سے ڈالا کریں"

شاعروں اور ادیبوں کی ٹولیاں بھی اسی طرح اپنی محفلیں جماتی ہیں۔ پیازی آنکھوں والا مصوّر لڑکا بھی اسی طرح بغل میں کوئی کتاب دبائے شام کو آتا ہے اور اپنے دوستوں میں جا بیٹھتا ہے۔

طویل نظمیں کہنے والا عاشق شاعر اس دوران میں کئی لڑکیوں سے عشق کر کے ان کی سونے کی انگوٹھیاں اور بندے فروخت کر چکا ہے۔ ٹی ہاؤس میں جب اس کے بل زیادہ ہو جاتے ہیں تو وہ کہیں نہ کہیں نیا عشق لڑا لیتا ہے اور پھر مجھے اطلاع کی جاتی ہے کہ اب حساب بہت جلد صاف ہو جائے گا۔

ٹی ہاؤس کی ہر شے اسی طرح ہے، ہر چیز تقریباً ویسی ہی ہے، ہر کام پہلے کی طرح ہو رہا ہے۔ لیکن ایک بات نہیں ہوتی۔ منصور کبھی نہیں آتا۔ وہ اپنے دوستوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے دوست اب اس کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ وہ اسے تقریباً بھول چکے ہیں۔ مگر میں اسے نہیں بھول سکا۔ میں آج بھی اسے یاد کرتا ہوں اور کل بھی کروں گا۔ میں آج بھی اس کا منتظر ہوں اور کل بھی رہوں گا۔ میں جانتا

ہوں اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ پھر بھی کبھی کبھی میرا جی اسے دیکھنے کو بے اختیار ہو جاتا ہے۔ میرے کان اس کی اکھڑی اکھڑی باتوں، ضدی لہجے اور بے ہنگم قہقہوں کو سننے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ پھر مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ وہ ابھی اپنے دفتر سے چھٹی کر کے اپنا سیاہ پائپ جھاڑتا ہوا ٹی ہاؤس میں داخل ہوگا۔ کرسی کھینچ کر میرے قریب والی میز کے سامنے بیٹھ جائے گا۔ پائپ میں تمباکو بھر کر اسے سلگائے گا اور پھر مسکراتے ہوئے میری طرف جھک کر پوچھے گا۔

"لالہ کا فون تو نہیں آیا——؟"

لیکن اب لالہ کا فون کبھی نہیں آئے گا۔ اور شاید اب منصور بھی کبھی مجھ سے کچھ دریافت کرنے نہ آئے۔ شاید اب میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں، کبھی نہ مل سکوں اور کبھی اس کی باتیں نہ سن سکوں۔ وقت ایک غمگین داستان سنا کر خاموش ہو گیا ہے۔ سورج خونیں شفق چھوڑ کر ڈوب گیا ہے۔ ٹیلی فون اپنا آخری گیت سنا کر جیسے بجھ گیا ہے۔ اب کوئی آواز نہیں آتی، اب کوئی پیغام نہیں آتا اور اب کوئی کسی کی راہ نہیں دیکھتا۔ بجھ گئے، ڈوب گئے، مر گئے —— وہ تمام پھول وہ تمام نغمے، وہ تمام گیت۔

کبھی کبھی مصروفیت کے پرشور لمحات میں جب کسی لڑکی کا فون آتا ہے اور وہ کسی لڑکے کے متعلق پوچھتی ہے تو ایک لمحے کے اندر اندر میرے ذہن میں پچھلے

تمام واقعات گھوم جاتے ہیں۔ میں اس لڑکے کو اپنے سامنے بیٹھے چائے پیتے دیکھتا ہوں۔ اس کے باوجود میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس لڑکی سے کہہ دوں۔

'وہ یہاں نہیں ہے'۔

☆

(افسانے)

ایک بات (۳) عصمت چغتائی

" یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ یہ ادائیں وہ عشوے، وہ غمزے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کیے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزل۔ مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی ان جانی، ان بوجھی مگر مخملیں فطرت لیے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔"

سعادت حسن منٹو

سستا ایڈیشن : ۱/۲۵ خاص ایڈیشن (مجلد) ۳/-

☆
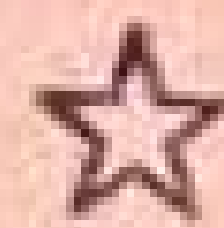
سڑک کے کنارے (۴) سعادت حسن منٹو

منٹو محفل افسانہ میں ہر بار ایک نئے اور دلکش انداز سے شرکت کے عادی تھے۔ 'سڑک کے کنارے' میں انھوں نے پہلے سے زیادہ جدید، نڈر اور بے باک انداز کی ترجمانی کی ہے۔ منٹو کے افسانوں کا یہ مجموعہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

سستا ایڈیشن : ۱/۲۵ خاص ایڈیشن (مجلد) ۳/-

☆
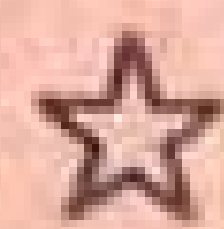
گرہن (۵) راجندر سنگھ بیدی

جب راجندر سنگھ بیدی نے افسانے کی وادی میں قدم رکھا، اردو افسانے کے چاند سورج تاریکیوں کی گود میں سو رہے تھے اور ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ گرہن کے افسانے اردو افسانے کو انہیں تاریکیوں سے نکالنے کی ایک بھرپور سعی ہیں۔

سستا ایڈیشن : ۱/۵۰ خاص ایڈیشن (مجلد) ۳/۲۵

☆

دانہ و دام (٦) راجندر سنگھ بیدی

بیدی فن اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک مکمل فن کار ہے - اس کے افسانے وہ ادبی جہاد ہیں جن میں سماج کی موجودہ ساخت کے خلاف بغاوت کی گئی ہے اور ان جڑوں کو کاٹا گیا ہے جنھوں نے ہماری معاشرت اور انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے کر بے جان بنا دیا ہے -

دانہ و دام بیدی کے ان افسانوں کا مجموعہ ہے جنھوں نے اس کے فن پر ابدیت کی مہریں ثبت کر دی ہیں -

سستا ایڈیشن : ١/٥٠ خاص ایڈیشن (مجلد) ٣/٢٥

☆

رفیقِ تنہائی (٧) علی عباس حسینی

حسینی کے افسانوں میں سانس لیتی ہوئی زندگی ہے ، دبی ہوئی سنجیدہ ظرافت ہے ، احساس کو چونکانے والا طنز ہے ، زندگی کی بے باکانہ تنقید ہے اور جذباتِ انسانی کی نفسیاتی تحلیل - حسینی کا آرٹ مستعار نہیں ، وہ اپنی طرز کے آپ خالق ہیں -

سستا ایڈیشن : -/٢ خاص ایڈیشن (مجلد) -/۴

☆

منزل منزل (٨) اے حمید

منزل منزل دل بھٹکے گا اور دفتر دفتر اس کی داستان لکھی جائے گی - منزل منزل اے حمید کے ان منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے جو اس کی شہرت کی بنیاد ہیں - ان افسانوں میں سیلانی اے حمید کی روح محوِ پرواز ہے -

سستا ایڈیشن : ٢/٥٠ خاص ایڈیشن (مجلد) -/٥

☆

سناٹا (٩) احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری ایک تحریک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے - اس کا فن صورت و معنی کے مختلف سانچوں میں ڈھل کر مسلسل سنورتا رہا ہے ...

'سناٹا' اس کی فکری اور فنی پختگی کا بہترین نمونہ ہے جو اردو افسانے کو قوت اور توانائی بخشے گا۔

دیباچہ : وقار عظیم

مستا ایڈیشن : ۲/۵۰ خاص ایڈیشن (مجلد) ۶/-

☆

هائے الله (۱۰) هاجره مسرور

اس وقت ہاجرہ مسرور اردو کی معتبر اور نمایاں ترین افسانہ نگار ہیں اور ہائے اللہ ان کی نمایاں ترین کہانیوں کا نمایاں ترین مجموعہ۔

دُکھی اور بے بس عورت کی پکار ـــ ہائے اللہ!

مستا ایڈیشن : ۱/۲۵ خاص ایڈیشن (مجلد) ۳/-

☆

(ڈرامے)

شیطان (۱۱) عصمت چغتائی

عصمت کا شیطان گنجے فرشتوں سے بہتر ہے۔ وہ اپنے شیطان ہونے کا اقرار کرتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے:

"مجھ سے بچو ـــ میں شیطان ہوں"

عصمت چغتائی کے مشہور و مقبول ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ۔

مستا ایڈیشن : ۱/۲۵ خاص ایڈیشن (مجلد) ۳/-

☆

(شاعری)

گجر (۱۲) قتیل شفائی

"قتیل کے کلام کو دیکھ کر سب سے پہلے یہی خیال آتا ہے کہ اس میں خلوص اور صداقت ہے۔ وہ سماجی اور انسانی شعور کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں خونِ جگر کی گرمی ہے اور ان میں زندگی نظر آتی ہے۔"

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مستا ایڈیشن : ۱/- خاص ایڈیشن (مجلد) ۵/-